داستان خواجہ بخارا کی

لیونید سولوویف

ترجمہ حبیب الرحمٰن

فہرست

حصہ اول.....

حصہ دوم.....

حصہ سوم.....

ہمیں یہ کہانی ابوعمر احمد ابن محمد سے ملی جس کو اس نے محمد ابن علی ابن رفع سے سنا تھا جو علی ابن عزیز کا حوالہ دیتا ہے جو ابوعبید القاسم ابن سلام کا حوالہ دیتا ہے جس نے اس کو اپنے استادوں کی زبانی سن کر بیان کیا تھا جن میں سے آخری استاد عمر ابن الخطاب اور ان کے بیٹے عبداللہؓ کو سند کے طور پر پیش کرتا ہے!

ابن حزم "قمری کا ہار"

میں اس کتاب کو اپنے دوست مومن عادلوف کی پاکیزہ اور لافانی یاد سے موسوم کرتا ہوں جو 18 اپریل 1930 کو ایک دشمن مہلک گولی کا شکار ہوئے۔

ان میں خواجہ نصرالدین کی بہت سی خصوصیات تھیں۔عوام کے لئے بے لوث ایثار، ہمت، شریفانہ فراست اور ایماندارانہ ذکاوت۔ میں نے یہ کتاب لکھتے وقت رات کے سناٹے میں کئی بار ایسا محسوس کیا جیسے عادلوف کا سایہ میرے پاس کھڑا ہے اور میرے قلم کی رہنمائی کر رہا ہے۔ پہاڑی قشلاق (گاؤں) نانائی میں اس کا انتقال ہوا اور کانی بادم میں وہ آرام کر رہے ہیں۔تھوڑے ہی دن ہوئے میں ان کی قبر پر گیا تھا۔ بہار کی گھاس اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبر کے چاروں طرف بچے کھیل رہے تھے اور وہ ابدی نیند سو رہے تھے۔وہ میرے دل کی پکار نہیں سن رہے تھے....

حصہ اول

کہتے ہیں کہ ایک بیوقوف اپنے گدھے کی باگ ڈور سنبھالے چلا جا
رہا تھا۔گدھا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔
(شہرزاد کی 388 ویں رات)

(1)

خواجہ نصرالدین کی 35 ویں سال گرہ سڑک پر ہوئی۔

دس سال سے زیادہ انہوں نے جلاوطنی میں گذارے تھے، شہر شہر، ملک ملک کی سرگردانی کرتے، سمندروں اور ریگستانوں کو پار کرتے۔ جہاں رات آ جاتی سو جاتے___ ننگی زمین پر کسی گڈریے کے چھوٹے سے الاؤ کے پاس، کسی کھچا کھچ بھری ہوئی سرائے میں، جہاں تمام رات گرد آلود دھندلکے میں اونٹ لمبی لمبی سانسیں لیتے، اپنے کوکھجلاتے اور گھنٹیاں بج اٹھتیں یا کسی دھوئیں اور کالک سے بھرے چائے خانے میں ادھر اُدھر لیٹے ہوئے سقوں، بھک منگوں، ساربانوں اور اسی طرح کے غریب لوگوں کے پاس جو پو پھٹتے ہی شہر کے بازاروں اور تنگ سڑکوں کو اپنی پرشور ہانک پکار سے بھر دیتے ہیں۔

بہت سی راتیں انہوں نے کسی امیر ایرانی عہدے دار کے حرم میں نرم ریشمی گدوں پر دادِ عیش دے کر بھی گذاری تھیں جبکہ گھر کا مالک اپنے برقندازوں کو ساتھ لے کر سارے چائے خانوں اور کارواں سرایوں میں ملحد اور آوارہ گرد خواجہ نصرالدین کی تلاش میں سرگرداں ہوتا تھا تا کہ اس کو پکڑ کر نوکیلے چوبی ستون پر بٹھا سکے....کھڑکی کی جھلملی سے آسمان کی تنگ پٹی دکھائی دیتی، ستارے مرجھا جاتے، نرم اور نم بادِ صبا صبح کی آمد آمد کا اعلان کرتی ہوئی پتیوں میں سرسراتی اور کھڑکی کی کگر پر قمریاں خوشی سے کوکو کر کے چونچوں سے پر صاف کرتیں۔ خواجہ نصرالدین تھکی ہوئی حسینہ کو بوسہ دے کر کہتے:

''میرے درِ بے بہا الوداع۔ اب جانے کا وقت آ گیا۔ مجھے فراموش نہ کر دینا۔''

حسینہ اپنے سڈول بازوؤں کو ان کی گردن میں حمائل کر کے التجا کرتی:

''ٹھہرو! کیا تم ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہو؟ لیکن کیوں؟ اچھا سنو، آج رات کو اندھیرا پھیلتے ہی میں بڑھیا کو تمہیں لانے کے لئے پھر بھیجوں گی۔''

''نہیں، میں مدتوں ہوئے یہ بات بھول چکا ہوں کہ ایک چھت کے نیچے دو راتیں کیسے گزاری جاتی ہیں۔ مجھے جانا ہی ہے۔ بڑی عجلت ہے۔''

''جانا ہے؟ کیا کسی دوسرے شہر میں تم کو ضروری کام ہے؟ تم کہاں جا رہے ہو؟''

''میں نہیں جانتا۔ لیکن روشنی پھیل چکی ہے۔ شہر کے پھاٹک کھل چکے ہیں اور پہلے کارواں باہر نکل رہے ہیں۔ سن رہی ہو نا، اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز؟ جب میں یہ آواز سنتا ہوں تو جیسے کوئی جن میرے پیروں میں سنیچر پیدا کر دیتا ہے اور میں نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔''

''اگر ایسا ہے تو جاؤ'' ملول ہو کر حسینہ کہتی ہے، وہ اپنی لمبی لمبی پلکوں پر آنسوؤں کو چھپا نہیں پاتی ''لیکن جانے سے پہلے کم از کم اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔''

''میرا نام؟ اچھا تو سنو، تم نے یہ رات خواجہ نصرالدین کے ساتھ بتائی ہے۔ میں خواجہ نصرالدین ہوں، بے چینی پھیلانے اور نفاق کے بیج بونے والا، ایسی ہستی جس کے سر پر بڑا انعام ہے۔ ہر روز نقیب عام جگہوں اور بازاروں میں میرے بارے میں اعلان کرتے پھرتے ہیں۔ کل وہ تین ہزار تومان دے رہے تھے اور مجھے لالچ لگا کہ میں اس قیمت پر خود اپنا سر بیچ دوں۔ تم ہنس رہی ہو، میری پیاری۔ اچھا مجھے آخری بار اپنے ہونٹ چومنے دو۔ اگر میں تم کو تحفہ دے سکتا تو زمرد دیتا لیکن زمرد تو میرے پاس نہیں ہے۔

لو یہ ایک حقیر سا سفید پتھر بطور نشانی ہے!''

وہ اپنی پھٹی ہوئی قبا پہنتے ہیں جو الاؤں کی چنگاریوں سے جا بجا جلی ہوئی ہے اور چپکے سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ دروازے پر کاہل اور بیوقوف خواجہ سرا پگڑی باندھے اور اوپر اٹھی ہوئی خم دار نوکوں والی جوتیاں پہنے، پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ وہ محل کے سب سے بیش قیمت خزانے کا لاپروا نگران ہے۔ آگے چل کر بھی قالینوں اور نمدوں پر پہرے دار خراٹے بھر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ننگے خنجروں کے تکئے بنا رکھے ہیں۔ خواجہ نصر الدین پنجوں کے بل رینگتے اس طرح صاف نکلتے ہیں جیسے ذرا دیر کے لئے وہ کوئی نظر نہ آنے والا چھلاوہ بن گئے ہیں۔

اور پھر ایک بار سفید پتھریلی سڑک ان کے گدھے کے تیز رفتار سموں کے نیچے گونجتی اور چنگاریاں دیتی ہے۔ نیلے آسمان سے سورج دنیا کو منور کر رہا ہے۔ خواجہ نصر الدین اس سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔ شبنم آلود کھیتوں، ویران ریگستانوں میں جہاں ریت کے تودوں کے درمیاں اونٹوں کی سفید ہڈیاں چمکتی ہیں، ہرے بھرے باغوں اور جھاگ دار دریاؤں، بے برگ و گیاہ پہاڑوں اور مسکراتے ہوئے سبزہ زاروں میں خواجہ نصر الدین کے نغمے گونجتے ہیں۔ وہ پیچھے ایک نظر ڈالے بغیر، جو کچھ پیچھے چھٹ گیا ہے اس پر افسوس کئے بغیر اور پیش آنے والے خطرات سے ڈرے بغیر آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

لیکن جو شہر انہوں نے ابھی ابھی چھوڑا ہے اس میں ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ ملا اور عمائدین کے چہرے ان کے نام سنتے ہی غصے سے سرخ ہو جاتے ہیں۔ سقے، ساربان، جولاہے، ٹھٹھیرے اور گھوڑوں کی کاٹھیاں بنانے والے راتوں کو چائے خانوں میں جمع ہو کر خواجہ نصر الدین کے بارے میں ایسی کہانیوں سے ایک دوسرے کا دل بہلاتے ہیں جن میں ہمیشہ خواجہ کی جیت ہوتی ہے۔ حرم کی افسردہ حسینہ سفید پتھر کو غور سے دیکھتی رہتی ہے اور اپنے مالک کی آواز سنتے ہی اس کو ایک سیپ کے صندوقچے میں چھپا دیتی ہے۔

''اُف'' ہانپتا اور غراتا ہوا موٹا عہدے دار اپنی زربفت کی قبا اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے ''اس کمبخت بدمعاش خواجہ نصر الدین نے تو ہم سب کو عاجز کر دیا ہے۔ اس نے سارے ملک میں ہنگامہ اور تہلکہ مچا رکھا ہے۔ آج ہی مجھے اپنے پرانے دوست صوبۂ خراساں کے لائق گورنر کا خط ملا ہے۔ سوچو تو ذرا، اس بدذات خواجہ نصر الدین نے ان کے شہر میں مشکل سے قدم رکھا ہی ہوگا کہ آہنگروں نے

یک دم محاصل دینا بند کر دئے، سرائے والوں نے پہرے داروں کو مفت کھلانے سے انکار کر دیا۔ اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ اسلام کو ناپاک کرنے والے، اس چور، ولدالزنا نے یہ جرأت کی کہ گورنر کے حرم میں داخل ہو کر ان کی محبوب بیوی کو ورغلایا۔ سچ مچ، دنیا میں ایسا شریر آدمی کبھی نہیں ہوا تھا! افسوس کہ نا ہنجار نے میرے حرم کا رخ نہیں کیا ورنہ اس کا سر اس وقت بڑے چوک پر کسی بانس سے لٹکتا ہوتا۔''

حسینہ پراسرار انداز سے مسکراتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

اس دوران میں خواجہ نصرالدین کے گدھے کے تیز رفتار سموں سے سڑک گونجتی اور چنگاریاں دیتی ہے اور خواجہ کے نغموں کی آواز اس میں گھل مل جاتی ہے۔

اس دس سال میں وہ نجانے کہاں کہاں سرگرداں رہے ___ بغداد، استنبول، طہران، بخشی سرائے، اچمی ادزین، طفلس، دمشق اور **تبریز** ___ وہ ان شہروں سے بخوبی واقف ہو چکے تھے اور ان کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے شہروں کو جانتے تھے اور ہر جگہ اپنی ناقابلِ فراموش یادگاریں چھوڑی تھیں۔

اب وہ اپنے شہر، بخارا شریف واپس جا رہے تھے۔ ان کو امید تھی کہ وہ اپنی لامحدود آوارہ گردی ترک کر کے کسی دوسرے نام سے سکھ چین کے ساتھ وہاں رہ سکیں گے۔

2

انہوں نے سوداگروں کے ایک بڑے کارواں کے ساتھ جس میں وہ شامل ہو گئے تھے بخارا کی سرحد میں قدم رکھا اور سفر کے آٹھویں دن بہت دور سامنے دھندلکے میں اس بڑے اور مشہور شہر کے جانے پہچانے مینار دیکھے۔

پیاس اور گرمی سے پریشان ساربانوں نے ایک زوردار نعرہ بلند کیا اور اونٹوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور جلدی کی ضرورت نہ تھی تاکہ پھاٹک بند ہونے سے پہلے بخارا میں داخل ہوا جا سکے۔ خواجہ نصرالدین کارواں میں سب سے پیچھے، گرد کے گھنے اور بھاری بادل میں لپٹے چل رہے تھے۔ یہ تو ان کی اپنی پاک گرد تھی جس کی مہک دوسرے دور دراز ملکوں کی گرد سے کہیں اچھی تھی۔ چھینکتے کھانستے ہوئے وہ اپنے گدھے سے برابر کہہ رہے تھے:

''دیکھ، ہم آخر کار گھر پہنچ گئے نا! خدا کی قسم یہاں کامیابیاں اور مسرتیں ہماری منتظر ہیں۔''

کارواں ٹھیک اس وقت شہر کی فصیل کے قریب پہنچا جب پہرے دار پھاٹک بند کر رہے تھے۔ ''خدا کے لئے ٹھہریئے!'' کارواں کے سردار ایک طلائی سکہ دکھا کر دور ہی سے چلایا۔ لیکن پھاٹک بند ہو چکے تھے، زنجیریں جھنکار کے ساتھ چڑھا دی گئیں اور میناروں پر نگہبانوں نے توپوں کے مورچے سنبھال لئے۔ تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے، دھندلکے آسمان میں گلابی شفق مرجھا گئی، باریک ہلال بہت صاف ابھر آیا اور شام کی خاموشی میں بے شمار میناروں سے مؤذنوں کی تیز اور پرسوز آوازیں مومنوں کو مغرب کی نماز کی دعوت دینے لگیں۔

سوداگر اور ساربان نماز کے لئے جھک گئے اور خواجہ نصرالدین چپکے سے اپنے گدھے کو لے کر ایک کنارے چلے گئے۔

''یہ سوداگر تو بجا طور پر خدا کے شکر گذار ہیں'' انہوں نے کہا ''انہوں نے آج دن میں ڈٹ کر کھانا کھایا ہے اور رات کو بھی کھائیں گے لیکن میں نے اور تو نے، میرے وفادار گدھے، نہ تو دن کو کھانا کھایا ہے اور نہ رات ہی کو کھائیں گے۔ اگر اللہ ہمارے شکرئے کا خواہاں ہے تو وہ مجھ کو ایک قاب پلاؤ اور تجھ کو ایک گٹھا گھاس بھیج دے۔''

انہوں نے سڑک کے کنارے ایک درخت سے گدھے کو باندھ دیا اور خود بھی اس کے برابر ننگی زمین پر پتھر کا تکیہ بنا کر لیٹ گئے۔ آسمان کی اندھیری وسعتوں میں جھانکتے ہوئے انہوں نے ستاروں کا جھلملاتا ہوا جال دیکھا۔ وہ ستاروں کے ہر جھرمٹ سے واقف تھے۔ ان دس برسوں میں انہوں نے نہ جانے کتنی بار کھلے آسمان کو دیکھا تھا! ان کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا جیسے خاموش غور و فکر کے ان دانش مندانہ اوقات نے ان کو امیروں سے بھی زیادہ امیر بنا دیا ہے۔ چاہے امیر آدمی سونے کے ظروف میں ہی کھانا کیوں نہ کھاتا ہو پھر بھی وہ لازمی طور پر رات چھت کے نیچے گذارتا ہے۔ اس لئے وہ نصف شب کے سناٹے میں خنک، نیلگوں، ستاروں سے بھرے ہوئے دھندلکے کے درمیان زمین کی پرواز سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

اس دوران میں شہر کی دندانے دار فصیل کے باہر کارواں سرایوں اور چائے خانوں میں بڑے بڑے کڑاہوں کے نیچے آگ روشن ہو چکی تھی اور بھیڑیں جو ذبح کرنے لئے کھینچی جا رہی تھیں بے حد غم آلود آواز میں ممیا رہی تھیں۔ تجربے کار خواجہ نصرالدین نے پہلے ہی سے سوچ کر اپنے رات کے آرام کا

انتظام ایسی جگہ کیا تھا جو ہوا کے رخ کے خلاف تھی تا کہ کھانے کی اشتہا آمیز خوشبوان کو نہ چھیڑ سکے۔ بخارا کے قوانین کو اچھی طرح جانتے ہوئے انہوں نے اپنی تھوڑی سی پونجی بچالی تھی تا کہ کل وہ شہر کے پھاٹک پر محصول ادا کر سکیں۔

کافی دیر تک وہ کروٹیں بدلتے رہے لیکن انہیں نیند نہیں آئی۔ اس بے خوابی کا سبب بھوک نہ تھی بلکہ تلخ خیالات تھے جو ان کو بے چین اور پریشان کر رہے تھے۔

ان کو اپنے وطن سے محبت تھی۔ وہ اس کو سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ یہ سانولے تپے ہوئے چہرے پر سیاہ داڑھی رکھنے والا چالاک اور زندہ دل انسان جس کی صاف آنکھوں میں شرارت کی جھلک تھی، اپنی پھٹی پرانی قبا، داغ دھبوں سے بھری ٹوپی اور خستہ حال جوتے پہنے بخارا سے جتنا ہی زیادہ دور آوارہ گردی کرتا رہا اتنا ہی زیادہ وطن سے اس کا پیار بڑھتا گیا اور وطن اس کو یاد آتا گیا۔ جلا وطنی کے زمانے میں اس کو ان تنگ سڑکوں کی یاد آتی جہاں دونوں طرف کی کچی دیواروں سے رکڑ کھائے بغیر ارابے نہیں گذر سکتے تھے، ان بلند میناروں کی جن کی روغن کی ہوئی اینٹوں کی ڈیزائن دار چوٹیاں طلوع وغروب آفتاب کے وقت عکس سے شعلہ ور ہو جاتی تھیں اور ان قدیم اور متبرک چنار کے درختوں کی جن کی شاخوں میں سارسوں کے بڑے بڑے کالے گھونسلے جھولتے تھے۔ اس کو حور کے سرسراتے ہوئے درختوں کے سائے میں نہروں کے کنارے چہل پہل والے چائے خانے، بہت زیادہ گرم باورچی خانوں میں دھوئیں اور کھانے کی خوشبو، بازاروں کی رنگین گہما گہمی، چراگاہیں، ریگستان، ایک ایک یاد آتے اور بغداد یا دمشق میں جب وہ اپنے کسی ہم وطن کو دیکھتا تو وہ اس کی ٹوپی یا لباس کی وضع قطع سے پہچان لیتا اور ایک لمحہ کے لئے خواجہ نصر الدین کے دل کی دھڑکن اور سانس کی آمد ورفت رک جاتی۔

واپسی پر خواجہ نصر الدین نے اپنے ملک کو اس سے زیادہ بدحال پایا جیسا کہ چھوڑا تھا، بڈھے امیر کا زمانہ ہوئے انتقال ہو چکا تھا۔ پچھلے آٹھ سال میں نئے امیر نے بخارا کو تقریباً تباہ کر دیا تھا۔ خواجہ نصر الدین نے ٹوٹے پھوٹے پل، سورج سے جھلسی، بری طرح سے بوئی ہوئی گیہوں اور جو کی کمزور فصلیں اور آبپاشی کی خشک نالیاں دیکھیں جو گرمی سے سوکھ کر چٹخ گئی تھیں۔ کھیتوں میں جھاڑ جھنکار اُگے تھے اور ویران تھے، پانی کی کمیابی سے باغات خشک پڑے تھے، کسانوں کے پاس نہ تو اناج تھا اور نہ مویشی، سڑکوں پر فقیروں کی قطاریں ان لوگوں سے بھیک مانگتی نظر آتی تھیں جو خود انہیں کی طرح محتاج تھے۔

نئے امیر نے ہر گاؤں میں سپاہیوں کا ایک ایک دستہ تعینات کر دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اس کے مفت کھانے پینے کی ذمہ داری گاؤں والوں پر ہے۔ اس نے بہت سی مسجدوں کی بنیاد ڈلوادی اور پھر حکم دیا کہ عام لوگ ان کو تکمیل تک پہنچائیں۔ نیا امیر بہت زاہد و پاکباز تھا اور سال میں دو بار انتہائی مقدس اور پاکیزہ بزرگ شیخ بہاؤالدین کے مزار کی زیارت میں ناغہ نہیں کرتا تھا جو بخارا کے قریب ہی تھا۔ چار رائج ٹیکسوں میں اُس نے تین اور، حصولوں کا اضافہ کیا تھا۔ اس نے ہر پل پر چنگی ناکہ بنوا دیا تھا، تجارتی اور قانونی کارروائیوں کے لئے ٹیکس پر اضافہ کر دیا تھا اور گھٹیا سکے بنوائے تھے... حرفتیں تباہ ہو رہی تھیں اور تجارت پر زوال آیا ہوا تھا۔ خواجہ نصرالدین کے لئے اپنے پیارے وطن کو واپسی خوش کن نہ تھی۔

....صبح سویرے مؤذنوں کی اذان پھر تمام میناروں سے گونجی۔ پھاٹک کھل گئے اور کارواں گھنٹیوں کی گونج میں آہستہ آہستہ شہر میں داخل ہوا۔

پھاٹکوں سے گذر کر کارواں ٹھہر گیا۔ سڑک کو پہرے داروں نے روک رکھا تھا۔ وہ بڑی تعداد میں تھے۔ کچھ تو اچھے کپڑے اور جوتے پہنے تھے اور کچھ جن کو ابھی تک امیر کی ملازمت میں موٹے ہونے کا موقع نہیں ملا تھا ننگے پیر اور نیم عریاں تھے۔ وہ شور مچا کر ایک دوسرے کو ڈھکیل رہے تھے اور لوٹ مار کی تقسیم کے لئے پہلے سے جھگڑنے لگے تھے۔ آخر کار ٹیکس کلکٹر صاحب ایک چائے خانے سے برآمد ہوئے، لحیم شحیم، چہرے پر نیند کے آثار، ریشمی قبا پہنے جس کی آستینوں پر چکنائی کے داغ تھے، ننگے پیر سلیپروں میں ڈال لئے تھے۔ پھولا ہوا چہرہ بداعتدالیوں اور بدکاریوں کی چغلی کھا رہا تھا۔ اس نے سوداگروں پر للچائی ہوئی نگاہ ڈالی اور بولا:

''خوش آمدید، سوداگرو! اللہ آپ کو کاروبار میں کامیاب کرے! یہ جان لیجئے کہ امیر کا حکم ہے کہ اگر کوئی بھی اپنے سامان کی چھوٹی سی چیز بھی چھپائے گا تو اس کو ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا۔''

حیران و پریشان سوداگروں نے خاموشی سے اپنی خضاب لگی ہوئی داڑھیوں کو سہلایا۔ ٹیکس کلکٹر پہرے داروں کی طرف مڑا جو بے چین ہو رہے تھے اور اپنی موٹی انگلیوں سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی پہرے دار ہانکتے پکارتے اونٹوں پر ٹوٹ پڑے۔ بھیڑ بھاڑ اور عجلت میں ایک دوسرے سے دھکم دھکا کر کے انہوں نے اپنی تلواروں سے بالوں کے رسے کاٹ دئے اور شور مچاتے ہوئے گانٹھوں کو کاٹ کر کھول دیا۔ سڑک پر زربفت، ریشم اور مخمل کے کپڑے، مرچ، چائے، عنبر کے بکس، گلاب کے قیمتی عطر کے کنٹر اور

تبت کی دوائیں پھیل گئیں۔

خوف نے سوداگروں کی زبان میں قفل لگا دیا تھا۔ دومنٹ میں معائنہ ختم ہو گیا۔ پہرے دار اپنے افسر کے پیچھے صف آرا ہو گئے، ان کی قبائیں پھولی ہوئی تھیں۔ اب سامان اور شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت کے لئے ٹیکس وصول کیا جانے لگا۔ خواجہ نصرالدین کے پاس کوئی تجارتی سامان نہ تھا اور ان کو صرف داخلے کا ٹیکس ادا کرنا تھا۔

''تم کہاں سے آرہے ہو اور کس کام سے؟'' ٹیکس کلکٹر نے دریافت کیا۔

محرر نے کلک کا قلم دوات میں ڈبویا اور خواجہ نصرالدین کا بیان رجسٹر میں قلم بند کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

''حضورِ عالی میں ایران سے آرہا ہوں۔ یہاں بخارا میں میرے کچھ عزیز رہتے ہیں۔''

''اچھا'' ٹیکس کلکٹر بولا۔ ''تو تم اپنے عزیزوں سے ملنے آئے ہو۔ اس صورت میں تمہیں ملاقاتی کا محصول ادا کرنا ہوگا۔''

''لیکن میں ان سے ملاقات کرنے تھوڑی ہی آیا ہوں'' خواجہ نصرالدین نے جلدی سے جواب دیا۔ ''میں ضروری کام سے آیا ہوں۔''

''کام سے!'' ٹیکس کلکٹر نے زور سے کہا اور اس کی آنکھیں جل اٹھیں۔ ''تب تو تم ملاقات اور کام دونوں کے لئے آئے ہو۔ ملاقاتی کا ٹیکس ادا کرو، کام کا ٹیکس ادا کرو اور اس خدا کی راہ میں مسجدوں کی آرائش کے لئے عطیہ دو جس نے تم کو راستے میں رہزنوں سے محفوظ رکھا۔''

''اچھا تو یہ ہوتا کہ وہ اب مجھے محفوظ رکھتا کیونکہ رہزنوں سے بچنے کی تدبیر تو میں خود کر سکتا تھا'' خواجہ نصرالدین نے سوچا لیکن اپنی زبان روکے رہے کیونکہ انہوں نے حساب لگایا کہ اس بات چیت کا ہر لفظ ان کو دس تانگے سے زیادہ کا پڑ رہا ہے۔ انہوں نے اپنے پیٹی کھولی اور پہرے داروں کی گھورتی ہوئی حریصانہ آنکھوں کے سامنے شہر میں داخلے کا ٹیکس، مہمان ٹیکس، کاروباری ٹیکس اور مسجدوں کی آرائش کے لئے عطیہ کی رقم گنی۔ محرر اپنی ناک رجسٹر میں گھسیڑے کلک کے قلم سے لکھتا رہا۔

تمام محاصل ادا کرنے کے بعد خواجہ نصرالدین روانہ ہی ہونے والے تھے کہ ٹیکس کلکٹر نے دیکھ لیا کہ کچھ سکے ان کی پیٹی میں باقی رہ گئے ہیں۔

''ٹھہرو!'' اس نے حکم دیا ''اور تمہارے گدھے کا ٹیکس کون ادا کرے گا؟ اگر تم اپنے عزیزوں سے ملنے جا رہے ہو تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ گدھا بھی اپنے عزیزوں سے ملنے جا رہا ہے۔''

''دانا افسر، آپ بجا فرماتے ہیں'' خواجہ نصر الدین نے اپنی پیٹی پھر کھولتے ہوئے بڑی خاکساری کے ساتھ کہا ''واقعی، بخارا میں میرے گدھے کے عزیزوں کی بڑی اکثریت ہے ورنہ جیسا نظام یہاں ہے اس سے تو آپ کے امیر کو کب کا تخت سے اتار دیا گیا ہوتا اور آپ، حضور، اپنے حرص کی وجہ سے بہت دن پہلے ہی چوبی ستون پر نظر آتے۔''

قبل اس کے کہ ٹیکس کلکٹر حواس مجتمع کر سکے خواجہ نصر الدین اُچک کر اپنے گدھے پر آئے اور اس کو سرپٹ بھگاتے ہوئے قریب ترین گلی میں رفو چکر ہو گئے۔

''اور تیز، اور تیز'' وہ برابر کہتے جا رہے تھے ''اور تیز، میرے وفادار گدھے، اور تیز ورنہ تیرے مالک کو ٹیکس میں اپنا سر دینا پڑ جائے گا۔''

خواجہ نصر الدین کا گدھا بڑا سمجھدار تھا۔ وہ ہر بات سمجھتا تھا۔ اس کے لمبے کانوں نے شہر کے پھاٹک کا غل غپاڑی اور پہرے داروں کی ہانک پکار سن لی تھی اس لئے وہ سڑک سے بے نیاز بھاگتا رہا اور اتنی تیز رفتاری سے کہ اس کا مالک کاٹھی سے چمٹا ہوا تھا، اس کے بازو گدھے کی گردن میں حمائل تھے اور اس کے پیر اوپر کھنچے ہوئے تھے۔ زور زور بھونکتے ہوئے کتے ان کے پیچھے دوڑتے، مرغیاں چاروں طرف بکھر جاتیں اور راہی دیواروں سے چپک کر کھڑے ہو جاتے، اپنا سر ہلاتے اور ان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کی دیکھتے۔

اس دوران میں شہر کے پھاٹک پر پہرے دار مجمع میں اس بے دھڑک آزاد خیال کی تلاش کر رہے تھے۔ سوداگر مسکرا رہے تھے اور ایک دوسرے سے چپکے چپکے کہہ رہے تھے:

''یہ جواب تو بس خواجہ نصر الدین ہی دے سکتے تھے۔''

دوپہر ہوتے ہوتے یہ قصہ سارے شہر میں پھیل گیا۔ بازار میں تاجر چپکے چپکے گاہکوں سے بیان کرنے لگے جو اس کو دوسروں تک پہنچاتے اور سب ہنستے اور ہمیشہ یہ کہتے:

''یہ الفاظ تو خواجہ نصر الدین ہی کو زیب دیتے ہیں۔''

کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ الفاظ خود خواجہ نصر الدین کے ہیں، کہ وہی مشہور و معروف اور لاثانی

خواجہ نصرالدین اس وقت شہر میں بھوکا پیاسا، خالی جیب آوارہ گردی کر رہا ہے اور اپنے عزیزوں اور پرانے دوستوں کو تلاش کر رہا ہے جو اس کو کھلاتے پلاتے اور پناہ دیتے۔

3

خواجہ نصرالدین کو بخارا میں نہ تو عزیز ملے اور نہ پرانے دوست ہی۔ ان کو اپنے باپ کا گھر تک نہیں ملا جہاں وہ پیدا ہوئے تھے اور پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے، نہ تو وہاں وہ سایہ دار باغ تھا جہاں خزاں کے صاف دنوں میں سنہری پتیاں ہوا میں سرسراتی تھیں اور پھل بھدا بھدز مین پر گرتے تھے، جہاں چڑیاں چہچہاتی تھیں اور سورج کی کرنیں خوشبودار گھاس پر ناچتی تھیں، جہاں شہد کی مکھیاں مرجھاتے ہوئے پھولوں سے آخری خراج وصول کرتے ہوئے بھن بھناتی تھیں اور جہاں نہر گنگناتی ہوئی بہتی تھی اور لڑکے سے اپنی نہ ختم ہونے والی پراسرار کہانیاں کہتی رہتی تھی....اب یہ جگہ ویران تھی، کوڑے کرکٹ، خاردار جھاڑیوں سے بھری ہوئی، آگ سے جلی ہوئی اینٹوں، گرتی ہوئی دیواروں اور سڑتی ہوئی چٹائی کے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے۔ خواجہ نصرالدین کو ایک چڑیا، ایک شہد کی مکھی تک نظر نہ آئی۔ صرف پتھروں کے ڈھیر کے نیچے سے جہاں انہوں نے ٹھوکر کھائی تھی اچانک ایک چکنی سے رسی برآمد ہوئی، سورج کی روشنی میں ہلکی سی چمکی اور پھر پتوں کے نیچے غائب ہوگئی۔ یہ تھا سانپ، ایسی ویران جگہوں کا تنہا اور ڈراؤنا باسی جن کو ہمیشہ کے لئے انسان ترک کر دیتا ہے۔

خواجہ نصرالدین بڑی دیر تک سر جھکائے کھڑے رہے۔ ان کے دل پر غم کے بادل چھا گئے تھے۔

سخت کھانسی کی آواز سے چونک کر وہ مڑے۔

ایک بڈھا غربت وفکر سے جھکا ہوا اس ویرانے کے پار راستے پر چلا آ رہا تھا۔ خواجہ نصرالدین نے اس کو روکا:

''بڑے میاں، رحمت ہو تم پر، خدا تم کو صحت وخوش حالی کا طویل زمانہ عطا کرے۔ مجھے بتاؤ کہ اس ویران جگہ پر کس کا مکان تھا؟''

''یہ کاٹھی بنانے والے شیر محمد کا گھر تھا'' بڈھے نے جواب دیا ''میں اس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ شیر محمد مشہور خواجہ نصرالدین کا باپ تھا جس کے بارے میں، اے مسافر، تو نے یقیناً بہت کچھ سنا ہوگا۔''

''ہاں میں نے کچھ تو اس کے بارے میں سنا ہے۔لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ کاٹھی بنانے والا شیر محمد جو مشہور خواجہ نصرالدین کا باپ تھا کہاں چلا گیا اور اس کا خاندان کہاں ہے؟''

''اتنے زور سے نہیں، میرے بیٹے، بخارا میں لاکھوں جاسوس ہیں۔اگر انہوں نے کہیں ہمارے بات سن لی تو بس مصیبتوں کا ٹھکانا نہیں رہے گا۔شاید تم بہت دور سے آئے ہو اور نہیں جانتے ہو کہ ہمارے شہر میں خواجہ نصرالدین کا نام لینا سخت منع ہے۔یہ بات آدمی کو جیل میں ڈال دینے کے لئے کافی ہے۔ذرا قریب آجاؤ۔میں تمہیں بتاؤں گا۔''

اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے خواجہ نصرالدین اس کے قریب جھک گئے۔

''یہ بڈھے امیر کے زمانے کی بات ہے'' بڈھے نے کھانستے ہوئے شروع کیا''خواجہ نصرالدین کی جلاوطنی کو ڈیڑھ سال ہوئے تھے کہ بازار میں یہ افواہ پھیل گئی کہ وہ ناجائز طور پر چھپ کر بخارا واپس آ گئے ہیں اور یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور امیر کے خلاف ہجویہ نظمیں لکھ رہے ہیں۔یہ افواہ امیر کے محل تک پہنچی اور پہرے داروں نے خواجہ نصرالدین کی تلاش شروع کر دی لیکن وہ نہیں ملے۔تب امیر نے حکم دیا کہ ان کے باپ، دو بھائیوں، چچا اور دور کے رشتے داروں اور دوسروں کو پکڑ لیا جائے۔اُن کو اس وقت تک اذیت پہنچانا تھی جب تک وہ خواجہ نصرالدین کا پتا نہ بتائیں۔الحمداللہ ان کو اتنا ہمت و استقلال حاصل ہوا کہ انہوں نے اپنی زبان بند رکھی اور ہمارے خواجہ نصرالدین امیر کے ہاتھ نہ آئے۔لیکن ان کے باپ، کاٹھی بنانے والے شیر محمد اذیتوں سے چور ہو کر جلد ہی اس دنیا سے چل بسے اور ان کے عزیزوں اور دوستوں نے امیر کے غیض وغضب سے بچنے کے لئے بخارا چھوڑ دیا اور پتا نہیں کہ اب وہ کہاں ہیں۔پھر امیر نے حکم دیا کہ ان کے گھر تباہ کر دئے جائیں اور ان کے باغ تہس نہس کر دئے جائیں تا کہ خواجہ نصرالدین کی یاد لوگوں کے ذہن سے یکسر محو ہو جائے۔''

''لیکن ان پر ظلم وستم کیوں ڈھایا گیا؟'' خواجہ نصرالدین نے چیخ کر کہا۔ان کے رخساروں پر آنسو بہہ چلے لیکن بڈھے نے آنسو نہیں دیکھے کیونکہ اس کی نگاہ کمزور تھی۔''ان پر کیوں ظلم وستم ڈھایا گیا؟ خواجہ نصرالدین تو اس وقت بخارا میں تھے ہی نہیں۔میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں!''

''کوئی نہیں کہہ سکتا'' بڈھے نے کہا''خواجہ نصرالدین کا جب جی چاہتا ہے آتے ہیں اور جب دل چاہتا ہے چلے جاتے ہیں۔وہ ہر جگہ ہیں اور کہیں نہیں ہیں، ہمارے خواجہ نصرالدین کا جواب نہیں ہے''

یہ کہہ کر بڈھا کراہتا ہوا اور کھانستا ہوا اپنے راستے پر ہولیا۔ خواجہ نصرالدین نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا اور گدھے کے پاس چلے گیے ۔

انہوں نے گدھے کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اپنا بھیگا ہوا چہرہ اس کے گرم اور بساھندی گردن سے دبا دیا۔

''آہ، میرے اچھے، سچے دوست'' خواجہ نصرالدین نے کہا''دیکھو، اب میرا عزیز وقریب کوئی نہیں باقی رہ گیا۔ صرف تو اس آوارہ گردی میں میرا مستقل اور وفادار ساتھی ہے۔''

جیسے گدھے نے اپنے مالک کے رنج وغم کو سمجھ لیا ہو، وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔ بلکہ ایک تنکے کو جو اس کے ہونٹوں سے لٹک رہا تھا چبانا بند کر دیا۔

بہر حال ایک گھنٹے بعد خواجہ نصرالدین اپنے غم پر قابو پا چکے تھے اور آنسو چہرے پر خشک ہو گئے تھے۔

''کوئی پروانہیں!'' انہوں نے گدھے کی پیٹھ کو زور سے تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔''کوئی پروانہیں! مجھے بخارا میں ابھی تک فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ لوگ مجھ کو ابھی تک جانتے ہیں اور یاد کرتے ہیں۔ ہم کچھ دوست پا ہی لیں گے۔ اور امیر کے بارے میں ایسی نظم لکھیں گے کہ وہ اپنے تخت پر غصے سے پھول کر پھٹ جائے گا اور اس کی گندی آنتیں محل کی آراستہ دیواروں کو داغ دار بنا دیں گی! آ، میرے وفادار گدھے، آگے بڑھ!''

4

سہ پہر کا سناٹے کا وقت تھا اور بڑا حبس تھا۔ گرد آلود سڑک، پتھروں، کچی دیواروں اور باڑوں سے حبس پیدا کرنے والی گرمی نکل رہی تھی اور خواجہ نصرالدین کے چہرے پر پسینہ پونچھنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتا تھا۔

وہ جانی پہچانی سڑکوں، چائے خانوں، اور میناروں کو دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے۔ دس سال کے اندر بخارا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کچھ خارشئے کتے پانی کے حوضوں کے کنارے پڑے سو

رہے تھے، اور ایک عورت ادا کے ساتھ جھکی ہوئی اور اپنے نقاب کو سانولے ہاتھ سے جس کے ناخون رنگے ہوئے تھے ایک طرف ہٹا کر تنگ گلے کی قلقل کرتی ہوئی صراحی میلے پانی میں ڈال رہی تھی۔

کھانا کہاں سے اور کیسے حاصل کیا جائے، یہ ایک مسئلہ تھا۔ خواجہ نصرالدین نے کل سے تیسری بار اپنا پٹکا زور سے کسا۔

''کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا چاہئے'' انہوں نے کہا'' آ، میرے وفادار گدھے، ذرا رک کر سوچیں اور یہاں خوش قسمتی سے ایک چائے خانہ بھی ہے۔''

انہوں نے اپنے گدھے کی لگام کھول دی اور گھوڑے باندھنے کی جگہ کے پاس جو گھاس پڑی تھی چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پھر اپنی قبا کے دامنوں کو سمیٹتے ہوئے وہ نہر کے کنارے بیٹھ گئے جہاں گدلا پانی موڑوں پر قلقل کرتا اور جھاگ دیتا ہوا بہہ رہا تھا۔

''کہاں، کیوں اور کہاں سے یہ پانی بہتا ہے؟ پانی اس کی بابت نہ تو جانتا ہے اور نہ سوچتا ہے'' خواجہ نصرالدین نے افسردگی کے ساتھ سوچا۔''میں بھی آرام اور گھر سے بیگانہ ہوں اور نہ تو یہ جانتا ہوں کہ کہاں جا رہا ہوں۔ میں بخارا کیوں آیا؟ میں کل کہاں جاؤں گا؟ اور میں اپنے کھانے کے لئے آدھا تانگا کہاں سے لاؤں؟ کیا مجھے اب بھی بھوکا رہنا پڑے گا؟ لعنت ہو اس ٹیکس کلکٹر پر! اس نے تو مجھے صاف ہی کر دیا۔ اور پھر دیدہ دلیری تو دیکھو کہ مجھ سے رہزنوں کا ذکر کر رہا تھا!''

اسی لمحے انہوں نے اس آدمی کو دیکھا جو ان کی مصیبتوں کا باعث بنا تھا۔ ٹیکس کلکٹر گھوڑے پر سوار چائے خانے آ رہا تھا۔ اس کے خوب صورت عرب سرنگ گھوڑے کو دو پہرے دار لگاموں سے تھامے ہوئے تھے۔ گھوڑے کی سیاہ آنکھوں میں شریفانہ چمک سی تھی۔ اس کی گردن کمان کی طرح کشیدہ تھی اور وہ اپنے نازک پیروں پر اس نزاکت اور چھل بل سے چل رہا تھا کہ اس کے اوپر مالک کا پھولا پھالا بدن قابلِ نفرت بار معلوم ہوتا تھا۔

پہرے داروں نے ادب کے ساتھ اپنے افسر کو گھوڑے سے اترنے میں مدد دی۔ وہ چائے خانے میں چلا گیا جہاں انتہائی غلامانہ ذہنیت رکھنے والا چائے خانے کا مالک اس کو ریشمی گدوں تک لے گیا اور وہ بیٹھ گیا۔ پھر چائے خانے کے مالک نے اپنی بہترین چائے تیار کی اور ایک نفیس پیالے میں جو چینی دستکاری کا نمونہ تھا ٹیکس کلکٹر کے سامنے چائے پیش کی۔

''یہ سب میرے خرچ سے خاطر مدارت ہو رہی ہے'' خواجہ نصر الدین نے سوچا۔

ٹیکس کلکٹر نے خوب چائے پی اور جلد ہی گدوں پر ڈھیر ہو گیا۔ چائے خانہ اس کی غراہٹ، خراٹوں اور ہونٹ چاٹنے کے چٹاخوں سے گونجنے لگا۔ دوسرے لوگوں نے اپنی آوازیں مدھم کر دیں کہ کہیں اس کی نیند میں خلل نہ پڑے۔ پہرے دار اس کے دونوں طرف بیٹھے ٹہنیوں سے مور چھل کر رہے تھے تا کہ مکھیاں اس کو پریشان نہ کر سکیں۔ جب ان کو یقین ہو گیا کہ ٹیکس کلکٹر گہری نیند سو رہا ہے تو انہوں نے ایک دوسرے کی طرف آنکھ ماری، گھوڑے کی لگام اتار دی۔ اس کے سامنے گھاس کا ایک گٹھ ڈال دیا اور ایک حقہ اٹھا کر چائے خانے کے اندر والے تاریک حصے میں چلے گئے۔ ذرا دیر بعد خواجہ نصر الدین نے حشیش کی بھینی بو محسوس کی۔ پہرے دار آزادی کے ساتھ اپنے مشغلے میں پڑے ہوئے تھے۔

''اچھا، اب یہاں سے چلتے پڑنا چاہئے'' شہر کے پھاٹک پر صبح کا واقعہ یاد کر کے یہ ڈرتے ہوئے کہ کہیں پہرے دار انہیں پہچان نہ لیں خواجہ نصر الدین نے فیصلہ کیا۔ ''پھر بھی مجھے آدھا تانگا کہاں ملے گا؟ اے مسبب الاسباب قسمت، تو نے نہ جانے کتنی بار خواجہ نصر الدین کی مدد کی ہے، اس پر ایک نظرِ کرم اور!''

ٹھیک اسی وقت کسی نے ان کو پکارا ''ارے، تم!''

خواجہ نصر الدین نے مڑ کر دیکھا تو سڑک پر ایک بہت سجی ہوئی بند گاڑی دیکھی۔ اس کے پردوں سے ایک آدمی بڑا عمامہ اور قیمتی خلعت پہنے جھانک رہا تھا۔ قبل اس کے کہ اجنبی، جو کوئی امیر سوداگر یا عہدے دار تھا کچھ کہے خواجہ نصر الدین سمجھ گئے کہ ان کی دعا رائیگاں نہیں گئی۔ حسبِ معمول قسمت نے ان کی طرف مشکل کے دوران مسکرا کر دیکھا ہے۔

''مجھے یہ گھوڑا پسند ہے'' امیر اجنبی نے عرب گھوڑے کو تعریف کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے غرور سے کہا ''کیا یہ گھوڑا بکاؤ ہے؟''

''دنیا میں کوئی ایسا گھوڑا نہیں جو بکاؤ نہ ہو'' خواجہ نصر الدین نے مبہم سا جواب دیا۔

''غالباً تمہاری جیب بالکل خالی ہے'' اجنبی کہتا گیا ''میری بات غور سے سنو۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ گھوڑا کس کا ہے، کہاں سے آیا ہے اور اس کا پہلا مالک کون تھا۔ میں تم سے یہ سب نہیں پوچھتا۔ تمہارے گرد آلود کپڑوں کو دیکھ کر میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم کہیں دور سے بخارا آئے ہو۔ بس یہی میرے لئے کافی

ہے۔ سمجھتے ہو نا؟''

خواجہ نصرالدین نے خوشی سے سر ہلا دیا۔ ان کی سمجھ میں فوراً ہی آ گیا کہ یہ امیر آدمی کیا کہنا چاہتا ہے۔ بس وہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی احمق مکھی ٹیکس کلکٹر کی ناک یا گلے میں نہ رینگ جائے اور اس کو جگا نہ دے۔ ان کو پہرے داروں کی زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ جو گھنا سبز دھواں چائے خانے کے اندرونی حصے سے نکل رہا تھا وہ پتا دیتا تھا کہ پہرے دار اپنے مشغلے میں مست ہیں۔

''تمہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے'' امیر اجنبی نے غرور اور شان کے لہجے میں اپنی بات جاری رکھی ''اس پھٹی پرانی قبا میں تم کو اس گھوڑے کی سواری زیب نہیں دیتی بلکہ یہ بات خطرناک بھی ہوگی کیونکہ ہر ایک کو تعجب ہوگا کہ اس بھک منگے کے پاس اتنا عمدہ گھوڑا کہاں سے آیا؟ جان لو آسانی سے جیل کا دروازہ دیکھنے کو مل سکتا ہے۔''

''حضور، آپ بجا فرماتے ہیں'' خواجہ نصرالدین نے خاک ساری سے ہاں میں ہاں ملائی ''یہ گھوڑا یقیناً میرے لئے بہت بڑی چیز ہے۔ میں اپنے پھٹے پرانے لباس میں ساری عمر گدھے کی سواری کرتا رہا ہوں۔ میں اس گھوڑے پر سواری کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔''

اس کا جواب امیر اجنبی کو پسند آیا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تم غریب ہوتے ہوئے غرور سے اندھے نہیں ہو۔ غریب آدمی کو خاکسار اور مسکین ہونا چاہئے کیونکہ خوبصورت پھول حسین بادام کے درخت کو زیب دیتے ہیں ویرانے کی خاردار جھاڑیوں کو نہیں۔ اب بتاؤ، تمہیں یہ تھیلی چاہئے؟ اس میں پورے پورے چاندی کے تین سو تانگے ہیں۔''

''مجھے چاہئے!'' خواجہ نصرالدین نے جلدی سے کہا اور اس کی سانس یکدم رک گئی کیونکہ ایک مکھی ٹیکس کلکٹر کی ناک میں رینگ گئی تھی جس سے اس کو چھینک آ گئی تھی اور اس نے کروٹ لی تھی۔ ''میرا خیال تو یہی ہے! چاندی کے تین سو تانگوں سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے سڑک پر تھیلی پڑی مل جائے!''

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم کو کوئی اور چیز سڑک پر ملی ہے'' اجنبی نے اس طرح مسکراتے ہوئے کہا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ''لیکن سڑک پر جو کچھ تمہیں ملا ہے، میں اس سے اس تھیلی کا تبادلہ کرنے کو تیار ہوں۔ یہ رہے تین سو تانگے۔''

اس نے تھیلی خواجہ نصرالدین کو دے دی اور اپنے نوکر کو اشارہ کیا، جو خاموشی سے کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا اور اپنی پیٹھ چابک سے کھجا رہا تھا۔ جب نوکر گھوڑے کی طرف جا رہا تھا تو خواجہ نصرالدین نے اس کی ہنسی اور اس کے چپڑے، چیچک سے داغدار چہرے کی تھرکتی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگایا کہ وہ بھی اپنے مالک سے کم بدمعاش نہیں ہے۔

''ایک ہی سڑک پر تین مکار، زیادہ ہوئے۔ بس مجھے یہاں سے چلتا بننا چاہئے'' خواجہ نصرالدین نے فیصلہ کیا۔

امیر اجنبی کی شرافت اور فیاضی کو سراہتے ہوئے وہ اچک کر اپنے گدھے پر بیٹھے اور اس کو اتنی زور کی ایڑ لگائی کہ گدھا اپنی تمام کاہلی کے باوجود ہوا ہو گیا۔

جب خواجہ نصرالدین نے مڑ کر دیکھا تو نوکر عرب گھوڑے کو گاڑی میں باندھ رہا تھا اور جب دوبارہ وہ مڑے تو امیر اجنبی اور ٹیکس کلکٹر ایک دوسرے کی ریش مبارک نوچ رہے تھے اور پہرے داران دونوں کو الگ کرنے کی بے سود کوشش کر رہے تھے۔

عقل مند آدمی دوسروں کے جھگڑوں میں اپنی ٹانگ نہیں اڑاتا۔ خواجہ نصرالدین گلی کوچوں کا چکر لگاتے جا رہے تھے، یہاں تک کہ انہوں نے محسوس کیا کہ اب تعاقب کا کوئی خطرہ نہیں ہے اور انہوں نے گدھے کی لگام کھینچ کر رفتار کم کر دی۔

''رک، ارے رُک جا'' انہوں نے کہنا شروع کیا'' اب کوئی جلدی نہیں ہے....''

اچانک انہوں نے بالکل قریب ہی تیز اور خطرناک ٹاپوں کی آواز سنی۔

''ارے، بھاگ میرے وفادار گدھے! بھاگ! مجھے یہاں سے جلدی لے چل!'' انہوں نے للکار کر کہا۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک موڑ سے گھوڑا سوار کود کر سڑک پر آ گیا۔

یہ وہی چیچک رو نوکر تھا۔ وہ گاڑی سے کھولے ہوئے گھوڑے پر سوار تھا۔ اپنے پیر جھلاتے ہوئے وہ خواجہ نصرالدین سے آگے نکل گیا اور اچانک گھوڑے کو سڑک پر روک کر راستہ روک دیا۔

''بھلے مانس، مجھے نکل جانے دو'' خواجہ نصرالدین نے خاکساری سے التجا کی'' ایسی تنگ سڑکوں پر گھوڑا سیدھا لے چلنا چاہئے، آڑا بیڑا نہیں۔''

''اچھا'' نوکر نے طنزیہ ٹھٹھا لگا کر کہا'' اب تم کال کوٹھری سے نہیں بچ سکو گے! جانتے ہو اس

عہدے دار نے جو گھوڑے کا مالک ہے، میرے مالک کی آدھی داڑھی نوچ لی ہے اور میرے مالک نے اس کی ناک لہولہان کر دی ہے؟ کل امیر کی عدالت میں تمہاری پیشی ہوگی۔ سچ مچ، تمہارے برے دن آ گئے!''

''تم کہہ کیا رہے ہو؟'' خواجہ نصرالدین نے حیرت سے کہا ''یہ معزز لوگ کیوں اس بری طرح لڑ پڑے؟ اور تم نے مجھے کیوں روکا؟ میں ان کے جھگڑے میں ثالث نہیں بن سکتا۔ وہ خود جس طرح چاہیں اس کا فیصلہ کریں۔''

''اچھا، بس چپ کرو'' نوکر نے کہا ''لوٹو، تمہیں گھوڑے کے لئے جواب دہی کرنی ہوگی۔''

''کیسا گھوڑا؟''

''تم پوچھتے ہو؟ وہی گھوڑا جس کے لئے تم کو میرے مالک نے چاندی کے سکوں کی تھیلی دی ہے۔''

''خدا کی قسم تم غلط کہہ رہے ہو'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔ ''اس معاملے سے گھوڑے کا کوئی سروکار نہیں۔ خود فیصلہ کرو۔ تم نے تو ساری گفتگو سنی ہے۔ تمہارے مالک شریف اور فیاض آدمی ہیں۔ وہ ایک غریب کی مدد کرنا چاہتے تھے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں چاندی کے تین سو تانگے لینا چاہتا ہوں اور میں نے کہا کہ ضرور۔ اور خدا ان کی عمر دراز کرے انہوں نے مجھے تین سو تانگے دے دئے۔ لیکن رقم دینے سے پہلے انہوں نے میرے انکسار اور خاکساری کی یہ معلوم کرنے کے لئے آزمائش کی کہ آیا میں اس انعام کے لائق ہوں یا نہیں۔ انہوں نے کہا ''میں یہ نہیں پوچھتا کہ یہ گھوڑا کس کا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔' دیکھو نا، وہ جاننا چاہتے تھے کہ آیا جھوٹے غرور میں اس کو میں اپنا گھوڑا بتا دوں گا۔ میں چپ رہا اور یہ فیاض اور شریف انسان خوش ہوا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ایسا گھوڑا میرے لئے بہت بڑی چیز ہوگا اور میں نے ان سے اتفاق کیا۔ اس سے بھی وہ خوش ہوئے۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے سڑک پر وہ چیز پائی ہے جس کا تبادلہ چاندی سے کیا جا سکتا ہے، ان کا اشارہ اسلام کے لئے میرے جوش اور مضبوط عقیدے کی طرف تھا، جو میں نے مقدس مقامات کی زیارت کے لئے سفر کر کے حاصل کیا ہے۔ اور اس کے بعد انہوں نے مجھے انعام دیا، اس نیک کام میں اس کی نیت یہ تھی کہ جنت میں ان کے داخلے میں اس پل کے ذریعہ آسانی ہو جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے، جیسا کہ قرآن شریف

ہم کو بتاتا ہے۔ میں اپنی سب سے پہلی دعا میں اللہ سے یہ دعا کروں گا کہ اس کارِ خیر کی وجہ سے تمہارے مالک کے لئے اس پل پر کٹہرا لگوا دیا جائے۔''

نوکر نے یہ لمبی تقریر غور سے سنی اور چابک سے اپنی پیٹھ کھجاتا رہا۔ آخر میں اس نے چالاکی سے دانت نکالتے ہوئے کہا جس سے خواجہ نصرالدین گھبرا گئے:

''مسافر، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ حیرت ہے کہ میں فوراً ہی یہ کیوں نہیں سمجھ گیا کہ میرے مالک سے تمہاری بات چیت کا کیسا نیک مطلب ہے؟ لیکن چونکہ تم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم میرے مالک کو دوسری دنیا میں پل پار کرنے میں مدد دو گے، تو اگر پل کے دونوں طرف کٹہرا ہو تو اس سے زیادہ حفاظت ہوگی۔ میں بھی بہت خوشی سے اپنے مالک کے لئے دعا کروں گا تاکہ اللہ میاں پل کے دوسری طرف بھی ان کو کٹہرا عطا فرمائے۔''

''تو کرو نہ دعا!'' خواجہ نصرالدین نے زور سے کہا ''تمہیں روکتا کون ہے؟ تمہارا تو ایک طرح سے یہ فرض بھی ہے۔ کیا قرآن میں ہدائت ہیں کی گئی ہے کہ غلاموں اور ملازموں کو روزانہ اپنے مالکوں کے لئے کسی خاص انعام کے مطالبے کے بغیر دعا کرنا چاہئے؟''

''اپنا گدھا موڑو'' نوکر نے سختی سے چلا کر کہا اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر خواجہ نصرالدین کو دیوار تک دبا دیا۔ ''اب جلدی کرو، میرا وقت مت ضائع کرو۔''

''رُکو'' خواجہ جصر الدین نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا ''میں نے ابھی بات نہیں ختم کی ہے۔ میں تانگوں کی تعداد کے مطابق تین سو الفاظ کی دعا پڑھنے والا تھا لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ ڈھائی سو الفاظ کی دعا کافی ہوگی۔ میری طرف کا کٹہرا ذرا پتلا اور چھوٹا ہوگا۔ اور تم پچاس الفاظ کی دعا پڑھو گے اور خدا حکیمِ مطلق ہے، وہ بہتر جانتا ہے کہ تمہاری طرف کا کٹہرا اسی لکڑی سے کیسے بنایا جائے۔''

''کیا'' نوکر نے کہا ''میرا کٹہرا تمہارے کٹہرے سے پانچ گنا چھوٹا کیوں ہو؟''

''لیکن وہ انتہائی خطرناک حصے میں ہوگا'' خواجہ نصرالدین نے جلدی سے کہا۔

''نہیں'' نوکر نے فیصلہ کن طور پر کہا ''میں ایسے چھوٹے کٹہرے پر رضامند نہیں ہوسکتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پل کا ایک حصہ بلا کٹہرے کے ہوگا۔ میں اس خطرے کے خیال ہی سے کانپ اٹھتا ہوں جو میرے مالک کو ہوگا۔ میری رائے میں ہم دونوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو الفاظ کی دعا پڑھنی چاہئے تاکہ دونوں

طرف کٹہرے کی لمبائی ایک ہی ہو۔ چاہے وہ پتلا ہی کیوں نہ ہولیکن دونوں طرف حفاظت تو ہوگی۔ اور اگر تم اس پر تیار نہیں ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پل سے گر پڑیں۔ اچھا، میں لوگوں کو پکارتا ہوں اور تم جلد ہی کال کوٹھری میں ہوگے۔''

''پتلا کٹہرا!'' خواجہ نصرالدین نے گرم ہو کر کہا، ان کو محسوس ہو رہا تھا گویا ان کے پٹکے میں تھیلی کلبلا رہی ہے۔ ''جو کچھ تم کہہ رہے تو اس سے تو یہی اچھا ہے کہ ٹہنیوں کا کٹہرا بنا دیا جائے! تمہاری سمجھ میں نہیں آتا اگر تمہارے مالک کا پیر لڑکھڑائے اور وہ گرنے لگیں تو ان کو کچھ سہارا لینے کو تو مل جائے۔''

''تمہارے منہ سے تو سب سچ ہی نکل رہا ہے'' نوکر نے خوش ہو کر کہا ''میری طرف کا کٹہرا موٹا ہونے دو اور میں دو سو الفاظ کی دعا پڑھنے کی تکلیف بھی گوارا کر لوں گا۔''

''شاید تم اس کو تین سو تک لے جانا پسند کرو'' خواجہ نصرالدین نے زہر میں بجھے لہجے میں کہا۔

آخر کار جب وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے تو خواجہ کی تھیلی آدھی ہلکی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں اس پر راضی ہو گئے تھے کہ جنت کو جانے والے پل کی حفاظت اس آدمی کے مالک کے لئے دونوں طرف ایسے کٹہروں سے ہونی چاہئے جو مضبوطی اور موٹائی دو میں برابر ہوں۔

''خدا حافظ، مسافر'' نوکر نے کہا ''ہم دونوں نے واقعی آج ایک نیک کام کیا ہے۔''

''خدا حافظ، اے انتہائی مہربان، وفادار اور نیک ملازم جو اپنے مالک کی روح کی بخشائش کے لئے اتنا فکر مند ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بحث و مباحثے میں تم خواجہ نصرالدین سے مات نہیں کھاؤ گے۔''

''اس کا ذکر تم نے کیوں کیا؟'' نوکر نے پوچھا، اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

''کچھ نہیں... بس خیال آ گیا'' خواجہ نصرالدین نے اپنے آپ سوچتے ہوئے جواب دیا ''یہ معمولی آدمی نہیں ہے''

''ممکن ہے کہ تم اس کے دور کے رشتے دار ہو؟'' نوکر نے پوچھا۔ ''یا شاید تم اس کے خاندان کے کسی فرد کو جانتے ہو؟''

''نہیں، میری اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور میں خواجہ نصرالدین کے کسی عزیز کو بھی نہیں جانتا۔''

''سنو، میں تمہیں کان میں ایک بات بتاؤں'' نوکر نے اپنی کاٹھی سے جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کا

رشتے دار ہوں۔ دراصل اس کا چچیرا بھائی۔ ہم نے اپنا بچپن ساتھ ساتھ گذارا ہے۔''

خواجہ نصرالدین کے شبہے کی تصدیق ہوگئی اور انہوں نے اپنی زبان روک لی۔ نوکر اور قریب جھک آیا:

''اس کا باپ، دو بھائی اور چچا تو مر چکے ہیں۔ شاید تم نے اس کی بابت سنا ہو، مسافر؟''

لیکن خواجہ نصرالدین اب بھی چپ رہے۔

''امیر نے ایسا ظلم ڈھایا!'' نوکر نے مکاری سے کہا۔

''پھر بھی خواجہ خاموش ہی رہے۔

''بخارا کے تمام وزیر احمق ہیں!'' نوکر نے غیر متوقع طور پر کہا۔ وہ لالچ سے بالکل بے صبر ہو رہا تھا کیونکہ حکومت آزاد خیال لوگوں کی گرفتاری کے لئے کافی انعام دیتی تھی۔ لیکن خواجہ نصرالدین نے زبان پر مہر سکوت لگالی۔

''اور ہمارا معزز امیر بھی احمق ہے!'' اس آدمی نے کہا ''اور یہ بھی یقینی نہیں کہ اللہ کا وجود ہے!''

لیکن خواجہ نصرالدین نے اپنا منہ نہیں کھولا حالانکہ ایک تیز تلخ جواب ان کی زبان پر تھا۔ نوکر کو بڑی ناامیدی ہوئی۔ اس نے زور سے کوستے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دو چھلانگوں میں موڑ پر غائب ہوگیا۔ اب سناٹا ہوگیا۔ صرف ساکن ہوا میں گھوڑے کے سموں سے اٹھنے والی گرد سنہرے دھند کی طرح معلق تھی جس کو گرم اور ترچھی کرنیں چیر رہی تھیں۔

''اچھا، لیجئے مجھے رشتے دار بھی مل گیا'' خواجہ نصرالدین خود سوچ کر مسکرائے۔ ''بڈھے نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ بخارا میں جاسوس مکھیوں کی طرح بھرے ہوئے ہیں۔ ذرا احتیاط کی ضرورت ہے۔ پرانی کہاوت ہے کہ ''مجرم زبان کے ساتھ سر بھی کٹ جاتا ہے۔''

اس طرح وہ گدھے پر کافی دیر تک آگے چلتے رہے، کبھی وہ اپنی تھیلی کی آدھی کائنات کھونے کے بارے میں سوچتے اور کبھی ٹیکس کلکٹر اور مغرور اجنبی کے درمیان جھگڑے کو یاد کر کے ہنستے۔

5

جب خواجہ نصر الدین شہر کے دوسرے حصے میں پہنچ گئے تو وہ رُکے، اپنا گدھا ایک چائے خانے کے مالک کے سپرد کیا اور تیزی کے ساتھ ایک طعام خانے پہنچے۔

وہاں بڑی بھیڑ تھی، کھانے کی مہک ہر طرف پھیلی تھی۔ تندور روشن تھے اور شعلے لپک رہے تھے جو باورچیوں کے پسینے سے تر پٹھوں کو چمکا دیتے تھے۔ باورچی کمر تک ننگے کام کر رہے تھے، وہ اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے، شور کر رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ اور باورچی خانے میں کام کرنے والے چھوکروں کی گدی پر دھپ بھی جما دیتے تھے۔ گھبرائی گھبرائی آنکھوں والے چھوکرے اِدھر اُدھر بھاگ بھاگ، دھکا پیل، غل اور ہنگامے میں اضافہ کر رہے تھے۔ لکڑی کے ناچتے ہوئے ڈھکنوں والے بڑے بڑے دیگچوں سے کھد بدانے کی آواز آ رہی تھی، چھت کے قریب بھاپ کے گھنے بادل جمع تھے، جہاں لاتعداد مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس دھندلکے میں گھی زوروں میں سنسنا اور اُبل رہا تھا، انگیٹھیوں کی دیواریں لال بھبھوکا ہو کر چمک رہی تھیں، اور سیخوں سے چربی ٹپک کر کوئلے پر گر رہی تھی، اور نیلگوں، دھوئیں دار شعلے بھڑکا کر جل جاتی تھی۔ یہاں پلاؤ پک رہا تھا، بوٹی کے کباب بھونے جا رہے تھے، اوجھڑی اُبل رہی تھی، اور پیاز، مرچ، گوشت اور دُنبے کی دُم کی چربی سے بھرے ہوئے سموسے سینکے جا رہے تھے۔ چربی تندور میں پگھل کر سموسوں سے نکل پڑتی تھی اور چھوٹے چھوٹے بلبلے بناتی تھی۔

بڑی مشکل سے خواجہ نصر الدین کو ایک جگہ ملی، جہاں اُن کو اِس طرح کسمسا کر بیٹھنا پڑا کہ جن لوگوں کو اُنہوں نے اپنی پیٹھ اور پہلوؤں سے دبایا، وہ چیخ اُٹھے۔ لیکن کوئی ناراض نہ ہوا، کسی نے ایک لفظ بھی اُن کو نہیں کہا اور نہ وہ خود ہی بڑبڑائے۔ اُن کو خود ہمیشہ بازار کے طعام خانوں کی ایسی گرما گرم بھیڑ بھکڑ، یہ تمام چیخ پکار، ہنسی مذاق، قہقہے، غل غپاڑہ، دھکم دھکا، زوردار کھانس کھنکار، اور اِس سینکڑوں آدمیوں کے کھانا کھانے کی آوازیں جو دن بھر کی شدید محنت کے بعد کھانا کھانے میں انتخاب کی تاب نہیں رکھتے، اور اِن کے طاقتور جبڑے ہر چیز کو چبا ڈالتے ہیں، خواہ وہ گوشت ہو یا ہڈی۔ ہر سستی اور افراط سے ملنے والے چیز کو سخت معدہ قبول کر لیتا ہے۔ خواجہ نصر الدین نے بھی خوب جی بھر کر کھایا۔ وہ ایک جگہ بیٹھ کر تین پلیٹ شوربا، تین پلیٹ پلاؤ اور دو درجن سموسے کھا گئے۔ سموسے ختم کرنے میں ذرا کوشش کرنی پڑی، لیکن پھر بھی کھا لیا کیونکہ خواجہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جس چیز کی قیمت ادا کرتے تھے اُس کو پلیٹ میں نہیں چھوڑتے

تھے۔

آخر اُنہوں نے دروازے کا رُخ کیا، اور جب کسی طرح کہنیوں سے راستہ بنا کر وہ کھلی ہوا میں پہنچے تو پسینے سے نہائے ہوئے تھے۔ اُن کے بازو اور پیر ایسے کمزور اور نرم ہو رہے تھے جیسے وہ کسی حمام میں ابھی ابھی کسی ہٹے کٹے غسال کے ہاتھ سے چھٹکارا پا کر نکلے ہیں۔ کھانے اور گرمی سے بھاری پن محسوس کرتے ہوئے وہ اُس چائے خانے تک پیر گھسیٹتے پہنچے جہاں اُنہوں نے اپنا گدھا چھوڑا تھا۔ اُنہوں نے چائے لانے کے لئے کہا اور نمدے پر مزے سے دراز ہو گئے۔ اِن کی آنکھیں بند ہو گئیں، اور اِن کے دماغ میں پُرسکون اور خوش گوار خیالات آنے لگے:

''اس وقت میرے پاس کافی رقم ہے۔ اِس کو کسی دکان میں لگا دینا اچھا رہے گا۔ ساز یا برتن بنانے کی دکان میں۔ میں دونوں حرفتیں جانتا ہوں۔ اب آوارہ گردی چھوڑ دینا چاہئے۔ کیا میں دوسروں سے کم تر ہوں؟ کم عقل ہوں؟ کیا میرے بیٹا نہیں ہوسکتا جس کو میں گود میں لے کر کھلاؤں؟ پیغمبر صاحب کی ریشِ مبارک کی قسم، ننھا شریر بڑھ کر پکا بدمعاش ہوگا اور میں اپنی سوجھ بوجھ ضرور اِس کو عطا کر سکوں گا۔ بس، میں نے طے کر لیا۔ خواجہ نصر الدین نے اپنی بے سکون زندگی ختم کر دی۔ اب ابتدا کے لئے میں کمہار کا کام کروں یا ساز بنانے والے کا...''

اُنہوں نے حساب لگانا شروع کیا۔ اچھی دکان کے لئے کم از کم تین سو تانگوں کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اِن کے پاس تو صرف ڈیڑھ سو تھے۔ اُنہوں نے چچک رو ملازم پر لعنت بھیجی:

''اللہ اِس لٹیرے کو اندھا کر دے۔ اُس نے مجھ سے وہ لے لیا جس کی مجھے زندگی شروع کرنے کے لئے ضرورت تھی! ایک مرتبہ قسمت نے پھر اِن کا ساتھ دیا۔ ''بیس تانگے،'' کسی نے اچانک زور سے کہا۔ پھر ایک تانبے کی تھالی میں پانسے کے گرنے کی آواز آئی۔

برساتی کے کنارے اور بالکل اُسی جگہ کے قریب جہاں گھوڑے باندھے جاتے تھے، اور جہاں اُن کا گدھا بندھا تھا، آدمیوں کا ایک چھوٹا سا حلقہ بندھا تھا۔ چائے خانے کا مالک، اُن کے پیچھے کھڑا اُن کے سر کے اوپر سے گردن بڑھا بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔

''جوا ہو رہا ہے'' خواجہ نصر الدین نے اپنی کہنیوں پر اُٹھتے ہوئے اندازہ لگایا۔ ''وہ قطعی جوا کھیل رہے ہیں! ذرا دیکھوں تو دور ہی سے سہی۔ میں کھیلوں گا نہیں۔ میں کوئی احمق ہوں؟ لیکن عقل مند آدمی

احمقوں کو کھیلتے تو دیکھ ہی سکتا ہے۔''

وہ اُٹھ کر جواریوں کے پاس گئے۔

''احمق ہیں یہ لوگ'' اُنہوں نے چپکے سے چائے خانے کے مالک سے کہا،''جیتنے کے لالچ میں اپنی آخری کوڑی تک لگا دیتے ہیں۔ کیا پیغمبر صاحب نے جوئے کی ممانعت نہیں کی ہے؟ خدا شکر ہے کہ میں اِس مہلک برائی سے پاک ہوں، لیکن اِس لال بالوں والے جواری کی قسمت کتنی اچھی ہے! اِس کو متواتر چار بار جیت ہو چکی ہے... دیکھو، دیکھو۔ وہ پانچویں مرتبہ بھی جیت گیا! اِس کو دولت کے جھوٹے تصور نے ورغلایا ہے جبکہ غربت اِس کے راستے میں گڑھا کھود چکی ہے۔ ارے کیا؟ اُس نے چھٹی مرتبہ بازی مار لی۔ میں نے ایسی قسمت کبھی نہیں دیکھی۔ دیکھو، وہ پھر داؤں لگا رہا ہے۔ سچ ہے، انسان کی حماقت کی کوئی انتہا نہیں۔ آخر کار وہ متواتر کب تک جیتا کرے گا؟ اِس طرح لوگ جھوٹی قسمت پر بھروسہ کر کے تباہ ہوتے ہیں! اِس لال بالوں والے آدمی کو سبق دینا چاہئے۔ اگر وہ ساتویں مرتبہ جیتا تو میں اُس کے خلاف داؤں لگاؤں گا حالانکہ میں دل سے ہر قسم کے جوئے کے خلاف ہوں۔ اگر میں امیرِ بخارا ہوتا تو بہت دن ہوئے اِس کو ممنوع قرار چکا ہوتا۔''

لال بالوں والے جواری نے پانسہ پھینکا اور ساتویں بار بھی بازی اسی کے ہاتھ رہی۔

خواجہ نصر الدین نے بڑے عزم کے ساتھ قدم آگے بڑھایا، کھلاڑیوں کو کندھے سے الگ ہٹا دیا، اور حلقے میں کھیلنے کے لئے بیٹھ گئے۔

''میں تمہارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں۔'' اُنہوں نے خوش قسمت جیتنے والے سے کہا، اُنہوں نے پانسے اُٹھا لئے اور اِن کا ہر رُخ سے اپنی تجربے کار نگاہوں سے جائزہ لیا۔

''کتنے سے؟'' لال بالوں والے نے بھاری آواز سے پوچھا۔ اُس کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ وہ اپنی خوش قسمتی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو تھوڑی دیر کے لئے اُسے نصیب ہو گئی تھی۔

خواجہ نصر الدین نے جواب میں اپنی تھیلی نکالی۔ شدید ضرورتوں کے لئے پچیس تانگے الگ کر لئے اور پھر تھیلی خالی کر دی۔ تانبے کی تھالی پر چاندی کی جھنکار ہوئی۔ جواریوں نے داؤں کا پُر اشتیاق شور سے خیر مقدم کیا۔ اونچے داؤں سے کھیل شروع ہو رہا تھا۔

لال بالوں والے آدمی نے پانسے لئے اور بڑی دیر تک ہلایا۔ وہ اِن کو پھینکتے ہوئے جھجھک رہا تھا۔

ہر ایک سانس روکے ہوئے تھا۔ حتیٰ کہ گدھے نے بھی اپنا تھوتھن آگے بڑھا دیا تھا اور کان کھڑے کر دئے تھے۔ صرف جواری کی مُٹھی میں پانسوں کی کھنکھناہٹ کی آواز ہو رہی تھی۔ اس خشک کھنکھناہٹ نے خواجہ نصر الدین کے پیروں اور پیٹ میں ایک تھکن آمیز کمزوری پیدا کر دی۔ آخر کار لال بالوں والے نے پانسہ پھینکا۔ دوسرے کھلاڑیوں نے گردن بڑھا کر دیکھا اور پھر اِس طرح پیچھے گر گئے جیسے وہ سب ایک ہی آدمی ہوں، اُن کے سینوں سے ایک گہری آہ نکلی جیسے ایک ہی سینے سے نکل رہی ہو۔ لال بالوں والے جواری کا چہرہ زرد ہو گیا اور اُس نے بھنچے ہوئے دانتوں سے ایک آہ کی۔ پانسے میں صرف تین نقطے نظر آ رہے تھے، یعنی ہر قطعی تھی کیونکہ دو کا پانسہ اِسی طرح کم گرتا تھا جیسے بارہ کا۔ باقی ہر پانسہ خواجہ نصر الدین کے حق میں تھا۔

پانسے کو مٹھی میں ہلاتے ہوئے خواجہ نصر الدین نے دل ہی میں قسمت کا شکر ادا کیا کہ آج وہ اتنی بڑی مہربان تھی۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ قسمت بڑی متلون مزاج اور من موجی ہے اور اگر اُس کو ذرا بھی تنگ کرو تو فوراً دغا دے جاتی ہے۔ قسمت نے یہ فیصلہ کیا کہ خواجہ نصر الدین کو اِس خود اعتمادی کے لئے سبق دے اور اُن کے گدھے کو اپنا ہتھیار بنایا یا زیادہ ٹھیک یہ کہنا ہوگا کہ اُن کے گدھے کی دُم کو جس کا سرا کانٹوں اور گوکھروؤں سے مرصع تھا۔ گدھے نے جواریوں کی طرف سے پیٹھ موڑ کر جو اپنی دُم ہلائی، تو اُس کے مالک کے ہاتھ میں جا لگی۔ پانسہ ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور لال بالوں والا جواری ایک زوردار نعرہ لگا کر آناً فاناً تھالی پر گرا اور ساری رقم پر چھا گیا۔

خواجہ نے دو پھینکے تھے۔

وہ بڑی دیر تک خاموش بیٹھے اپنے ہونٹ چلاتے رہے۔ اُن کی تکتی ہوئی آنکھوں کے سامنے ساری دُنیا ڈگمگا اور تیر رہی تھی اور کان عجیب آوازوں سے بج رہے تھے۔ اچانک اُک کر اُٹھے اور ڈنڈا لے کر بے تحاشا دنبے کو پیٹنے لگے۔ وہ اُسے کھونٹے کے چاروں طرف دوڑا رہے تھے۔

''منحوس گدھا! ولد الزنا! بد بودار جانور، دُنیا کی تمام مخلوقات کے لئے لعنت!'' خواجہ نصر الدین گرج رہے تھے ''اپنے مالک کے پیسے سے جوا ہی کھیلنا کیا کم تھا نہ کہ اُس کو ہار بھی جانا۔ خدا کرے تیری شیطانی کھال پھٹ جائے! اللہ کرے تیرے راستے میں ایسا گڑھا آئے کہ تیرا پیر ٹوٹ جائے! نہ معلوم تو کب مرے گا کہ تیری منحوس صورت سے مجھے چھٹکارا ملے!''

کدھار ینگنے لگا۔ جواریوں میں قہقہا پڑا اور لال بالوں والے نے تو سب سے زور کا قہقہہ لگایا۔ اُس کو اپنی خوش قسمتی پر قطعی بھروسہ ہو چکا تھا۔

''آؤ پھر کھیلیں'' اُس نے خواجہ نصرالدین سے کہا جب تھک کر اُن کی سانس پھول چکی اور اُنہوں نے ڈنڈا پھیک دیا۔'' آؤ کچھ بازیاں اور ہو جائیں۔ ابھی تو تمہارے پاس پچیس تانگے ہیں۔''

یہ کہہ کر اُس نے اپنا بایاں پیر پھیلا کر اُس کو ہلایا۔ گویا اِس طرح اُس نے خواجہ نصرالدین کے لئے حقارت کا اظہار کیا۔

''کیوں نہیں؟'' خواجہ نے یہ سوچتے ہوئے جواب دیا کہ اب ایک سو بیس تانگے تو ضائع ہو ہی چکے، رہے باقی پچیس تانگے، اُن کا جو حشر ہو۔

اُنہوں نے لاپروائی سے پانسہ پھیکنا اور جیت گئے۔

''پوری رقم رہی!'' لال بالوں والے نے ہاری ہوئی رقم تھالی میں پھینکتے ہوئے تجویز کی۔

خواجہ نصرالدین پھر جیت گئے۔

لال بالوں والے کو یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ قسمت نے اُس سے اِس طرح مُنہ پھیر لیا ہے۔

''ساری رقم رہی!''

متواتر سات بار اُس نے کہا اور ہر مرتبہ وہ ہارا۔ ساری تھالی رقم سے بھر گئی۔ جواری بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اُن کی شعلہ ور آنکھیں صرف اِس اندرونی آگ کی آئینہ دار تھیں جو اُن کو جلائے ڈال رہی تھی۔

آخر شیطان تمہاری مدد نہیں کر رہا ہے تو تم ہر بار تو نہیں جیت سکتے!'' لال بالوں والے نے چلا کر کہا۔'' کبھی تو ہارو گے! لو یہ تھالی میں رہے تمہارے ایک ہزار چھ سو تانگے۔ تم پھر ایک بار ساری رقم داؤں پر لگاؤ گے؟ یہ رہی وہ رقم جس سے کل میں اپنی دکان کے لئے بازار میں سامان خریدنے والا تھا۔ میں تمہارے خلاف یہ ساری رقم داؤں پر لگاتا ہوں!''

اُس نے ایک تھیلی پھینکی جس میں سونے کے سکے بھرے تھے۔

''اپنا سونا تھالی میں رکھو'' خواجہ نصرالدین نے جوش میں آکر زور سے کہا۔

اِس چائے خانے میں اتنا زبردست داؤں کبھی نہیں لگا تھا۔ چائے خانے کا مالک تو اپنی ابلتی ہوئی کیتلیوں کو بھی بھول گیا۔ جواری زور زور سے ہانپ رہے تھے۔ لال بالوں والے نے پہلے پانسہ پھینکا۔

اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تھیں کیونکہ وہ دیکھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔

''گیارہ!'' سب ایک ساتھ مل کر چلائے۔خواجہ نصرالدین نے سمجھ لیا کہ اب بازی ہاری ہی سمجھو۔ صرف بارہ کا پانسہ ہی اُس کو بچا سکتا تھا۔

''گیارہ! گیارہ!'' کاک بالوں والا جواری خوشی سے بے ساختہ دُھرا رہا تھا۔''دیکھو نا، میرے گیارہ ہیں! تم ہار گئے! تم ہار گئے!''

خواجہ نصرالدین سر سے پیر تک ٹھنڈے پڑ گئے۔اُنہوں نے پانسے لے کر اُن کو پھینکنے کی تیاری کی۔ پھر یکا یک انہوں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

''گھوم جا!'' اُس نے اپنے گدھے سے کہا''تو نے تین کے پانسے کے خلاف ہرایا ہے تو اب گیارہ کے خلاف جتا۔نہیں تو میں تجھے قصاب گھر دکھاؤں گا۔''

اُنہوں نے گدھے کی دُم بائیں ہاتھ سے پکڑ کر دائیں ہاتھ پر ماری جس میں پانسے تھے۔

سارے لوگوں کے غل سے چائے خانہ گونج گیا۔چائے خانے کے مالک نے اپنا دل تھام لیا اور زمین پر گر گیا، وہ اتنے زبردست دھکے کو نہ برداشت کر سکا۔

پانسے میں بارہ دکھائی دے رہے تھے۔

لال بالوں والے کی آنکھیں حلقوں سے نکل پڑتی تھیں اور اُس کے بے خون والے چہرے پر چمک تھیں۔وہ آہستہ سے اُٹھا اور لڑکھڑا ہوا چلا۔وہ بار بار چلّا رہا تھا''تباہ ہو گیا، تباہ ہو گیا میں!''

کہا جاتا ہے کہ اُس دن سے لال بالوں والا پھر شہر میں دکھائی نہیں دیا۔وہ ریگستان میں بھاگ گیا اور وہاں اُس کے بال بڑھ گئے اور صورت وحشت ناک ہو گئی۔وہ ریت اور کٹیلی جھاڑیوں کے درمیان مارا مارا پھرتا اور برابر یہی چیختا رہتا''تباہ ہو گیا میں!'' یہاں تک کہ گیدڑوں نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔لیکن کسی نے اُس کا ماتم نہیں کیا کیونکہ وہ ظالم اور نا انصاف تھا اور اُس نے اعتبار کرنے والے سیدھے سادے لوگوں کو ہرا کر بڑا نقصان پہنچایا تھا۔

جہاں تک خواجہ نصرالدین کا تعلق ہے اُنہوں نے اپنی جیتی ہوئی نئی دولت کو خورجینوں میں ڈالا اور اپنے گدھے کو لپٹا کر اُس کے گرم تھوتھن کو زور سے چوما، اُس کو کچھ مزے دار، تازہ نان کھلائی جس پر گدھے کو تعجب ہوا کیونکہ چند منٹ پہلے مالک کا برتاؤ بالکل برعکس رہ چکا تھا۔

6

اِس دانش مندانہ اصول پر عمل کرتے ہوئے کہ اُن لوگوں سے دور ہی رہنا چاہئے جو یہ جانتے ہوں کہ تم اپنی پونجی کہاں رکھتے ہو خواجہ نصرالدین نے چائے خانے میں تضیع اوقات نہیں کیا اور بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ بار بار پیچھے مُڑ کر دیکھتے جاتے کہ کوئی اُن کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے کیونکہ جواریوں اور چائے خانے کے مالک کے چہروں پر بدنیتی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

حالات تو بہت خوشگوار تھے۔ اب وہ کوئی بھی دکان خرید سکیں گے، دو دو دکانیں، تین دکانیں۔ اور اُنہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہی کریں گے۔

''میں چار دکانیں خرید لوں گا، برتن بنانے کی، ساز بنانے کی، درزی اور موچی کی دکانیں۔ ہر ایک میں دو کاریگر لگا دوں گا۔ بس، میرا کام پیسہ جمع کرنا رہ جائے گا۔ دو سال میں امیر بن جاؤں گا۔ ایک مکان خرید لوں گا جس کے باغ میں فوارے ہوں گے۔ میں ہر جگہ چہچہاتی ہوئی چڑیوں کے سونے کے پنجرے ٹانگوں گا، اور میرے دو شائد تین بیویاں ہوں گی اور ہر ایک سے تین تین بیٹے...''

اُنہوں نے اپنے کو خیالوں کے خوشگوار سیلاب میں بہنے دیا۔ اِس دوران میں گدھے نے لگام کی برفت نہ محسوس کر کے اپنے مالک کے ہوائی قلعے سے فائدہ اٹھایا۔ جب وہ ایک چھوٹے سے پُل پر سے پہنچے تو دوسرے گدھوں کی طرح اُسے پار کرنے کے بجائے وہ ایک طرف مُڑا اور سیدھا خندق کے اوپر سے جست لگا گیا۔

''...اور جب میرے بچے بڑے ہوں جائیں گے تو میں اُن کو اکٹھا کر کے کہوں گا...'' خواجہ نصرالدین خیالات کی دُنیا میں اس طرح اُڑے چلے جا رہے تھے ''لیکن میں ہوا میں اُڑ کیوں رہا ہوں؟ کیا خدا نے مجھ کو فرشتہ بنا کر پر عطا کر دئے ہیں؟''

دوسرے لمحے آنکھوں سے نکلتی ہوئی چنگاریوں نے خوانہ نصرالدین کو یقین دلایا کہ اُن کے پر نہیں ہیں۔ کاٹھی سے اُچھل کر اپنی سواری سے کچھ گز آگے وہ سڑک پر دراز تھے۔

جب وہ گرد سے لت پت کراہتے ہوئے سڑک سے اُٹھے تو گدھا اُن کے پاس آ گیا۔ وہ اپنے کان دوستانہ انداز میں ہلا رہا تھا اور اُس کے چہرے پر انتہائی معصومانہ تاثرات تھے جیسے وہ اپنے مالک کو مدعو کر رہا ہو کہ وہ پھر کاٹھی پر واپس آ جائے۔

''ارے تو، جو میرے پلے پڑ گیا ہے صرف میرے گناہوں کی سزا کے لئے نہیں بلکہ میرے باپ، دادا، پردادا کے گناہوں کے لئے بھی، کیونکہ اسلامی انصاف کے نقطۂ نظر سے ایک آدمی کو صرف اپنے گناہوں کے لئے اتنی بھاری سزا دینا نا منصفانہ بات ہوگی!'' خواجہ نصرالدین نے کہا۔ اُن کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی ''ارے تو، مکڑے اور لکڑ بھگے کا بچہ! ارے تو...''

لیکن اب اُنہوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ تھوڑی ہی دور پر ایک تباہ شدہ دیوار کے سائے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ چپ ہو گئے۔

کوسنے اور گالیاں خواجہ نصرالدین کی زبان پر آ کر رُک گئیں۔ اُنہوں نے سوچا کہ ایسے آدمی کو جس کی دیکھنے والوں کی موجودگی میں ایسی مضحکہ انگیز اور بُری گت بنی ہو اپنی حالت پر خود سب سے زور سے ہنسنا چاہئے۔ اُنہوں نے اُن آدمیوں کی طرف جو بیٹھے تھے آنکھ ماری اور اپنی پوری سفید بتیسی نکال کر ہنس پڑے۔

''ارے'' اُنہوں نے زندہ دلی کے ساتھ زور سے کہا ''کتنی زوردار اُڑان رہی میری! اچھا بتاؤ کتنی قلابازیاں میں نے کھائیں۔ مجھے تو اُن کے شمار کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بدمعاش کہیں کے!'' وہ خوش دلی کے ساتھ دگدے کو تھپ تھپانے لگے حالانکہ دل تو یہ چاہتا تھا کہ اُس کو چار چوٹ کی ماردیں۔ ''یہ بڑا شریر ہے! بس ذرا نگاہ چوکی کہ یہ دکھا گیا اپنے ہتھکنڈے!''

خواجہ نصرالدین زندہ دلی کے ساتھ ہنسے لیکن اُن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کوئی اور اُن کے ساتھ نہیں ہنسا۔ لوگ خاموش، سر جھکائے اور اداس بیٹھے تھے اور عورتیں جن کی گود میں بچے تھے چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھیں۔

''کچھ گڑبڑ ہے،'' خواجہ نصرالدین نے سوچا۔

وہ اُن آدمیوں کے پاس گئے اور ایک سفید ریش آدمی کو مخاطب کیا جس کا چہرہ مریل سا تھا ''معزز بزرگ، مجھے بتایئے، کیا بات ہے۔ میں یہاں نہ تو مسکراہٹ دیکھتا ہوں اور نہ کوئی قہقہہ سنتا ہوں اور یہ عورتیں رو کیوں رہی ہیں؟ آپ لوگ سڑک کے کنارے اِس گرد اور گرمی میں کیوں بیٹھے ہیں؟ کیا آپ لوگوں کو اپنے گھروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنا نہیں سہاتا؟''

''گھروں میں اُن لوگوں کے لئے بیٹھنا اچھا ہوتا ہے جن کے گھر ہوتے ہیں'' بڈھے نے ملول ہو

کر جواب دیا۔''ارے مسافر، ہم سے مت پوچھ۔ہم پر بڑی بپتا ہے اور تو کسی طرح بھی ہماری مدد نہیں کر سکتا ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں بوڑھا اور معذور ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میرے لئے جلدی موت بھیج دے۔''

''ایسا کیوں کہتے ہیں آپ؟'' خواجہ نصرالدین نے ملامت کرتے ہوئے کہا''انداز کو کبھی اِس طرح نہیں سوچنا چاہئے۔ مجھے اپنی مصیبت بتایئے اور میری بُری حالت پر مت جایئے۔شائد میں آپ کی مدد کر سکوں۔''

''میری کہانی مختصر ہے۔صرف ایک گھنٹہ پہلے جعفر سود خور ہماری سڑک سے امیر کے دو پہرے داروں کے ساتھ گزرا۔ میں اُس کا قرض دار ہوں اور کل اُس کو ادا کرنا ہے۔اِس لئے اُنہوں نے مجھ کو اِس گھر سے نکال دیا ہے جہاں میں نے اپنی پوری زندگی گزاری ہے۔میرے نہ تو کوئی خاندان ہے اور نہ سر چھپانے کی کوئی جگہ...اور میری ساری پونجی ___ میرا گھر، باغ، مویشی، اور انگوروں کے چمن کل جعفر نیلام کر دے گا۔''

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس کی آواز کانپنے لگی۔

''اور کیا قرض بہت ہے؟'' خواجہ نصرالدین نے پوچھا۔

''بہت زیادہ! میں اُس کا ڈھائی سو تانگے کا قرض دار ہوں!''

''ڈھائی سو تانگے!'' خواجہ نصرالدین نے حیرت سے کہا۔''اور اِن کم بخت ڈھائی سو تانگوں کے لئے آدمی موت کی تمنا کرتا ہے۔اچھا، اچھا اب اپنے کو سنبھالو'' اُنہوں نے گدھے کی طرف مُڑ کر کہا اور خورجین کھولی''اچھا، میرے معزز دوست، یہ رہے ڈھائی سو تانگے، جاؤ، یہ سود خور کو دو اور لات مار کر اُس کو اپنے گھر سے نکال دو، زندگی کے باقی دن امن چین اور ہنسی خوشی سے گزارو۔''

چاندی کے سکوں کے چھنکار سُن کر سارے گروہ میں جان پڑ گئی۔بُڈھے کی تو زبان ہی بند ہو گئی۔ اُس نے آنسو بھری شکر گزار آنکھوں سے خواجہ کی طرف دیکھا۔

''دیکھو نا؟ اور تُم اپنی مصیبت مجھے نہیں بتا رہے تھے'' خواجہ نصرالدین نے آخری سکہ گنتے ہوئے کہا۔ساتھ ہی وہ سوچ رہے تھے''کوئی بات نہیں، آٹھ کاریگروں کے بجائے میں صرف سات ہی نوکر رکھوں گا اور وہ مجھے کافی ہوں گے۔''

اچانک ایک عورت جو بڈھے کے پاس ہی بیٹھی تھی خواجہ نصرالدین کے پیروں پر گر پڑی اور ڈاڑھیں مار مار کر روتے ہوئے اپنا لڑکا اُن کی طرف بڑھا دیا: ''دیکھئے'' اُس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا ''یہ بیمار ہے۔ اُس کے ہونٹ خشک ہیں اور چہری جل رہا ہے۔ میرا بے کس ننھا سڑک پر مر جائے گا کیونکہ مجھے بھی گھر سے نکال دیا گیا ہے۔''

خواجہ نصرالدین نے لڑکے کا دبلا پتلا، زرد چہرہ دیکھا، پھر اُس کے شفاف ہاتھ اور بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ ار اُن کے جھریوں پڑے، مصیبتوں سے مرجھائے چہروں اور متواتر گریہ زاری سے، دھندلی آنکھوں سے اُن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی جلتی ہوئی چھری اُن کے دل میں اُتر گئی ہے۔ اچانک اُن کا گلا رُندھ گیا۔ غم و غصے سے خون کی گرم لہر اُن کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اُنہوں نے اپنا رُخ موڑ لیا۔

''میں بیوہ ہوں'' عورت نے اپنی داستان جاری رکھی ''میرا شوہر چھ مہینے ہوئے مر گیا۔ وہ سودخور کا دوسو تانگوں کا قرض دار تھا۔ قانون کے مطابق میں اِس قرض کی ذمے دار ہوں۔''

''واقعی لڑکا بیمار ہے'' خوجہ نصرالدین نے کہا۔ ''یہ رہے دوسو تانگے۔ جلدی گھر جاؤ اور اس کے سر پر ٹھنڈی پٹی رکھو اور یہ پچاس تانگے اور ہیں۔ جاؤ کسی حکیم کو بلاؤ اور دوا خریدو۔''

خود اُنہوں نے سوچا ''میں چھ ہی کاریگروں سے کام چلا سکتا ہوں۔''

لیکن اِسی لمحے ایک قد آور لمبی داڑھی والا پتھر کٹا اُن کے قدموں پر گر پڑا۔ کل اُس کا سارا خاندان جعفر کے چار سو تانگوں کے قرض کے لئے غلاموں کی طرح بکنے والا تھا۔

''پانچ کاریگر واقعی کم ہوئے'' خواجہ نصرالدین نے ایک بار پھر اپنی خورجین کھولتے ہوئے سوچا۔ ابھی اُس کو اُنہوں نے پھر باندھا ہی تھا کہ دو عورتیں اُن کے پیروں پر تھیں۔ اُن کی کہانیاں بھی ایسی دل دوز تھیں کہ خواجہ نصرالدین کا ہاتھ اتنی کافی رقم دینے سے نہ رکا جو سودخور کا قرض ادا کرنے کے لئے کافی تھی۔ پھر یہ دیکھ کر کہ جو رقم باقی رہ گئی ہے وہ تین کاریگر رکھنے کے لئے مشکل سے کافی ہوگی، اُنہوں نے سوچا کہ اب دکانوں کا خیال بیگار ہے اور اُنہوں نے فیاضی کے ساتھ جعفر سودخور کے دوسرے قرض داروں میں رقم بانٹ دی۔

اب خورجین میں پانچ سو سے زیادہ تانگے نہ رہ گئے ہوں گے۔ اس وقت خواجہ نصرالدین نے ایک

طرف ایسا آدمی بیٹھا دیکھا جس نے مدد کی التجا نہیں کی تھی اور وہ دیکھنے سے ہی مصیبت زدہ معلوم ہوتا تھا۔

''ارے تم، سنتا تو!'' خواجہ نصرالدین نے پکار کر کہا۔ ''اگر تمہارے اوپر مہاجن کا قرض نہیں ہے تو تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

''میں اُس کا قرض دار ہوں'' آدمی نے بھاری آواز میں کہا ''کل میں پا بہ زنجیر غلاموں کے بازار جاؤں گا۔''

''تم خاموش کیوں رہے؟''

''اے فیاض اور مہربان مسافر میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ مقدس بزرگ بہاؤالدین ہوں جو غریبوں کی مدد کرنے کے لئے اپنے مزار سے اُٹھ کر آئے ہیں یا خود ہارون رشید۔ میں نے آپ کی مدد نہیں مانگی کیونکہ آپ ابھی تک کافی خرچ کر چکے ہیں اور میرا قرض سب سے زیادہ ہے یعنی پانچ سو تانگے۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر آپ نے مجھ کو یہ رقم دے دی تو بڈھوں اور غریب عورتوں کے لئے کافی نہ بچے گا۔''

''تم حق پرست شریف اور ایماندار انسان ہو'' خواجہ نصرالدین نے بہت متاثر ہو کر کہا ''لیکن میں بھی حق پرست، شریف اور ایمان دار ہوں اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کل تم پا بہ زنجیر غلاموں کے بازار نہیں جاؤ گے۔ اپنا دامن بڑھاؤ۔''

اُنہوں نے اپنی خورجین کا آخری سکہ تک دے دیا۔ یہ آدمی اپنی قبا کا دامن بائیں ہاتھ سے سنبھال کر خواجہ نصرالدین سے دائیں ہاتھ سے لپٹ گیا اور اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اُن کے سینے میں دبا دیا۔

''واقعی تم نے اپنے گدھے پر سے مزے میں قلابازی کھائی تھی'' اچانک قد آور لمبی داڑھی والے پتھر کٹے نے زور کا ٹھٹھا مار کر کہا۔ اِس پر اور دوسرے لوگ بھی قہقہے لگانے لگے۔ مرد موٹی بھاری آوازوں سے اور عورتیں اپنی باریک آواز میں، بچے مسکرا کر خواجہ نصرالدین کی طرف ہاتھ پھیلانے لگے جو سب سے زور سے ہنس رہے تھے۔

''ھاھاھا!'' خواجہ ہنس رہے تھے اور خوشی سے دُھرے ہوئے جا رہے تھے۔ ''تم نہیں جانتے کہ یہ کس قسم کا گدھا ہے! بڑا کمبخت ہے یہ گدھا!''

''نہیں، نہیں'' بیمار بچے والی عورت نے کہا ''اپنے گدھے کو ایسا نہ کہو۔ وہ سب سے زیادہ ہوشیار،

انتہائی شریف اور دُنیا میں سب سے قیمتی گدھا ہے۔اس کا جیسا گدھا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ میں تو اپنی ساری زندگی اس کی دیکھ بھال کرنا پسند کروں گی، اس کو بہترین اناج کھانے کو دوں گی، اس پر کام کا بوجھ کبھی نہ ڈالوں گی، اس کو کھرارے سے صاف کروں گی اور دُم میں کنگھا کروں گی۔ کیونکہ اگر یہ لاجواب گدھا، جو گلاب کی سی خوبیاں رکھتا ہے، خندق کے اوپر جست نہ لگاتا اور تُم کو کاٹھی سے نہ اُتار پھینکتا تو ارے مسافر، تم جو ہمارے لئے تاریکی میں سورج بن گئے ہو، ہم کو دیکھے بغیر یہاں سے گذر جاتے اور ہم تم کو روکنے کی جرأت بھی نہ کر سکتے۔''

''ٹھیک ہی کہتی ہے'' بڈھے نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''ہم اپنی نجات کے لئے اِس گدھے کے بہت احسان مند ہیں۔ سچ مچ یہ دُنیا کے لئے باعثِ ناز ہے اور گدھوں کے درمیان ہیروں کی طرح درخشاں۔''

پھر سب نے گدھے کی خوب خوب تعریفیں شروع کر دیں اور اُس کو نان، جوار کے لائے، سوکھی خوبانیاں اور شفتالو کھلانے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ گدھا اپنی دُم کی مورچھل سے پریشان کرنے والی مکھیاں کو اُڑاتا اور سنجیدگی سے اِن لوگوں کے ہدئے قبول کرتا رہا لیکن وہ گھبرا گھبرا کر اُس چابک کو بھی دیکھتا جاتا تھا جو خواجہ نصرالدین چپکے سے اُسے دکھا رہے تھے۔

دن ڈھل چلا تھا، سائے لمبے ہوئے جا رہے تھے۔ لال ٹانگوں والی سارسیں غل مچاتی اور پر پھڑ پھڑاتی اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہی تھیں جہاں اُن کے بچے اپنی حریص، کھلی ہوئی چونچیں اُن کی طرف بڑھا دیتے تھے۔

خواجہ نصرالدین اُن لوگوں سے رُخصت ہوئے، سب نے جھک کر اُن کا شکریہ ادا کیا۔

''ہم آپ کے شکر گذار ہیں، آپ نے ہمارے دُکھ درد کو سمجھا۔''

''کیسے نہ سمجھتا؟'' خواجہ نے جواب دیا ''آج ہی چار دکانیں اور آٹھ کاریگر جو میرے لئے کام کر رہے تھے، ایک مکان جس کی باغ میں فوارے اچھلتے تھے ارگانے والی چڑیاں سونے کے پنجروں میں درختوں سے لٹکی تھیں میرے ہاتھ سے جاتے رہے۔ میں تم لوگوں کی بات کیسے نہ سمجھتا!''

بڈھے نے اپنے پوپلے مُنہ سے کہا ''مسافر میرے پاس تمہارا شکریہ ادا کرنے لئے کچھ نہیں ہے۔ صرف ایک چیز ہے جو میں نے گھر چھوڑتے وقت ساتھ لے لی تھی۔ یہ ہے قرآن پاک۔ لو اِسے لے لو،

یہ دُنیا میں تمہارے لئے مشعلِ ہدایت بنے گا۔''

خواجہ نصر الدین کو مقدس کتابوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر بھی اُنہوں نے اس خیال سے قرآن لے لیا کہ بُڈھے کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے، اُس کو اپنی خورجین میں رکھا اور اچک کر کاٹھی پر پہنچ گئے۔

''آپ کا نام؟ آپ کا نام؟'' سب ایک ساتھ چلائے۔ ''اپنا نام تو بتاتے جائے تا کہ ہم آپ کے لئے دُعا کر سکیں۔''

''تم لوگوں کو میرا نام جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ حقیقی نیکی کے لئے شہرت نہ چاہئے۔ جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو اللہ کے پاس اچھے کاموں کی خبر پہنچانے کے لئے مقدس فرشتوں کی کثیر تعداد ہے۔ اگر یہ فرشتے سست اور لاپرواہ ہیں اور زمین پر نیک و بد اعمال کے شمار کے بجائے نرم بادلوں پر سوتے رہتے ہیں تو آپ کی دعائیں بھی بیگار رہوں گی کیونکہ اللہ معتبر اشخاص کی تصدیق کے بغیر اُن کو نہیں سُنے گا۔''

جب خواجہ بول رہے تھے تو ایک عورت نے گھٹی ہوئی آہ سی بھری۔ یہی دوسری عورت نے بھی کیا۔ پھر بڈھا چونکا اور خواجہ نصر الدین کو گھورنے لگا۔ لیکن خواجہ کو جلدی تھی اور اُنہوں نے کوئی توجہ نہ کی۔

''خدا حافظ! تم امن چین سے رہو اور خوش حال رہو۔''

لوگوں کی دعاؤں کے ساتھ وہ سڑک کے موڑ پر غائب ہو گئے۔

باقی لوگ خاموش کھڑے تھے۔ صرف ایک خیال اُن کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔ اِس خاموشی کو بڈھے نے توڑا۔ اُس نے بڑی سنجیدگی سے متاثر لہجے میں کہا:

''دُنیا میں صرف ایک ہی آدمی یہ کام کر سکتا تھا۔ ہاں، اور دُنیا میں صرف ایک ہی آدمی ایسی باتیں کہہ سکتا تھا اور دُنیا میں صرف ایک ہی آدمی کی روح ایسی ہے جس کی روشنی اور گرمی غریبوں اور مظلوموں کے دلوں کو منور کرتی ہے اور گرمی بخشتی ہے اور یہ آدمی ہیں ہمارے...''

''زبان بند رکھو!'' ایک آدمی نے جلدی سے لقمہ دیا ''کیا تم بھول گئے کہ دیواروں کی آنکھیں ہوتی ہیں اور پتھروں کے کان، ابھی ہزاروں کتے اُن کے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو'' تیسرے آدمی نے کہا ''ہمیں اپنی زبانیں بند رکھنی چاہئیں کیونکہ اس وقت اُن کی حالت ایسی ہے کہ وہ ایک تنے ہوئے رسے پر چل رہے ہیں۔ ذرا سا دھکا بھی اُن کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔''

''چاہے وہ میری زبان کھینچ لیں میں اُن کا نام نہیں بتاؤں گی!'' بیمار بچے والی عورت نے کہا۔

''میں بھی خاموش رہوں گی'' دوسری عورت نے کہا ''مجھے موت آ جائے جو میں بھولے سے بھی اُن کو رسے تک پہنچاؤں۔''

غرض سب نے اِسی طرح کی باتیں کہیں سوائے قد آور لمبی داڑھی والے پتھر کٹے کے جو ذرا زود فہم نہ تھا۔ جو کچھ اُس نے سنا تھا اُس سے نہ سمجھ سکا کہ آخر اِس مسافر کے پیچھے کتے کیوں پڑ جائیں گے۔ وہ نہ تو کوئی قصاب ہے اور نہ قورمہ بیچنے والا۔ پھر اگر مسافر تنے ہوئے رسے پر چلنے والا ہے تو اس کا نام زور سے کیوں نہیں لینا چاہئے۔ اور وہ عورت اپنے محسن کو رسے تک پہنچانے پر مرنے کو کیوں ترجیح دیتی ہے جو ان کے پیشے کے لئے ضروری ہے؟ اب پتھر کٹا بالکل حیران ہو چکا تھا۔ وہ زور سے کھنکھارا، ایک گہری سانس لے کر فیصلہ کیا کہ اس بارے میں بالکل نہ سوچے ورنہ پاگل ہو جائے گا۔

اس دوران میں خواجہ نصر الدین کافی فاصلہ طے کر چکے تھے لیکن اب بھی اُن کی آنکھوں کے سامنے ان غریبوں کے سوکھے ہوئے چہرے پھر رہے تھے۔ ان کو بیمار بچہ برابر یاد آ رہا تھا، اس کے بخار سے تپتے ہوئے رخسار اور خشک ہونٹ۔ اُنہوں نے سفید ریش بڈھے کے بارے میں سوچا جس کو گھر سے نکال دیا گیا تھا اور ان کے دل کی گہراوئیوں سے شدید غصے کا سیلاب اُمڈ پڑا۔

وہ گدھے کی پیٹھ پر نہ بیٹھے رہ سکے اور اس سے کود کر گدھے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ راستے کے پتھروں کو ٹھوکر مار مار کر ہٹاتے جا رہے تھے۔

''ذرا ٹھہر تو سہی، سود خور، ذرا ٹھہر!'' وہ بڑبڑائے اور ان کی کالی آنکھوں میں ایک خطرناک شعلہ لپکا۔ ''میں تمہاری حالت بُری بنا دوں گا۔ اور امیر جہاں تک تیرا تعلق ہے'' وہ بڑبڑاتے گئے'' کانپ کر زرد پڑ جا کیونکہ میں، خواجہ نصر الدین بخارا آ گیا ہوں! میرے بدحال لوگوں کا خون چوسنے والی بدذات اور ہولناک جونکو! اے گندے گیدڑو! تم ہمیشہ تو پروان نہیں چڑھو گے اور نہ لوگ ہی ہمیشہ پریشان حالی میں مبتلا رہیں گے! اور جہاں تک جعفر سود خور تیرا تعلق ہے، میرا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شرمسار رہے اگر میں اُن تمام مصیبتوں کا عوض تجھ سے نہ چکا لوں جو تو غریبوں پر توڑتا ہے۔''

7

خواجہ نصرالدین نے جو دنیا کے بہت سے نرم گرم برداشت کر چکے تھے، اپنے وطن میں پہلا دن بہت بے چینی اور سانحوں سے بھرا ہوا گزارا۔ وہ تھک گئے تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسی الگ تھلگ جگہ مل جائے جہاں آرام کر سکیں۔

''نہیں'' اُنہوں نے ایک تالاب کے گرد لوگوں کا مجمع دیکھ کر ایک آہ بھری۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آج میری قسمت میں آرام نہیں ہے! یہاں کچھ ہو گیا ہے۔''

تالاب سڑک سے تھوڑے فاصلے پر تھا اور خواجہ نصرالدین آسانی سے اُس کو چھوڑ کر آگے جا سکتے تھے لیکن وہ ایسے آدمی نہیں تھے کہ کسی لڑائی جھگڑے اور ہنگامے کے موقع کو ہاتھ سے جانے دیں۔

گدھا بھی جو اُن کے ساتھ مدتوں رہتے رہتے اپنے مالک کے طور طریقوں سے خوب آشنا ہو چکا تھا خود ہی تالاب کی طرف مڑ گیا۔

''کیا معاملہ ہے؟'' گدھے کو مجمع میں گھسیڑتے ہوئے خواجہ نے چلا کر پوچھا ''کیا کسی کا قتل ہو گیا ہے؟ کیا کوئی پٹ گیا ہے؟ راستہ دو، راستہ دو!''

وہ بھیڑ کو چیرتے ہوئے تالاب کے کنارے تک پہنچ گئے جو سبز کائی سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہاں اُنہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کنارے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک آدمی ڈوب رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی کے اوپر آتا اور پھر اندر چلا جاتا اور پانی سے بڑے بلبلے نکلنے لگتے۔

بہت سے آدمی کنارے پر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے تاکہ اس کے کپڑے پکڑ کر کھینچ لیں لیکن ہاتھ اُس تک نہیں پہنچتا تھا۔

''اپنا ہاتھ دو!'' یہ لوگ غل مچا رہے تھے ''ارے، ادھر دو!''

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ڈوبتا ہوا آدمی اُن کی بات نہیں سن رہا ہے اور ہاتھ نہیں بڑھا رہا ہے۔ وہ برابر اوپر آتا تھا اور پھر پانی کے اندر چلا جاتا تھا۔ جب وہ اندر جاتا تو ہلکی لہریں تالاب پر پھیل کر کنارے سے ٹکراتیں۔

''عجیب بات ہے!'' خواجہ نے یہ منظر دیکھ کر سوچا ''بہت ہی عجیب! اس کا سبب کیا ہے؟ وہ اپنا ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتا؟ ممکن ہے کہ وہ کوئی ماہر غوطہ خور ہو اور کوئی شرط بدر کھی ہو لیکن اِس صورت میں وہ قبا

کیوں پہنے ہوئے ہے؟''

وہ طرح طرح کے خیالات میں ڈوب گئے۔اس دوران میں ڈوبتا ہوا آدمی کم سے کر چار مرتبہ تو پانی کے اندر گیا ہوگا اور ہر مرتبہ وہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ دیر پانی میں رہتا۔

''بہت ہی عجیب!'' خواجہ نصرالدین نے اپنے آپ سے کہا اور گدھے سے اُتر پڑے۔''یہیں رُکو'' اُنہوں نے گدھے سے کہا''میں ذرا قریب جا کر دیکھوں۔''

اب ڈوبتا ہوا آدمی پھر نیچے چلا گیا تھا۔اس بار تو وہ اتنی دیر تک پانی کے باہر نہ آیا کہ لوگوں کے اُس کے لئے دجائے مغفرت شروع کر دی۔اچانک وہ اوپر آیا۔

''ادھر، ادھر!'' لوگ چلائے''اپنا ہاتھ ہمیں دو'' اور اُنہوں نے اپنے ہاتھ اُس کی طرف بڑھائے لیکن اُس نے صرف ان لوگوں کی طرف خالی خالی نگاہوں سے دیکھا اور خاموش اور سکون سے پھر نیچے بیٹھ گیا۔

''ارے احمقو!'' خواجہ نصرالدین نے کہا''یقیناً تم اس کی قیمتی قبا اور ریشمی عمامے سے دیکھ سکتے ہو کہ یہ آدمی یا تو کوئی ملا ہے یا امیر عہدیدار؟ اور کیا تم کو ملاؤں اور عمائدین کے طریقے نہیں معلوم ہیں کہ اُن کو پانی سے کس طرح گھسیٹا جائے؟''

''تم خود گھسیٹ لو نا اور اگر طریقہ جانتے ہو تو بچالو'' مجمع میں شور ہوا''جاؤ، بچاؤ! وہ پھر اوپر آ گیا ہے!''

''ٹھہرو'' خواجہ نصرالدین نے کہا''میں نے ابھی اپنی تقریر نہیں ختم کی ہے۔میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم نے کبھی کسی ملا یا امیر عہدے دار کو کسی کو کچھ دیتے دیکھا ہے؟ تو اے جاہلو یاد رکھو کہ ملا اور عمائدین کسی کو کبھی کچھ نہیں دیتے، وہ صرف لیتے ہیں۔اس لئے ان کو ذرا ترکیب سے بچانا چاہئے، یعنی اُن کی مزاجی خصوصیات کے لحاظ سے۔اب ذرا دیکھنا مجھے۔''

''لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے!'' مجمع سے آوازیں آئیں''اب وہ اوپر نہیں آئے گا۔''

''کیا تمہارے خیال میں پانی کی دیویاں کسی ملا یا بڑے افسر کو اتنی آسانی سے قبول کر لیں گی؟ نہیں تم غلطی پر ہو۔پانی کی دیویاں اس سے نجات پانے کی پوری کوشش کریں گی۔''

خواجہ نصرالدین زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے اور اطمینان سے انتظار کرنے لگے۔وہ تہہ سے بلبلوں کو

اوپر آتے اور کنارے تک تیرتے دیکھ رہے تھے جن کو ہلکی ہوا اس طرف ڈھکیل رہی تھی۔

آخر کار وہ سیاہ شکل آہستہ آہستہ گہرائیوں سے ابھری۔ ڈوبتا آدمی سطح پر دکھائی دیا۔ اگر خواجہ نصرالدین نہ ہوتے تو وہ آخری بار اوپر آیا ہوتا۔

''ارے، یہ لو!'' خواجہ نصرالدین ہاتھ بڑھا کر چلائے ''یہ لو!''

ڈوبتے ہوئے آدمی نے انتہائی بدحواسی میں ہاتھ کو مضبوط پکڑ لیا۔ خواجہ نصرالدین کا اس کی مضبوط گرفت کی وجہ سے منہ بگڑ گیا۔

بچائے ہوئے آدمی سے انگلیاں چھڑانے میں کافی وقت لگ گیا۔

تھوڑی دیر تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ وہ سیوار اور بدبودار کائی سے ڈھکا ہوا تھا جس سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ پھر اس کے منہ، ناک اور کانوں سے پانی نکلنے لگا۔

''میرا بٹوہ! میرا بٹوہ کہاں ہے؟'' وہ کراہ رہا تھا اور اُس وقت تک اُسے چین نہ آیا جب تک بٹوا اُس کے پاس نہ پہنچ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس نے گھاس پھوس جھاڑی اور اپنی قبا کے دامن سے چہرہ صاف کیا۔ خواجہ پیچھے ہٹ گئے۔ چپٹی ٹوٹی ناک، چوڑے چاڑے نتھنوں اور پھیلی والی آنکھ نے اُس کا چہرہ خوفناک بنا دیا تھا۔ آدمی کبڑا بھی تھا۔

''کس نے مجھے بچایا ہے؟'' اُس نے اپنی ایک آنکھ سے چاروں طرف مجمع پر نظر ڈالتے ہوئے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ رہے!'' مجمع نے غل مچایا اور خواجہ نصرالدین کو آگے بڑھا دیا۔

ادھر آؤ، میں تم کو انعام دینا چاہتا ہوں'' آدمی نے اپنے پانی سے بھرے ہوئے بٹوے میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر چاندی کے سکے نکالے'' حالانکہ یہ کوئی بہت ہی لاجواب یا غیر معمولی بات نہیں ہے کہ تم نے مجھ کو نکال لیا۔۔ میں خود ہی نکل آتا'' اس نے ناشکرے بن کر اضافہ کیا۔

جب وہ بات کر رہا تھا تو معلوم نہیں کمزوری یا کسی دوسرے سبب سے اُس کی مٹھی آہستہ سے کھلی اور سکے اُس کی انگلیوں سے پھسل کر ہلکی جھن جھناہٹ کے ساتھ بٹوے میں پھر جا رہے۔ صرف ایک سکہ اس کے ہاتھ میں بچ رہا، نصف تانگے کا۔ ایک آہِ سرد بھرتے ہوئے اس نے یہ سکہ خواجہ نصرالدین کی طرف بڑھایا۔

''یہ لو اور بازار جا کر اپنے لئے ایک قاب پلاؤ خرید لینا۔''

''یہ تو ایک قاب پلاؤ خریدنے کے لئے کافی نہیں ہے'' خواجہ نصرالدین نے کہا۔

''اچھا، کوئی بات نہیں، بلا گوشت کے سادے چاول ہی سہی۔''

''دیکھتے ہونا'' خواجہ نصرالدین نے پاس کھڑے لوگوں کو مخاطب کیا ''میں نے تو اس کی فطرت کے مطابق ترکیب سے اس کی جان بچائی۔''

پھر وہ اپنے گدھے کے پاس چلے گئے۔

راستے میں ان کو ایک لمبے، چھریرے اور مضبوط بازوؤں والے آدمی نے روکا، اس کا چہرہ روکھا تھا۔ اس کے بازو کالک اور کوئلے سے سیاہ ہو رہے تھے اور اس کے پٹکے میں لوہار کی سنسی لگی ہوئی تھی۔

''کیا ہے، بھئی لوہار؟'' خواجہ نصرالدین نے پوچھا۔

''دیکھو'' لوہار نے ان کو ناراضگی کے ساتھ اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا ''تمہیں معلوم ہے کہ تم نے کس کو بچایا ہے؟ اور وہ بھی آخری وقت، جب اس کو کوئی نہیں بچا سکتا تھا؟ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے اس فعل کی وجہ سے کتنے آنسو بہیں گے؟ پتا ہے کہ کتنے آدمی اپنے گھر بار، کھیتوں اور انگور کے باغیچوں سے محروم ہو جائیں گے، یا غلاموں کے بازار پہنچ جائیں گے اور وہاں سے پا بہ زنجیر خیوا کی شاہراہ پر نظر آئیں گے!''

خواجہ نصرالدین حیرت سے اُس کا منہ تک رہے تھے۔ انہوں نے کہا ''بھائی لوہار! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا کوئی انسان کہلانے کا مستحق اور مسلمان ڈوبتے ہوئے آدمی کے پاس گزر جائے اور اس کی مدد کے لئے ہاتھ نہ بڑھائے گا؟''

''تو تمہارا خیال ہے کہ آدمی کو تمام زہریلے سانپ، بچھو اور بھیڑیوں کو بچانا چاہئے؟'' لوہار نے زور سے کہا۔ پھر اس کو کچھ خیال آیا اور اس نے کہا ''کیا تم یہاں کے رہنے والے ہو؟''

''نہیں، میں دور دراز سے آیا ہوں۔''

''تو پھر تم نہیں جانتے کہ جس آدمی کی جان تم نے بچائی ہے، وہ بہت بدذات اور خون چوسنے والا ہے اور بخارا کا ہر تیسرا آدمی اس کی وجہ سے نالاں و گریاں ہے!''

خواجہ نصرالدین کے دماغ میں ایک ہولناک خیال چمک اٹھا۔

''لوہار!'' وہ یہ ڈرتے ہوئے رک گئے کہ کہیں ان کا خیال صحیح نہ ثابت ہوا''اس آدمی کا نام مجھے بتاؤ۔''

''تم نے جعفر سودخور کو بچایا ہے، خدا اس کی زندگی اور عاقبت دونوں خراب کرے! خدا کرے اس کی چودہ نسلوں تک کے سڑے زخم ہوں!''لوہار نے جواب میں کہا۔

''کیا کہا؟'' خواجہ نصرالدین چلائے''تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہائے افسوس، افسوس! کیسی شرمناک بات میں نے کی! کیا میرے ہاتھوں نے اس سانپ کو پانی سے نکالا؟ سچ مچ اس گناہ کا کوئی ازالہ نہیں ہو سکتا! افسوس، شرم کی بات ہے!''

اس کی ندامت سے لوہار متاثر ہو کر ذرا نرم پڑا۔

''مسافر چپ کرو، اب کیا ہو سکتا ہے۔ تم اس وقت تالاب تک کیوں پہنچے۔ تمہارا گدھا سڑک ہی پر اڑ کر کیوں نہیں رک گیا؟ سودخور کو ڈوبنے کا وقت مل جاتا۔''

''یہ گدھا!'' خواجہ نصرالدین نے کہا''اگر یہ سڑک پر رکتا ہے تو صرف مرے خورجینیں خالی کرانے کے لئے کیونکہ اگر وہ بھری ہوتی ہیں تو اس کے لئے بھاری ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب میرے بدنامی کا سوال ہوتا ہے، سودخور کو بچنے کا، تو یقین کرو کہ یہ گدھا ضرور مجھے وقت پر وہاں پہنچائے گا!''

''ہاں'' لوہار نے اتفاق کیا''لیکن جو کچھ ہوا وہ واپس نہیں لیا جا سکتا۔ سودخور کو اب تالاب میں واپس نہیں دھکیلا جا سکتا۔''

خواجہ نصرالدین چونک پڑے۔

''مجھ سے ایک برا کام ہو گیا ہے لیکن میں اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کروں گا! سنو! بھائی لوہار، میں قسم کھاتا ہوں کہ جعفر سودخور کو میں ڈبوؤں گا۔ میں اپنے والد کی ریشِ مبارک کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ ہاں، میں اس کو اسی تالاب میں ڈبوؤں گا! لوہار! میری قسم یاد رکھنا۔ کیونکہ میں فضول بات نہیں کرتا۔ سودخور ڈوبے گا! اور جب تم اس بارے میں بازار سے سننا تو یہ سمجھ لینا کہ میں نے بخارا شریف کے شہریوں کے سامنے اپنے جرم کا خمیازہ پورا کر دیا ہے!''

8

جب خواجہ نصرالدین بازار پہنچے تو شفق کی روشنی ٹھنڈے اور خوشبودار دھند کی طرح شہر پر چھاتی جا رہی تھی۔

چائے خانوں میں خوشگوار الاؤ جلنے لگے تھے اور جلد ہی پورے بازار کو روشنیوں نے اپنے آغوش میں لے لیا۔کل ایک بڑا بازار ہونے والا تھا۔اونٹوں کے کارواں جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔جب کوئی کارواں اندھیرے میں غائب ہو جاتا تو اس کی سریلی، صاف اور اداس گھنٹیوں کی آواز بڑی دیت تک ہوا میں گونجتی رہتی اور جب دور یہ آواز غائب ہو جاتی تو دوسرا کارواں چوراہے پر آ جاتا اور اس کی گھنٹیاں بجنے اور اداس گیت سنانے لگتیں۔ یہ اس طرح جاری تھا جیسے رات خود دنیا کے کونے کونے سے لائی ہوئی آوازوں سے بھر گئی ہو اور آہستہ آہستہ گنگناتی، تھرتھراتی اور کراہتی ہو۔ ہندستان، ایران، عرب، افغانستان اور مصر کی ان دیکھی گھنٹیاں گونج رہی تھیں۔خواجہ نصرالدین ان کے نغمے سن رہے تھے اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ ان کو تا ابد سن سکتے ہیں۔قریب ایک چائے خانے میں طنبورہ بج رہا تھا اور اس کا ساتھ دو رارے کے تار دے رہے تھے۔کسی ان دیکھے گائک نے اپنی صاف آواز ستاروں تک پہنچا دی تھی۔وہ اپنی محبوبہ کے بارے میں گا کر اس کا شکوہ کر رہا تھا۔

اس پُرنغمہ فضا میں خواجہ نصرالدین رات پھر ٹھہرنے کی جوہ تلاش کر رہے تھے۔

''میرے پاس اپنے اور گدھے کے لئے آدھا تانگا ہے'' اُنہوں نے ایک چائے خانے کے مالک سے کہا۔

''آدھے تانگے میں تم رات تو یہاں گزار سکتے ہو'' مالک نے کہا ''لیکن کمبل نہیں ملے گا۔''

''اور میں اپنا گدھا کہاں باندھوں؟''

مجھے گدھے سے کیا مطلب؟''

چائے خانے کے قریب کوئی باندھنے کی جگہ نہ تھی۔خواجہ نصرالدین نے دیکھا کہ برساتی کے نیچے ایک آنکڑا نکلا ہوا ہے اور یہ بغیر دیکھے کہ آنکڑا کس چیز میں لگا ہے اُنہوں نے اپنا گدھا اس میں باندھ دیا۔ چائے خانے کے اندر پہنچتے ہی وہ دراز ہو گئے کیونکہ تھک کر چور ہو چکے تھے۔

قریب ہی کچھ آدمی جو بازار آئے تھے ایک چھوٹے سے حلقے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ان

میں ایک سارباں تھا، ایک گلہ بان اور دو کاریگر۔ ان میں ایک مدھم آواز میں کہہ رہا تھا:

''خواجہ نصرالدین سے یہ بھی موسوم ہے۔ ایک دن وہ بغداد میں بازار سے گذر رہے تھے کہ انہوں نے ایک باورچی خانے میں غل غپاڑہ سنا۔ جانتے ہی ہو کہ ہمارے خواجہ نصرالدین کتنے کھوجی آدمی ہیں وہ اندر پہنچ گئے۔ وہاں اُنہوں نے دیکھا کہ موٹا، لال چہرے والا باورچی خانے کا مالک ایک فقیر کی گدی میں ہاتھ دے کر اُسے ھلا رہا تھا۔

''یہ ہنگامہ کیوں ہے؟'' ہمارے خواجہ نصرالدین نے پوچھا ''تم کیوں جھگڑ رہے ہو''

''یہ بدمعاش، کمینہ، چور، اس کی آنتیں سڑیں، مالک نے چیخ کر کہا، میرے باورچی خانے آیا، اپنی بغل سے نان کا ایک ٹکڑا نکالا اور بڑی دیر تک اس کو انگیٹھی کے اوپر سینکتا رہا یہاں تک کہ نان میں بوٹی کے کبابوں کی خوش بو آ گئی اور وہ زیادہ نرم اور مزیدار ہو گئی۔ پھر یہ روٹی چٹ کر گیا۔ اور اب، اس کے دانت گریں کھال پھٹ جائے، پیسے نہیں دیتا ہے!''

''یہ سچ ہے؟'' خواجہ نصرالدین نے درشتی سے پوچھا۔ فقیر اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی اور اس نے صرف سر ہلایا۔ ''جانتے ہو، یہ غلط بات ہے، خواجہ نصرالدین نے کہا'' یہ غلط بات ہے کہ کسی کی ملکیت مفت استعمال کی جائے۔''

''سن رہا ہے نا، یہ معزز اور لائق صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟'' باورچی خانے کے مالک نے خوش ہو کر کہا۔

''تمہارے پاس پیسے ہیں؟، خواجہ نصرالدین نے فقیر سے پوچھا۔ فقیر نے اپنا ایک ایک پیسہ نکال کر خواجہ نصرالدین کے حوالے کر دیا۔ باورچی خانے کے مالک نے اپنا چکنا ہاتھ پیسے لینے کے لئے بڑھا دیا۔

''حضرت، ذرا رُکئے، خواجہ نصرالدین بولے' پہلے ذرا اپنا کان ادھر لائیے۔''

''اور کافی دیر تک وہ سکوں کو مٹھی میں لئے مالک کے کان میں بجاتے رہے۔ پھر انہوں نے فقیر کو پیسے واپس دیتے ہوئے کہا' اطمینان سے جاؤ، سائیں جی!'

''کیا!'' باورچی خانے کا مالک چلایا ''لیکن مجھے تو پیسے ملے نہیں''

''اس نے تم کو پورے پیسے دئے ہیں'' خواجہ نصرالدین نے کہا ''اب تم دونوں برابر ہو، اس نے

تمہارے بوٹی کے کباب سونگھے اور تم نے اس کے سکوں کی جھنکار سنی''

سب سننے والے ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ان میں سے ایک آدمی نے جلدی سے سب کو روک کر کہا''اتنے زور سے نہیں ورنہ وہ سمجھ جائیں گے کہ ہم خواجہ نصرالدین کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں''

''ان کو کیسے پتا ہے؟'' خواجہ نصرالدین نے مسکراتے ہوئے سوچا''دراصل یہ بغداد کا نہیں بلکہ استنبول کا واقعہ ہے، پھر ان کو کیسے معلوم ہوا؟''

پھر دوسرے آدمی نے، جو غلہ بان کے لباس میں تھا اور رنگین پگڑی باندھے تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بدخشان کا رہنے والا ہے، اپنا قصہ مدھم آواز میں شروع کیا۔

''کہا جاتا ہے کہ ایک دن خواجہ نصرالدین ایک ملا کی باڑی کے پاس سے گزر رہے تھے۔ملا کچھ کدو ایک بورے میں بھر رہا تھا۔لالچ میں آ کر اُس نے بورے میں اتنے کدو بھر لئے تھے کہ بورے کو لے جانا تو الگ رہا اس کو اُٹھانا ہی ممکن نہ تھا۔وہ ادھر اُدھر تک رہا تھا کہ بورا گھر کیسے پہنچے۔اس نے ایک راہ گیر کو دیکھا اور بہت خوش ہوا۔''

''سنو بیٹے، کیا تم یہ بورا میرے گھر تک پہنچا دو گے؟،

''اس وقت خواجہ نصرالدین کے پاس پیسے نہیں تھے، اُنہوں نے ملاّ سے پوچھا،'تم مجھے کیا دو گے؟'

''بیٹا پیسے کیوں مانگتے ہو؟ بورا لے جاتے ہوئے راستے میں مَیں تم کو تین انتہائی حکیمانہ قول بتاؤں گا جن سے تمہیں زندگی میں مسرت نصیب ہوگی''

''میں یہ قول ضرور سنوں گا'' خواجہ نصرالدین نے سوچا۔ان کو بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا۔وہ بورے کو کاندھے پر لاد کر چل پڑے۔راستہ پہاڑی پر تھا اور ڈھلوان کے پاس۔خواجہ نصرالدین دم لینے کے لئے رکے۔مُلاّ نے بہت سنجیدہ اور پراسرار انداز میں کہا:''اچھا، پہلا قول سنو کیونکہ آدم کے زمانے سے اب تک اس سے بڑا حکیمانہ قول ساری دنیا میں نہیں ہوا ہے۔اگر تم اس کے معنی کی گہرائیوں تک پہنچ گئے تو سمجھو کہ گویا'الف لم' کی رمز سے آگاہ ہو گئے جس سے ہمارے پیغمبر وہ ہادی حضرت محمد نے قرآنِ شریف کے دوسرے سورے شریف کی ابتدا کی ہے۔غور سے سنو! اگر تم سے کوئی یہ کہے کہ سواری پر چلنے سے پیدل چلنا بہتر ہے تو اس کی بات مت مانو۔بیٹے میرے الفاظ نہ بھولنا اور برابر دن رات ان پر غور کرنا اور تب تُم اس کی دانشمندی کی گہرائیوں تک پہنچ سکو گے۔لیکن یہ قول تو دوسرے کے مقابلے میں تو کچھ بھی نہیں ہے

جو میں تمہیں اس درخت کے قریب بتاؤں گا۔' دیکھو وہ رہا آگے۔'

''ذرا ٹھہرو تو، ملاّ صاحب، خواجہ نصرالدین نے سوچا اور پسینے سے شرابور وہ بورے کو درخت تک لے گئے۔''

''ملا نے ایک انگلی اٹھا کر کہا: 'دوسرا قول سنو کیونکہ اس کا انحصار پورے قرآن، نصف شریعت اور ایک چوتھائی طریقت پر ہے۔ جو آدمی اس کو سمجھ لے گا وہ نیکی اور سچائی کے راستے سے کبھی نہیں ہٹے گا۔ اس لئے بیٹے، اس قول کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہو کہ یہ تمہیں مفت حاصل ہو رہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ غریب کی زندگی امیر سے آسان ہے تو مت یقین کرو۔ لیکن یہ دوسرا قول تو تیسرے کے پاسنگ نہیں، تیسرا قول ایسا منور ہے کہ اس کا مقابلہ بس سورج کی چکا چوند کر دینے والی روشنی اور بحرِ ذخار کی گہرائی سے ہی کیا جاتا ہے۔ میں یہ قول تم کو اپنے گھر کے پھاٹک پر بتاؤں گا۔ آؤ جلدی کریں، کیونکہ اب میں دم لے چکا ہوں۔''

''مولانا ذرا ٹھہرئے!' خواجہ نصرالدین نے کہا۔ 'میں آپ کا تیسرا قول بوجھ گیا۔ آپ اپنے گھر پھاک پر مجھ سے کہیں گے کہ ہوشیار آدمی ہمیشہ بیوقوف آدمی سے اپنے کدو بھرے بورے مفت ڈھلوا لیتا ہے۔'

''ملا حیرت سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ خواجہ نصرالدین نے ٹھیک کہا تھا۔

'''اب ملا صاحب میرا واحد قول سنئے جو آپ کے تمام قولوں کے برابر ہے، خواجہ نصرالدین نے اپنی بات جاری رکھی' اور قوم ہے پیغمبر صاحب کی کہ میرا قول ایسا چکا چوند پیدا کرنے والا اور گہرا ہے کہ اس کا انحصار سارے اسلام، قرآن، شریعت اور طریقت اور بہت سی کتابوں پر ہے، بودھ، عیسائی اور یہودی مذاہب کی کتابوں پر بھی۔ ملا صاحب، سچے مذہب کی مجھے تعلیم و تربیت دینے والے بزرگ، اب میں آپ کے سامنے ایسے ناقابل تردید دانش مندانہ قول کا انکشاف کروں گا جس سے بہتر نہ تو پہلے کبھی تھا اور نہ آئندہ ہوگا۔ لیکن ذرا اس کے لئے پہلے سے تیاری کر لیجئے تاکہ آپ بے قابو نہ ہو جائیں کیونکہ اس سے آدمی آسانی سے پاگل بن سکتا ہے۔ یہ قول ایسا ہی متحیر کن، عجیب اور اتھاہ ہے۔ ملا صاحب، اپنے دماغ کو فولاد بنا کر اس کو سنئے۔ اگر کوئی آپ سے کہے کہ یہ کدو ٹوٹے نہیں ہیں تو اس کے منہ پر تھوک دیجئے، اس کو جھوٹا کہہ کر اپنے گھر سے نکال دیجئے!'

''یہ کہہ کر خواجہ نصرالدین نے بورا اُٹھایا اور اس کو ڈھلوان سے نیچے چھوڑ دیا۔ کدو بورے سے لنڈھک کر باہر آ گئے اور پتھروں سے ٹکراتے، اچکتے اور کھڑکھڑاتے نیچے چلے گئے۔

''ارے ہائے، ہائے، ملا فریاد کرنے لگا' کیسا نقصان ہوا، تباہ ہو گیا!، پاگلوں کی طرح چیخنے، گریہ زاری کرنے اور اپنا چہرہ نوچنے لگا۔

''دیکھئے نا، خواجہ نصرالدین نے کہا' میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرا قول ممکن ہے آپ کو پاگل بنا دے!''

سننے والوں میں پھر قہقہہ گونجا۔

کونے میں گرد آلود، جوئیں بھری چٹائی پر لیٹے لیٹے خواجہ نصرالدین نے سوچا:

''اچھا تو انہوں نے یہ بھی سُن رکھا ہے! لیکن کیسے؟ راستے پر تو بس ہم دونوں تھے۔ ملا اور میں اور میں نے کسی سے بھی نہیں کہا۔ شاید جب ملا کو یہ پتا چلا ہو گا کہ کون اس کے کدو لے جا رہا تھا تو اس نے لوگوں کو کہا ہو گا۔''

اب تیسرے نے اپنا قصہ شروع کر دیا:

''ایک دن خواجہ نصرالدین شہر سے اس ترکی کے گاؤں لوٹ رہے تھے جہاں وہ رہنے لگے تھے۔ وہ تھک کر ایک چشمے کے کنارے لیٹ گئے اور پانی کی قلقل کی آواز اور بہار کی مہک دار ہوا میں بلا ارادہ سو گئے۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ مر گئے ہیں۔ ''اگر میں مر گیا ہوں، اُنہوں نے فیصلہ کیا' تو نہ تو مجھے حرکت کرنی چاہئے اور نہ آنکھیں کھولنی چاہئیں۔' اس لئے وہ بالکل ساکت نرم گھاس پر پڑے رہے اور انہیں محسوس ہوا کہ مردہ ہونا کوئی بری بات نہیں کیونکہ اس طرح فانی دنیا کے وجود کی تمام فکروں اور جھگڑوں سے جو متواتر پریشان کرتی رہتی ہیں آزاد ہو کر اطمینان سے لیٹا جا سکتا ہے۔

''کچھ مسافروں نے جو ادھر سے گزر رہے تھے، خواجہ نصرالدین کو دیکھا۔

'''دیکھو!' ایک نے کہا' مسلمان ہے۔'

'''مر گیا ہے، دوسرا بولا۔

''ہمیں اسے قریب ترین گاؤں لے چلنا چاہئے، تیسرے نے کہا۔

''یہ وہی گاؤں تھا جہاں خواجہ نصرالدین جا رہے تھے۔

''آدمیوں نے کئی شاخیں کاٹ کر ایک اسٹریچر سا بنالیا اور اس پر خواجہ نصرالدین کو لٹا دیا۔ وہ ان کو لے کر بہت دیت تک چلتے رہے اور خواجہ صاحب آنکھیں بند کئے ایسے مردے کی طرح پڑے رہے جس کی روح جنت کے دروازے تک پہنچ چکی ہو۔

''اچانک اسٹریچر رک گیا۔ راہی ایک دریا پار کرنے کے بارے میں بحث کرنے لگے۔ ایک نے تجویز کی کہ دائیں طرف جانا چاہئے، دوسرے نے کہا بائیں اور تیسرے نے کہا کہ سیدھے دریا پار۔ خواجہ نصرالدین نے ذرا سی آنکھیں کھول کر جھانکا اور دیکھا کہ یہ لوگ دریا کے سب سے گہرے، انتہائی تیز بہاؤ والے اور بہت ہی خطرناک حصے کے پاس کھڑے ہیں جہاں بہت سے لاپروا لوگ ڈوب چکے تھے۔

''' مجھے اپنے پر وا نہیں، خواجہ نصرالدین نے سوچا' کیونکہ میں تو مر چکا ہوں اور اب میں چاہے قبر میں لیٹوں یا دریا کی تہہ میں، کوئی بات نہیں۔ لیکن ان مسافروں کو ضرور آگاہ کر دینا چاہئے کیونکہ وہ میرے اوپر مہربان ہونے کی وجہ سے اپنی جان گنوا سکتے ہیں۔ ان کو آگاہ نہ کرنا میرے لئے بڑی ناشکری کی بات ہوگی۔''

''وہ اسٹریچر پر ذرا اُبھرے اور ندی کی طرف اشارہ کر کے دھیمی آواز میں بولے ''مسافرو، جب میں زندہ تھا تو میں دریا کو حور کے ان درختوں کے پاس پار کرتا تھا۔، یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ مسافروں نے خواجہ نصرالدین کا شکریہ ادا کیا اور بخشائش کے لئے دعائیں کرتے ان کے اسٹریچر کو لے کر پھر آگے بڑھ گئے۔''

جب سننے والے اور کہانی سنانے والا ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے، خواجہ نصرالدین ناراض ہو کر بڑبڑا رہے تھے:

''ان لوگوں نے سب گڈ مڈ کر دیا ہے۔ اول تو میں نے یہ خواب کبھی نہیں دیکھا کہ میں مر گیا ہوں۔ میں اتنا احمق نہ ہوں کہ میں یہ نہ سمجھ سکوں کہ مردہ ہوں یا زندہ۔ ارے، مجھے یہ تک یاد ہے کہ ایک پسو مجھے کاٹ رہا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میں کھجلا سکتا۔ یقیناً یہ اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ میں زندہ تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے پسو کے کاٹنے کا احساس نہ ہوتا۔ بات صرف یہ تھی کہ میں بہت تھک گیا تھا اور چلنا نہیں چاہتا تھا۔ مسافر مضبوط تھے اور ان کے لئے یہ کوئی بات نہ تھی کہ وہ ذرا اپنے راستے سے ہٹ کر مجھے گاؤں تک پہنچا دیں۔ لیکن جب اُنہوں نے دریان کو ایسی جگہ پار کرنا چاہا جہاں تین آدمیوں کے ڈباؤ

بھر پانی تھا تو میں نے ان کو روک دیا۔ مجھے تو ان کے خاندانوں کا خیال تھا اپنے خاندان کا نہیں کیونکہ میرا خاندان تو ہے ہی نہیں۔ اور مجھے فوراً ناشکری کا تلخ پھل چکھنا پڑا کیونکہ مجھے بروقت انتباہ پر شکر گزار ہونے کے بجائے مجھے مسافروں نے اسٹریچر سے نکال پھینکا اور مکوں سے میری خاطر کی۔ وہ میری خوب مرمت کرتے اگر میرے تیز رفتار پیروں نے میری مدد نہ کی ہوتی۔ واقعی، عجیب بات ہے، لوگ سچ کو کیسا توڑ موڑ لیتے ہیں!''

اس دوران میں چوتھے آدمی نے اپنا قصہ چھیڑ دیا:

''خواجہ نصرالدین کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک بار وہ تقریباً چھ مہینے تک ایک گاؤں میں رہے جہاں وہ اپنی ذہانت اور حاضر جوابی کی وجہ سے کافی مشہور ہو گئے تھے...''

خواجہ نصرالدین کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے یہ آواز کہاں سنی تھی___ بہت بلند نہیں لیکن صاف اور ذرا بھاری اور حال ہی میں... شاید آج ہی... اُنہوں نے بہت کوشش کی لیکن یاد نہ آیا___ اس آدمی نے اپنی داستان جاری رکھی:

''ایک دن صوبے کے گورنر نے اس گاؤں کو اپنا ہاتھی بھیج دیا جہاں خواجہ نصرالدین رہتے تھے۔ گاؤں کو ہاتھی کی خوراک مہیا کرنی اور اس کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ ہاتھی بڑا کھاؤ تھا۔ چوبیس گھنٹے میں اس نے پچاس دھرے جَو، پچاس دھرے باجرہ، پچاس دھرے مکئی اور ایک سو گٹھے گھاس ہڑپ کر لی۔ دو ہفتے میں گاؤں والوں کا سارا ذخیرہ ہاتھی کے نذر ہو گیا۔ وہ بالکل تباہ اور سخت پریشان ہو گئے۔ آخر کار اُنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خواجہ نصرالدین کو گورنر کے پاس یہ التجا لے کر بھیجیں گے کہ اپنا ہاتھی واپس بلا لے۔

اب اُنہوں نے خواجہ نصرالدین سے درخواست کی اور وہ اس پر تیار ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنے گدھے پر کاٹھی کسی، جس کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ ضدی، بدمزاج اور کاہل ہونے میں وہ گیدڑ، مکڑی، سانپ اور مینڈک کا مجموعہ ہے۔ کاٹھی کس کر خواجہ نصرالدین گورنر سے ملنے چل دئے لیکن جانے سے پہلے وہ گاؤں والوں سے یہ طے کرنا نہیں بھولے کہ ان کی خدمات کا معاوضہ کیا ہوگا۔ دراصل اُنہوں نے اتنی بڑی رقم لی کہ بہتوں کو اپنا گھر بار بیچنا پڑا اور خواجہ نصرالدین کی وجہ سے وہ محتاج ہو گئے۔''

''ہونہہ'' اُس کونے سے آواز آئی جہاں خواجہ نصرالدین نمدے پر پڑے اپنے غصے کر ضبط کرنے کے لئے کروٹیں بدل رہے تھے۔

آدمی نے داستان جاری رکھی:

''تو خواجہ نصرالدین محل پہنچے۔ وہ بڑی دیر تک خدمت گاروں اور ملازموں کے جمگھٹے میں کھڑے رہے جو اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ حضور گورنر صاحب ان پر بھی وہ نگاہ ڈالیں جو کسی کے لئے مسرتیں اور کسی کے لئے تباہی لاتی تھی۔ اور جب گورنر نے خواجہ نصرالدین کی طرف رخ کرنے کی عنائت فرمائی تو خواجہ نصرالدین اُن کی شان و شوکت دیکھ کر کانپنے لگے اور ان کی رگوں میں خون جم سا گیا۔ وہ پسینے میں بالکل شرابور ہو گئے اور رنگ سفید پڑ گیا۔''

''ہونہہ'' پھر کونے سے آواز آئی لیکن داستان گو نے اس کی پرواہ کئے بغیر بات جاری رکھی:

''تم کیا چاہتے ہو؟' گورنر نے اپنی بلند اور گونجدار آواز میں جس میں شیر کی گرج تھی پوچھا۔ ڈر کی وجہ سے خواجہ نصرالدین کی زبان بند ہو گئی۔ لکڑ بگھے جیسی گھگھیائی ہوئی آواز سے انہوں نے کہا 'حضور عالی' ہمارے صوبے کو منور کرنے والے سورج اور چاند، ہمارے صوبے کے تمام باشندوں کو خوشیاں اور مسرتیں بخشنے والے، اپنے اس ادنیٰ خادم کی، جو آپ کے محل کی چوکھٹ پر اپنی داڑھی سے جھاڑو دینے کے قابل بھی نہیں ہے، ایک بات سنئے۔ اے آفتابِ تاباں! ہمیں آپ نے یہ عزت بخشی ہے کہ اپنا ایک ہاتھی ہمارے گاؤں کھلانے پلانے اور دیکھ بھال کے لئے بھیج دیا ہے۔ اس لئے ہم لوگ ذرا پریشان ہیں...''

''گورنر نے غصے سے ناک بھوں چڑھائی۔ خواجہ نصرالدین اُس کے سامنے اس طرح جھک گئے جیسے آندھی سے سرکنڈا جھک جاتا ہے،

''تجھے کیا پریشانی ہے؟' گورنر نے پوچھا۔ 'بول، یا تیرے گندے اور ذلیل تالو میں زبان چپک گئی ہے؟''

''' آ، آ، آپ، ڈرپوک خواجہ نصرالدین ہکلا رہے تھے، 'ہم لوگ پریشان ہیں، اے آفتابِ تاباں، کہ ہاتھی تنہائی محسوس کر رہا ہے۔ بے چارہ بہت رنجیدہ ہے اور سارا گاؤں بھی اس کو غمگین دیکھ کر ملول ہو گیا ہے۔ اے اشرف الاشرافین، زینتِ ارض اسی لئے میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ ہمارے اوپر مزید عنایت کریں اور ایک ہتھنی بھی بھیج دیں۔،

''گورنر اس درخواست سے بہت خوش ہوا اور فوراً اس کی تکمیل کا حکم دیا۔ اپنی مسرت کے اظہار کے لئے اس نے خواجہ نصرالدین کو اپنے جوتے کا بوسہ لینے کی اجازت دی جس کو خواجہ نصرالدین نے اتنے

جوش وخروش کے ساتھ کیا کہ گورنر کے جوتے کی پالش اُڑ گئی اور خواجہ نصر الدین کے ہونٹ کالے ہو گئے...''

یہاں داستان گو کو خود خواجہ نصر الدین کی گرجتی ہوئی آواز نے روک دیا۔

''جھوٹا کہیں گا!'' خواجہ نصر الدین چلائے۔''گندے، خار شئے کتے، تیرے ہونٹ، تیری زبان اور اندر سے سارا بدن برسرِ اقتدار لوگوں کے جوتے چاٹتے چاٹتے سیاہ ہو گئے ہیں۔خواجہ نصر الدین نے کبھی اور کسی جگہ حاکموں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔تو خواجہ نصر الدین کو بدنام کرتا ہے۔مسلمانوں، اس کی بات مت سنو! اس کو نکال دو!''

وہ اس افترا پرداز سے نپٹنے کے لئے لپکے لیکن چپٹے، چیچک بھرے چہرے اور زرد تھرکنے والی آنکھوں کو پہچان کر اچانک رک گئے۔ یہ تو وہی نوکر تھا جس نے گلی میں ان سے جنت کے پل پر کٹہروں کی لمبائی کے بارے میں تکرار کی تھی۔

''اھا!'' خواجہ نصر الدین نے زور سے کہا۔''پہچان گیا تجھ کو اپنے مالک کے زرخرید اور خیر خواہ خادم! اور اب یہ بھی جان گیا کہ تیرے ایک اور مالک بھی ہے جس کا نام تو نے چھپا رکھا ہے! بتا خواجہ نصر الدین کو چائے خانے میں برا بھلا کہنے کے لئے تجھ کو امیر سے کتنے پیسے ملتے ہیں۔کتنے پیسے خبر رسانی کے لئے ملتے ہیں اور ہر آدمی کے لئے جس کے ساتھ تو غداری کرتا ہے تجھ کو کیا ملتا ہے؟ ہر سزا پانے والے اور جیل کی کال کوٹھری میں ڈالے جانے والے، پا بہ زنجیر کئے جانے والے اور غلام بنائے جانے والے کے لئے تجھے کیا دیا جاتا ہے؟ اے امیر کے جاسوس اور خبر رساں میں تجھے پہچان گیا!''

جاسوس نے جو ابھی تک ڈر کے مارے بے حس اور خاموش تھا اچانک تالی بجائی اور زور سے کہا:

''پہریدارو، ادھر آؤ!''

خواجہ نصر الدین نے اندھیرے میں پہریداروں کے دوڑنے، نیزوں کی کھڑکھڑاہٹ اور ڈھالوں کی جھن جھناہٹ کی آواز سنی۔ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ کود کر ایک طرف ہو گئے، اُنہوں نے چیچک رو جاسوس کو جو ان کا راستہ روکے کھڑا تھا زمین پر گرا دیا تھا۔

لیکن اب اُنہوں نے چوک کی دوسری طرف سے پہریداروں کے قدموں کی آواز سنی۔جس سمت بھی وہ بھاگتے ان کا سامنا پہریداروں سے ہوتا۔ایک لمحے کے لئے انہوں نے سوچا کہ اب بچ کر نکلنا ممکن نہیں ہے۔

مصیبت آ گئی، پھنس گیا میں!'' وہ زور سے چلائے 'الوداع، میرے وفادار گدھے!''

لیکن اسی وقت ایک ایسا غیر متوقع واقعہ ہوا جو بخارا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کبھی فراموش نہ کیا جائے گا کیونکہ بڑا زبردست ہنگامہ ہوا اور تباہی آئی۔

اپنے مالک کی غم انگیز چیخیں سن کر گدھا ان کی طرف دوڑا لیکن اس کے پیچھے ایک بڑا پیپا بھی صحن سے اچھلتا کودتا چلا۔ خواجہ نصر الدین نے لاعلمی میں اپنے گدھے کو اس پیپے کے آنکڑے سے باندھ دیا تھا جو چائے خانے کا مالک بڑے بہواروں کے موقع پر گاہک بلانے کے لئے پیٹا کرتا تھا۔ پیپا ایک پتھر سے ٹکرایا اور بھڑ بھڑایا اور گدھے نے پیچھے مڑ کر دیکھا، پیپا پھر بھڑ بھڑایا۔ گدھے نے سوچا کہ بھوت پریت اس کے مالک کا خاتمہ کرنے کے بعد اب اس کی بھوری کھال کے پیچھے پڑے ہیں۔ وہ دہشت سے رینکا اور اپنی دم اٹھا کر بے تحاشا چوک کے پار بھاگا۔

اسی وقت ایک کارواں کے آخری پچاس اونٹ جن پر چینی کے برتن اور تانبے کی چادریں لدی تھیں چوک میں داخل ہو رہے تھے۔ رینگنے کی دہشت ناک آواز اور ایک جانور کی اچھل کود سے جو اندھیرے میں سیدھا ان سے ٹکرا گیا خوفزدہ اونٹ ادھر اُدھر بھاگے۔ چینی کے برتن اور جھن جھناتی ہوئی تانبے کی چادریں نیچے آ رہیں۔

ایک لمحے میں پورے بازار اور ساھ کی سڑکوں پر ایسا زبردست ہنگامہ اور گڑبڑ ہوا جس کی مثال نہیں ملتی۔ گرجنے، بجنے، ٹکرانے، چیخنے، بھونکنے، غرانے اور ٹوٹنے پھوٹنے کی آوازیں سب مل کر ایک زبردست ہنگامہ بن گئیں۔ ہر ایک بدحواس ہو گیا۔ سینکڑوں اونٹ، گھوڑے اور گدھے اپنے کھونٹوں سے تڑا کر اندھیرے میں تانبے کی چادروں کے درمیان شور کرتے بھاگ رہے تھے اور ساربان و سائیس مشعلیں لئے شور وغل کرتے ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔

لوگ اس ہنگامے سے جاگ پڑے اور نیم عریاں ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ان کی رنج وغم اور مایوسی سے بھری ہوئی آوازیں اندھیرے میں گونج رہی تھیں کیونکہ وہ سوچ رہے تھے کہ قیامت آ گئی ہے۔

مرغ بانگ دے رہے تھے اور اپنے پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ہنگامہ اتنا بڑھا کہ سارے شہر اور اس کے مضافات تک پھیل گیا۔ آخر کار شہر کی فصیل پر توپیں گرجنے لگیں کیونکہ شہر کے پہرے داروں نے سوچا

کہ دشمن نے بخارا پر حملہ کر دیا ہے اور محل کی توپیں بھی چھوٹنے لگیں کیونکہ محل کے پہرے داروں نے خیال کیا کہ بغاوت ہوگئی ہے۔ بے شمار میناروں سے مؤذنوں کی غم انگیز پریشان کن اذان گونجی۔ اندھیرے میں قطعی ہنگامہ تھا، کسی کو پتہ نہ تھا کہ کدھر جائے۔

اور اس تاریکی اور ہنگامے کے قلب میں خواجہ نصرالدین بھاگ رہے تھے۔ وہ بڑی صفائی سے بھڑکے ہوئے گھوڑوں اور اونٹوں سے بچتے، پیپے کی آواز کے ذریعہ اپنے گدھے کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ گدھے کو اس وقت تک نہ پا سکے جب تک کہ رسی ٹوٹ نہ گئی اور پیپا اونٹوں کے پیروں سے لگ کر کسی طرف لنڈھک نہ گیا۔ پیپے سے بچنے کے لئے جو اونٹ بدحواس ہو کر بھاگ رہے تھے انہوں نے شامیانے، چائے خانے اور چھوٹی چھوٹی دکانیں گرا دیں۔

خواجہ نصرالدین کو گدھے کی تلاش میں بڑی دیر لگتی لیکن اتفاق سے ایک دوسرے سے سامنا ہو گیا۔ گدھا پسینے سے شرابور سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔

''چل، جلدی چل، یہاں بڑا غل غپاڑہ ہو رہا ہے'' خواجہ نصرالدین نے گدھے کو کھینچتے ہوئے کہا ''یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اگر کسی چھوٹے سے گدھے سے کوئی پیپا باندھ دیا جائے تو بڑے شہر میں کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ دیکھ، تو نے کیا کیا ہے! یہ سچ ہے کہ تو نے مجھے پہریداروں سے بچا لیا، لیکن مجھے بخارا کے شہریوں پر افسوس آتا ہے۔ یہ سب گڑبڑ ٹھیک کرنے میں ان کو صبح ہو جائے گی۔ ہمیں کہاں کوئی خاموش اور پرامن جگہ مل سکتی ہے؟''

خواجہ نصرالدین نے رات ایک قبرستان میں گذارنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی یہ دلیل بجا تھی کہ چاہے جتنا ہنگامہ کیوں نہ ہو، مردے نہ تو بھاگیں گے اور نہ چیخیں چلائیں گے یا مشعلیں لے کر دوڑیں گے۔

ہنگامہ پرور اور عوام کو اکسانے والے خواجہ نصرالدین نے اپنے شہر میں واپسی کا پہلا دن اسی طرح گزارا جو ان کے خطاب کے لئے سزاوار تھا۔ انہوں نے اپنے گدھے کو ایک قبر کے پتھر سے باندھ دیا اور خود ایک قبر پر دراز ہو گئے اور جلدی سو گئے۔ اس دوران میں شہر میں ہنگامہ، غل شور، گھڑگھڑاہٹ، کھڑکھڑاہٹ اور توپوں کی گرج کافی دیر تک جاری رہی۔

9

صبح سویرے جب ستارے دھندلے پڑنے لگے اور اندھیرے سے ہلکے ہلکے خط و خال ابھرنے لگے تو سینکڑوں جاروب کش، بڑھئی اور تھوئی بازار کے چوک میں جمع ہو گئے اور خوب زوروں سے کام شروع کر دیا۔ اُنہوں نے گرے ہوئے شامیانے کھڑے کئے، پلوں کی مرمت کی، باڑوں میں ٹوٹی پھوٹی جگہیں ٹھیک کیں، تمام لکڑی کے ٹکڑے اور ٹوٹے برتن اس طرح صاف کئے کہ سورج کی پہلی کرنوں کو بخارا میں اتنے بڑے ہنگامے کا کوئی نام ونشان نہ ملا۔

قبرستان میں رات بھر اچھی طرح آرام کرنے کے بعد خواجہ نصرالدین اپنے گدھے پر سوار چوک آئے۔ وہاں خوب زوروں کی چہل پہل تھی اور بازار بہت سی زبانوں اور قوموں والے رنگین مجمع سے بھرا ہوا تھا۔ ''ہٹو بچو، ہٹو بچو!'' خواجہ نصرالدین کی اپنی آواز سوداگروں، ساربانوں، بہشتیوں، حجاموں، آوارہ درویشوں، فقیروں، بازار میں دانت اکھاڑنے والوں (جو اپنے پیشے کے زنگ آلود اور دہشت ناک آلات لئے لہا رہے تھے) کی آوازوں میں گم ہوگئی۔ رنگا رنگ قبائیں، عمامے، گھوڑے کی جھولیں اور قالین، چینی، عربی، ہندوستانی، منگولیائی، اور بہت سی دوسری زبانیں اس بھیڑ بھکڑ اور غل غپاڑے میں گڈ مڈ ہو رہی تھیں۔ ایسی کرڈاڑ رہی تھی کہ آسمان چھپ گیا تھا۔ چوک میں لوگوں کا تانتا بندھا تھا جو اپنا سامان بازار میں لگا رہے تھے اور ان کی انکیں عام ہنگامے میں اضافہ کر رہی تھیں۔ کمہار چھوٹی چھوٹی چھڑیوں سے اپنے برتنوں کو بجا بجا کر اور راہ گیروں کا دامن تھام تھام کر التجا کر رہے تھے کہ وہ ان برتنوں کی صاف کھنک سنیں۔ اس طرح وہ انہیں برتن خریدنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ ٹھٹھیروں کی قطار میں تانبے کی چمک چکا چوند کر رہی تھی اور ان چھینیوں وار ہتھوڑیوں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی جن سے وہ کشتیوں اور صراحیوں پر نقش ونگار بنا رہے تھے، ساتھ ہی وہ اپنی دستکاری کی تعریف بھی کرتے جاتے تھے اور پڑوسیوں کے کام کی برائی۔ سونار چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں چاندی پگھلا رہے تھے۔ سونے کے تار کھینچ رہے تھے اور چنڑے کے گولوں کے ذریعہ قیمتی ہندوسرانی جواہرات کو جلا دے رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کا ہلکا سا جھونکا آتا اور عطر سازوں کی طرف سے خوشبو کی زوردار لپٹ آتی جہاں گلاب کا عطر، عنبر اور مشک اور مختلف قسم کے مسالے فروخت ہوتے تھے۔ ایک طرف رنگا رنگ، پھول پتیاں اور شبیہیں بنے ہوئے ایران، دمشق اور کاشغر کے قالین، گھوڑے کی رنگین جھولیں، سستی اور بیش قیمت دونوں طرح کی یعنی معمولی اور بہترین

گھوڑوں کے لئے لامحدود قطار میں چلی گئی تھیں۔

خواجہ نصرالدین ریشم والوں، ساز بنانے والوں، اسلحہ سازوں اور رنگ ریزوں کی لائنوں، غلاموں کے بازا اور اون تیار کرنے والوں کی طرف سے گذرے، اور یہ سب صرف بازار کی شروعات تھیں کیونکہ سینکڑوں اور قطاریں آگے تھیں۔ خواجہ نصرالدین اپنے گدھے پر مجمع میں جتنا ہی گھستے گئے اتنی غل غپاڑہ طول تکرار، چیخ پکار اور بے توڑ کی آوازیں اور زیادہ کان پھاڑنے لگیں۔ ہاں یہ وہی بازار تھا۔ بخارا کا مشہور اور لاجواب بازار جس کی مثال نہ تو دمشق میں تھی اور نہ خود بغداد میں۔

آخر کار وہ ان قطاروں کے جھمیلے سے باہر نکلے اور امیر کا محل دیکھا جو ایک روزن دار فصیل سے گھرا ہوا تھا۔ چاروں کونوں کے میناروں پر عرب اور ایرانی کاریگروں نے بڑی مہارت سے برسوں میں رنگا رنگ پچی کاری کی تھی۔

محل کے پھاٹک کے باہر رنگ برنگی خیمے پھیلے ہوئے تھے۔ پھٹے پرانے شامیانوں کے نیچے لوگ گرمی سے تھک کر چٹائیوں پر لیٹے یا بیٹھے تھے۔ کچھ اکیلے ہی تھے اور کچھ اپنے خاندان کے ساتھ۔ عورتیں بچوں کو کھلا رہی تھیں، کھانا پکا رہی تھیں، پھٹی ہوئی قباؤں اور گدوں کی مرمت کر رہی تھیں۔ نیم عریاں بچے ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے، غل مچا رہے تھے اور گستاخی سے اپنے بدن کا وہ حصہ محل کی طرف کئے ہوئے تھے جس کو چھپانا چاہئے۔ مرد سو رہے تھے یا کوئی گھریلو کام کر رہے تھے یا پھر چائے دانیوں کے گرد بیٹھ کر گپ لڑا رہے تھے۔ ''ارے یہ لوگ تو شاید یہاں کی دن سے ہیں!'' خواجہ نصرالدین نے سوچا۔

ان کی توجہ دو آدمیوں کی طرف گئی جن میں ایک گنجا اور دوسرا دھاڑی والا تھا۔ دونوں اپنے اپنے شامیانوں کے نیچے کھری زمین پر لیٹے تھے۔ دونوں کے درمیان کھونٹے پر ایک سفید بکری بندھی تھی جو ایسی دبلی پتلی تھی کہ بس اس کی پسلیاں کھال پھاڑ کر نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ بڑے غمگین لہجے میں ممیا رہی تھی اور کھونٹے کو کتر رہی تھی جس کو وہ ابھی تک آدھا کھا چکی تھی۔

خواجہ نصرالدین فطرتاً کھوجی واقع ہوئے تھے اس لئے وہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکے:

''سلام علیکم، بخارا کے شہریو! بتایئے کہ آپ لوگ خانہ بدوشوں میں کب سے شامل ہو گئے ہیں؟''

''مسافر ہماری ہنسی نہ اڑاؤ!'' داڑھی والے نے جواب دیا ''ہم خانہ بدوش نہیں ہیں بلکہ تمہاری طرح نیک مسلمان ہیں۔''

''لیکن اگر آپ نیک مسلمان ہیں تو اپنے گھر میں کیوں نہیں رہتے؟ محل کے پھاٹک پر کیا انتظار ہے؟''

ہم اپنے بادشاہ اور مالک امیر کے منصفانہ فیصلے کے منتظر ہیں جن کی آب وتاب آفتاب کو بھی شرماتی ہے۔''

''اچھا'' خواجہ نصرالدین نے طنز کو چھپائے بغیر کہا۔''تو کیا آپ اپنے بادشاہ اور مالک، امیر کے منصفانہ فیصلے کا جن کی آب وتاب آفتاب کو شرماتی ہے کافی دنوں سے انتظار کر رہے ہیں؟''

''مسافر ہم چھ ہفتے سے انتظار کر رہے ہیں'' گنجا بولا''یہ داڑھی والا جھگڑالو، اللہ اس کو مارے، شیطان اس کو دفان کرے۔ یہ داڑھی والا جھگڑالو میرا بڑا بھائی ہے۔ ہمارے والا کا انتقال ہوا۔ اُنہوں نے کچھ ملکیت چھوڑی۔ ہم نے سب کچھ تقسیم کرلیا ہے سوائے اس بکری کے۔ اب امیر اس کا فیصلہ کریں گے کہ یہ کس کی ہونی چاہئے۔''

''لیکن وہ بقیہ ملکیت کہاں ہے جو تم کو وراثت میں ملی ہے؟''

''ہم نے وہ سب نقد کرلیا۔ درخواست لکھنے کے لئے عرضی نویس کو دینا پڑتا ہے، پھر درخواست دینے کے لئے منشی، پہریداروں، اور بہت سے لوگوں کو۔''

گنجا یکا یک اچک کر اٹھا اور گندے، ننگے پیر درویش سے ملنے کے لئے لپکا جو مخروطی ٹوپی پہنے تھا اور اس کے پہلو سے کشکول لٹک رہی تھی:

''میرے لئے دعا کیجئے، اے بزرگ! دعا کیجئے کہ فیصلہ میرے حق میں ہو!''

درویش نے پیسے لے لئے اور دعا شروع کردی۔ جیسے ہی وہ اپنی دعا کے آخری الفاظ تک پہنچا گنجے نے اس کی کشکول میں ایک سکہ اور ڈال دیا تا کہ وہ دعا کو از سرِ نو شروع کر سکے۔

داڑھی والا بے چینی سے اٹھا اور مجمع میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کافی تلاش کے بعد اس کی نظر ایک اور درویش پر پڑی جو پہلے والے سے زیادہ گندا اور چیتھڑوں میں تھا اس لئے زیادہ بزرگ بھی تھا۔ اس درویش نے کافی بڑی رقم طلب کی۔ داڑھی والے نے کچھ طے توڑ کرنا چاہا لیکن درویش نے اپنی ٹوپی کے نیچے ٹٹول کر مٹھی بھر چیلڑ برآمد کئے۔ داڑھی والا یہ دیکھ کر فوراً اس کی کرامات کا قائل ہو گیا اور مطلوبہ رقم مان لی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی پر فاتحانہ نظر ڈالتے ہوئے رقم گنی۔

درویش نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر زور زور سے دعا شروع کی۔ اس کی بھاری بھرکم آواز میں پہلے درویش کی مدھم آواز غائب ہوگئی۔ گنجے نے پریشان ہوکر اپنے درویش کو چند سکے اور دئے۔ داڑھی والے نے بھی یہی کیا اور دونوں درویشوں نے ایک دوسرے کو شکست دینے کے لئے وہ چیخم دھاڑ کی کہ غالباً اللہ میاں فرشتوں کو آسمانوں کی کھڑکیاں بند کرنے کا حکم دے دیا ہوگا۔ بکری برابر کھونٹے کو کترے جا رہی تھی اور غمگین لہجے میں ممیا رہی تھی۔

گنجے بھائی نے اس کے سامنے تھوڑی سی گھاس ڈال دی جس پر داڑھی والا زور سے چیخا:

''اپنی گندی بدبودار گھاس میری بکری کے پاس سے لے جاؤ!''

اُس نے لات مار کر گھاس الگ ہٹادی اور بکری کے سامنے بھوسے کی ناند لگادی۔

''نہیں!'' گنجا غصے سے چلایا۔ ''میرے بکری تمہارا بھوسا نہیں کھائے گی!''

اب ناند بھی گھاس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ ٹوٹ گئی اور بھوسا سڑک کی مٹی میں مل گیا۔

دونوں بھائی سخت غصے میں دست وگریبان ہوگئے۔ وہ زمین پر لوٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کی گھونسوں اور گالیوں سے خاطر کر رہے تھے۔

''دو بیوقوف لڑ رہے ہیں، دو دھوکے باز دعا کر رہے ہیں اور بکری بے چاری بھوکوں مری جا رہی ہے'' خوانہ نصرالدین نے سر ہلاتے ہوئے کہا ''ارے، نیک اور محبت کرنے والے بھائیو، ادھر دیکھو! اللہ نے اس جھگڑے کا فیصلہ اپنے طور پر کر دیا۔ اُس نے بکری کو تم سے لے لیا۔''

بھائیوں کو ہوش آیا اور اُنہوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے خود آلود چہرے لئے بڑی دیر تک مردہ بکری کو گھورتے رہے۔ آخر کار گنجے نے کہا:

''اس کی کھال تو نکال لینا چاہئے۔''

''یہ میں کروں گا'' داڑھی والا جلدی سے بولا۔

''تم کیوں کرو گے؟'' دوسرے نے پوچھا۔ اس کا گنجا سر غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

''بکری میری ہے اور اسی لئے اس کی کھال بھی۔''

''نہیں، میری ہے!''

قبل اس کے لئے خواجہ نصرالدین کچھ بولیں دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا پھر زمین پر لوٹ

رہے تھے۔ایک لمحے کے لئے بھاری مٹھی میں سیاہ بالوں کا گچھا نظر آیا جس سے خواجہ نصرالدین نے نتیجہ اخذ کیا کہ بڑے بھائی کی داڑھی کا کافی حصہ غائب ہو چکا ہے۔

ناامیدی سے ہاتھ جھٹک کر خواجہ نصرالدین آگے بڑھ گئے۔

ایک لوہار ان کی طرف آ رہا تھا۔اس کے پٹکے میں ایک سنسی لگی ہوئی تھی۔ یہ وہی لوہار تھا جس نے خواجہ نصرالدین سے ایک دن پہلے تالاب پر باتیں کی تھیں۔

سلام علیکم، آہن گر!'' خواجہ نصرالدین نے خوشی سے کہا۔ ہماری ملاقات پھر ہوگئی۔ حالانکہ مجھے ابھی اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقع نہیں ملا۔آہنگر ،تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم بھی امیر سے انصاف کا مطالبہ کرنے آئے ہو؟''

''ایسے انصاف سے بھلا کیا ہوسکتا ہے؟'' لوہار نے افسردگی سے کہا۔''میں لوہاروں کی لائن سے فریاد لے کر آیا ہوں۔ ہم کو پندرہ پہرے دار دئے گئے ہیں تین ماہ تک کھلانا پلانا تھا۔ایک سال گزر چکا ہے اور وہ اب بھی ہمارے اوپر مسلط ہیں۔اس وجہ سے ہم بڑا نقصان اٹھا رہے ہیں۔''

''اور میں رنگریزوں کی طرف سے آیا ہوں۔ایک آدمی بیچ میں بولا جس کے ہاتھوں پر رنگ کے دھبے تھے اور جس کے چہرے کا رنگ زہر آلود بھاپ کی وجہ سے جس میں وہ صبح سے شام تک سانس لیتا تھا سبزی مائل ہو گیا تھا۔''میں بھی اسی طرح فریاد لے کر آیا ہوں۔ ہم کو پچیس پہریدار ملے ہیں۔ ہمارا کاروبار تباہ ہو گیا ہے نفع بہت کم ہو گیا ہے۔شاید امیر ہمارے اوپر رحم کھا کر ہمیں اس ناقابلِ برداشت بار سے چھٹکارا دلا دیں۔''

''آخر تم بیچارے پہریداروں کو کیوں ناپسند کرتے ہو؟'' خواجہ نصرالدین نے زور سے کہا''سچ مچ، وہ بخارا کے سب سے زیادہ برے اور لالچی لوگ تو نہیں ہیں۔تم لوگ بلا شکائت کئے امیر، اس کے تمام وزراء اور عمائدین کو کھلاتے ہو،تم دو ہزار ملاؤں اور چھ ہزار درویشوں کو کھانا دیتے ہو۔تو آخر پہریدار ہی کیوں بھوکے رہیں؟ کیا تمہیں یہ کہاوت معلوم نہیں کہ جہاں ایک گیدڑ کو کھانا ملا وہاں دس اور فوراً آ جاتے ہیں۔آہنگر اور رنگ ریز تمہاری شکایت میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''آہستہ سے'' آہنگر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔رنگ ریز نے خواجہ نصرالدین کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھا اور کہا''مسافر،تم خطرناک آدمی ہو۔تمہارے الفاظ میں نیکی نہیں ہے۔لیکن

ہمارے امیر عقلمند اور فیاض ہیں۔''

وہ رُک گیا کیونکہ اچانک قرناؤں اور نقاروں کی آواز گونج اٹھی۔ جیسے ہی محل کے پھاٹکوں کے پیتل سے منڈھے دروازے آہستہ آہستہ کھلے خیموں کا سارا رنگارنگ جنگل جاگ اٹھا۔

''امیر! امیر!'' ہر طرف غلغلہ ہوا اور لوگ اپنے امیر کو دیکھنے چاروں طرف سے محل کی طرف دوڑ پڑے۔ خواجہ نصرالدین نے اگلی صفوں میں ایک معقول جگہ چن لی۔

پہلے پھاٹک سے نقیب اعلان کرتے ہوئے نکلے ''امیر کے لئے راستہ دو، مقدس امیر کے لئے راستہ دو! مجاہدین کے لئے راستہ دو!''

اُن کے بعد پہریدار آئے جو اپنے ڈنڈوں سے دائیں بائیں اُن لوگوں کی پیٹھوں اور سروں پر بارش کر رہے تھے جو اشتیاق میں قریب آ گئے تھے۔ مجمع کے درمیان ایک چوڑا راستہ بن گیا۔ اب نقارے، شہنائیاں، طنبورے، اور قرنائیں لئے موسیقار آئے۔ اس کے بعد زریں ریشمی لباس میں، مرصع مخملی نیاموں میں ہلالی شمشیریں لگائے دستہ برآمد ہوا۔ پھر دو ہاتھی نکلے جن کے سروں پر لمبی لمبی کلغیاں تھیں۔ آخر میں ایک بہت ہی مرصع اور سجی ہوئی پالکی نمودار ہوئی جس میں خود باعظمت امیر ایک بھاری زریں نمگیرے کے نیچے تشریف فرما تھے۔

اس منظر کو دیکھ کر مجمع میں ایک غلغلہ بلند ہوا جیسے کہ چوک پر کوئی ہوا کا جھونکا آ گیا ہو اور سب لوگ زمین پر سجدے میں جھک گئے کیونکہ امیر کا حکم تھا کہ اس کی تابعدار رعایا اپنے کو امیر کا بندۂ بے دام خیال کرے اور اس سے آنکھیں نہ چار کرے۔ پالکی کے آگے آگے خدام دوڑ دوڑ کر قالین بچھاتے جاتے تھے، دائیں طرف بڑی سنجیدگی اور شان سے ترکی کا سنہرا حقہ لئے حقے بردار تھا۔

جلوس کے پچھلے حصے میں پیتل کے خودوں، سپروں، نیزوں، تیر کمانوں اور ننگی تلواروں سے لیس پہرے دار تھے۔ سب سے آخر میں دو چھوٹی توپیں تھیں۔ سارا جلوس دوپہر کی تیز دھوپ سے چمچما رہا تھا۔ سورج نے جواہرات، سونے چاندی کے زیورات، پیتل کے خودوں، سپروں، اور سفید فولادی، ننگی تلواروں کو آئینے کی طرح چمکا دیا تھا... لیکن اس سجدے میں پڑے ہوئے زبردست مجمع میں نہ تو جواہرات چمک رہے تھے اور نہ سونا حتیٰ کہ تانبے تک کی چمک نہ تھی۔ غرض کوئی ایسی چمک دمک نہ تھی جو دل کو خوش کر سکتی ہو۔ وہاں تو صرف چیتھڑے، غربت، اور بھوک تھی۔ اور جب امیر کا پرتکلف جلوس اس

گندے، جاہل اور کچلے ہوئے لوگوں کے سمندر کے درمیان سے گذر رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گدڑی میں لعل ہو۔

قالینوں سے سجا ہوا اونچا چبوترہ جہاں سے امیر اپنی وفادار رعایا پر عنایت کی بارش کرنے والے تھے پہلے ہی چاروں طرف پہرے داروں سے گھر چکا تھا اور نیچے سولی کے میدان میں جلاد بڑے زوروں کے ساتھ امیر کے احکام کی تعمیل کے لئے تیاری کر رہے تھے۔ وہ سلاخون کی لچک اور ڈنڈوں کی مضبوطی کی جانچ کر رہے تھے، بہت سی زبانوں والے چمڑے کے کوڑے طشتوں میں بھگو رہے تھے، سولیاں نصب کر رہے تھے، کلہاڑیاں تیز کر رہے تھے اور زمین میں تیز نوکوں والے ستون کاڑ رہے تھے۔ اس کا منتظم شاہی پہرے داروں کا داروغہ تھا جس کی بربریت کا چرچا بخارا سے باہر دور دور پھیل چکا تھا۔ وہ لال چہرے، بھاری جسم اور کالے بالوں والا آدمی تھا۔ اس کی داڑھی سینے پر اپنا گھنا سایہ کئے ہوئے ناف تک لٹک رہی تھی اور اس کی آواز اونٹ کی بلبلاہٹ سے ملتی جلتی تھی۔

وہ بڑی فیاضی کے ساتھ گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر رہا تھا۔ اچانک وہ بہت نیچا جھکا اور چاپلوسی سے کانپنے لگا۔

آہستہ آہستہ جھولتی ہوئی پالکی چبوترے تک پہنچی اور امیر نے اس کے پردے ہٹاتے ہوئے اپنے درشن فعایا کودئے۔

10

تقدس مآب امیر، بہرحال، ایسا کچھ صورت دار نہیں تھا۔ اس کا چہرہ جس کی تشبیہ اکثر درباری شعراء تابدار ماہ کامل سے دیتے تھے پلپلے خربوزے سے زیادہ مشابہ تھا۔ وہ اپنے وزیروں کے سہارے سنہرے تخت پر جلوہ فرمانے کے لئے پالکی سے اترا۔ خواجہ نصرالدین نے دیکھا کہ درباری شعراء کے دعووؤں کے برعکس وہ بالکل سرو سہی قد نہ تھا۔ اس کا جسم موٹا اور بھاری تھا، اس کے ہاتھ چھوٹے اور پیرا تنے ٹیڑھے تھے کہ اس کی قبا سے بھی یہ عیب نہیں چھپ رہا تھا۔

وزراء اس کے دائیں طرف کھڑے ہو گئے، ملاؤں اور عمائدین کو بائیں طرف جگہ ملی، نیچے احکام نویس اپنے رجسٹر اور دواتیں لئے جمے تھے اور درباری شعراء نے تخت کے پیچھے اس طرح نیم حلقہ بنالیا تھا کہ ان کی نظر اپنے آقا کی گدی پر رہے۔ شاہی مورچھل بردار مورچھل جھلنے لگا۔ حقے بردار نے سنہری نال

اپنے مالک کے ہونٹوں سے لگا دی۔ چبوترے کو گھیرے ہوئے زبردست مجمع دم بخود کھڑا تھا۔ خواجہ نصرالدین رکابوں کے اوپر اٹھے اور اپنی گردن نکال کر غور سے سننے لگے۔

امیر نے اونگھتے ہوئے سر ہلایا۔ پہریداروں نے دو حصوں میں تقسیم ہو کر گنجے اور دھاڑی والے دونوں بھائیوں کو راستہ دیا جن کی باری تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل گھسٹتے ہوئے چبوترے تک گئے اور زمین تک لٹکتے ہوئے قالین کو بوسہ دیا۔

''اٹھو!'' وزیرِ اعظم بختیار نے کہا۔

دونوں بھائی اٹھے لیکن ان کی یہ جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنی قباؤں کی دھول جھاڑ دیں۔ خوف نے ان کی زبان اس طرح پکڑ لی تھی کہ وہ ہکلا رہے تھے اور ان کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیکن بختیار آخر بہت تجربہ کار وزیر تھا۔ وہ ایک نظر میں ساری صورت حال بھانپ گیا۔

''تمہاری بکری ہے کیا؟'' اس نے بے چین ہو کر بیچ میں لقمہ دیا۔

گنجے بھائی نے جواب دیا ''وزیرِ اعلیٰ نسب، وہ تو مر چکی، اللہ نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ لیکن کھال کا مالک کون ہے؟''

بختیار امیر کی طرف مڑا:

''کیا حکم ہے، اے شاہِ دانشوراں؟''

امیر نے بالکل بے تعلقی سے جمائی لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ بختیار نے بڑے ادب سے بھاری سفید دستار والا سر جھکایا:

''مالک، میں نے فیصلہ آپ کے چہرے سے معلوم کر لیا! سنو'' وزیر نے بھائیوں کی طرف مڑ کر کہا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گئے اور امیر کی عقل، انصاف اور مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ بختیار نے فیصلے کا اعلان کرنا شروع کیا اور احکام نویس اپنے اپنے بڑے رجسٹروں میں اس کے الفاظ لکھنے کے لئے اپنے قلم دوڑانے لگے۔

''امیر المومنین، آفتابِ جہاں، باعظمت امیر، خدا ان پر رحمتیں نازل کرتا رہے ان کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر بکری کو اللہ نے لے لیا ہے تو کھال انصاف کے مطابق زمین پر اللہ کے نائب یعنی خود عظیم امیر کی ملکیت ہونی چاہئے۔ اس لئے بکری کی کھال نکال کر اس کو سکھانا اور پکانا چاہئے اور محل میں لا کر شاہی خزانے کے

حوالے کرنا چاہئے۔''

بھائیوں نے بدحواس ہوکر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مجمع میں چپکے چپکے کھسر پھسر ہونے لگی۔ بختیار نے اپنا حکم زوردار اور صاف آواز میں جاری رکھا:

''اس کے علاوہ مدعیان دوسو تانگے مقدمے کے اخراجات، ڈیڑھ سو تانگے محل کا ٹیکس، پچاس تانگے احکام نویسوں کا خرچ ادا کریں اور مسجدوں کی آراستگی کے لئے بھی چندہ دیں۔ یہ تمام رقم نقدی یا کپڑوں یا کسی اور قسم کی جائیداد کی صورت میں فوراً وصول کی جائے۔''

ابھی بختیار نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ ارسلان بیگ کے اشارے پر پہرے دار دونوں بھائیوں پر ٹوٹ پڑے، ان کے پٹکے کھول دئے، جیبیں باہر نکال کر جھاڑ لیں، قبائیں تار تار کر دیں اور جوتے اتار کر ان کو ننگے پیر اور تیم عریاں کر کے گردن پکڑ کر ڈھکیل دیا۔

یہ سارا قصہ چٹکی بجاتے ہو گیا۔ فیصلہ کا اعلان ہوتے ہی درباری شاعروں نے تحسین و مرحبا کے نعرے لگائے:

''دانا امیر، داناؤں کے دانا! دانائے روزگار!''

تخت کی طرف اپنی گردنیں بڑھا کر وہ اس طرح کی تعریفیں دیر تک کرتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ اس کی آواز سب سے بلند ہو کر امیر کے گوش گزار ہو سکے۔ اس دوران میں چبوترے کے چاروں طرف مجمع خاموش کھڑا ہمدردی اور افسوس کے ساتھ دونوں بھائیوں کو دیکھ رہا تھا۔

''پروا مت کرو!'' خواجہ نصرالدین نے بڑے سنجیدہ لہجے میں دونوں بھائیوں سے کہا جو ایک دوسرے سے چمٹے دہاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ ''بہر حال چوک پر چھ ہفتے انتظار کا وقت ضائع نہیں گیا۔ تمہارا فیصلہ منصفانہ اور رحیمانہ ہے کیونکہ ہر ایک جانتا ہے کہ دنیا بھر میں ہمارے امیر سے زیادہ دانش مند، زیادہ رحیم اور کوئی نہیں ہے، اور اگر کسی کو اس میں شک ہو...'' یہاں اُنہوں نے چاروں طرف اپنے آس پاس کے لوگوں کو دیکھا اور کہا ''تو پہریداروں کو بلانے میں دیر نہ لگے گی۔ اروہ؟ ہاں، وہ شبہ کرنے والے مردود کو جلادوں کے حوالے کر دیں گے جو آسانی سے اسے بتا دیں گے کہ وہ کس طرح غلط راستے پر چل رہا ہے۔ ارے بھائیو، اطمینان سے گھر جاؤ۔ اب کبھی اگر تمہاری لڑائی کسی مرغی کے بارے میں ہو تو پھر امیر کی عدالت میں آنا۔ لیکن ذرا پہلے اپنے مکانات، انگور کے چمن اور کھیت بیچ لینا، نہیں تو ٹیکس نہیں ادا کر سکو

گے اور اس سے امیر کے خزانے کو نقصان ہوگا جس کا خیال ہی ہر وفادار رعایا کے لئے نا قابلِ برداشت ہونا چاہئے۔''

''کاش کہ ہم اپنی بکری کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے'' بھائیوں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہارے خیال میں آسمان پر بیوقوف کافی تعداد میں نہیں ہیں؟'' خواجہ نصر الدین نے پوچھا۔ ''معتبر آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ آج کل جنت و جہنم دونوں احمقوں سے بھرے پڑے ہیں اور اب اور نہیں لئے جا رہے ہیں... بھائیو، میں تمہارے لئے ابدیت کی پیش گوئی کرتا ہوں... اب یہاں سے رفو چکر ہو جاؤ کیونکہ پہرے دار ادھر دیکھ رہے ہیں اور تمہاری طرح میں لافانی ہونے پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔''

دونوں بھائی زور زور سے سسکیاں بھرتے، اپنا چہرہ نوچتے اور سڑک کی زرد خاک اپنے سروں پر اڑاتے چلے گئے۔

اب لوہار امیر کے سامنے حاضر ہوا۔ اس نے اپنی شکایت بھاری گرجدار آواز میں پیش کی۔ وزیر اعظم بختیار نے امیر کی طرف دیکھا:

''اعلیٰ حضرت کیا حکم ہوتا ہے؟''

امیر سو رہا تھا اور اس کے کھلے ہوئے منہ سے خراٹے صادر ہو رہے تھے۔ بختیار ذرا بھی نہ جھجکا اور بولا:

جہاں پناہ، میں نے آپ کا حکم چہرے سے معلوم کر لیا ہے۔''

اور اس نے شان کے ساتھ اعلان کیا:

''خدا کی طرف سے جو رحیم و کریم ہے، امیر المومنین اور ہمارے آقا نے جو اپنی رعایا کی فکر سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہتے اس کو یہ عزت دے کر بڑی مہربانی اور عنایت کا اظہار کیا ہے کہ وہ امیر کے پہرے داروں کی دیکھ بھال اور کھانے پینے کا انتظام کر سکے۔ یہ سہولت دے کر امیر نے بخارا شریف کے شہریوں کو یہ باعزت موقع دیا ہے کہ وہ ہر روز اور ہر گھنٹے اپنے امیر کے لئے جذبۂ احسان و شکر کا اظہار کر سکیں۔ اس قسم کی عزت ہمارے پڑوسی ملکوں کے باشندوں کو نہیں حاصل ہے۔ لیکن لوہاروں کی قطار نے اپنی سعادت مندی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس آہن گر یوسف نے عقبیٰ کے عذابوں اور گناہ گاروں کے لئے بال سے باریک پل کی پروا کئے بغیر ڈھٹائی سے اپنی ناشکری کا اظہار کیا ہے۔ مزید برآں، اس کو

یہ جرٔت ہوئی کہ وہ اپنی شکایت ہمارے آقا ومولا، تقدس مآب امیر کے سامنے لائے جن کا نور آفتاب کو بھی ماند کرتا ہے۔

''اس لئے ہمارے تقدس مآب امیر نے عنایت فرما کر یہ فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ آہن گر یوسف کو دوسو درے لگائے جائیں۔ اس سے اُس کو بلا شبہ توبہ کا خیال آئے گا جس کے بغیر اس پر جنت کے دورازے کھلنا ممکن نہیں ہیں۔ جہاں تک آہن گروں کی قطار کا سوال ہے تقدس مآب امیر نے اپنی مزید عنایت ومہربانی کا اظہار کیا ہے اور بیس اور پہرے دار وہاں رہنے اور کھانے پینے کے لئے بھیج دئے ہیں۔ اس طرح وہ ہر روز اور ہر گھنٹے ہمارے امیر کی دانش مندی اور رحم وکرم کی تعریف کرنے کی خوش نصیبی سے محروم نہ ہوں گے۔ یہ ہے ان کا فیصلہ، خدا ان کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بہت دنوں تک سلامت رکھے۔''

درباری خوشامدیوں کی تعریف وتحسین کا شور پھر بلند ہوا۔ اس دوران میں پہرے داروں نے آہن گر یوسف کو پکڑ لیا اور اس کو سزا دینے کی جگہ گھسیٹ کر لے گئے جہاں جلاد اپنے خوفناک دانت نکالے ہوئے بھاری چابکوں کو تول رہے تھے۔

آہن گر ایک چٹائی پر پٹ گر پڑا۔ درے سے سراتے ہوئے برسنے لگے اور آہن گر کی پیٹھ لہولہان ہوگئی۔

جلادوں نے اس کو بری طرح پیٹا، اس کی کھال کی دھجیاں اڑا دیں اور گوشت ہڈیوں تک کاٹ دیا۔ لیکن آہنگر کے منہ سے ایک چیخ، ایک آہ نہ نکلی۔ جب وہ کھڑا ہوا تو اس کے منہ سے سیاہ جھاگ نکل رہا تھا۔ سزا کے دوران اس نے اپنے دانت زمین میں پیوست کر لئے تھتا کہ کوئی چیخ اس کے منہ سے نہ نکل سکے۔

''آہن گر بھولنے والا نہیں ہے'' خواجہ نصرالدین نے کہا ''وہ آخری دم تک امیر کی مہرانی کو یاد رکھے گا۔ رنگریز، تم کیا انتظار کر رہے ہو؟ جاؤ نا؟ اب تمہاری باری ہے۔''

رنگ ریز نے زمین پر تھوکا اور بلا پیچھے دیکھے مجمع سے چلا گیا۔

وزیرِ اعظم دوسرے مقدموں کا جلدی جلدی فیصلہ کرتا گیا اور ہر ایک سے اس نے امیر کے خذانے کے لئے حاصلات میں کوئی کمی نہیں کی۔ یہی ایک بات تھی جس نے اس کو تمام عمائدین سے ممتاز بنایا تھا۔

جلاد متواتر مصروف تھے۔ان کی طرف سے چیخوں اور رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔وزیر اعظم نئے نئے گناہ گاروں کو جلادوں کے پاس بھیجتا جا رہا تھا۔ایک لمبی قطار اپنے نمطروں کا انتظار کر رہی تھی۔ان میں بڈھے مرد اور عورتیں، حتیٰ کہ ایک دس سالہ لڑکا تھا جس کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس نے بدتمیزی کی اور باغیانہ طور پر امیر کے محل کے سامنے پیشاب کیا۔وہ کانپ رہا تھا۔اس کو دیکھ کر خواجہ نصرالدین کا دل رحم اور غصے سے بھر آیا۔

''واقعی یہ لڑکا بڑا خطرناک مجرم ہے'' اُنہوں نے زور سے کہا۔''امیر کی دوراندیشی کی تعریف نہیں ہوسکتی کہ وہ اس طرح دشمنوں سے اپنے تخت کو محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں جو اپنی کمسنی سے ہی برے خیالات کو چھپائے رکھتے ہیں۔صرف آج ہی میں نے ایک اور مجرم دیکھا ہے جو اس سے بھی برا اور خطرناک تھا۔اس دوسرے مجرم کی کرتوت ___ کیا آپ یقین کریں گے؟ پہلے سے بھی بری تھیں اور پھر ٹھیک محل کی دیوار کی نیچے! ایسی ستاخی کے لئے کوئی بھی سزا کم ہے۔اس کو تو نوکیلے ستون پر بٹھا کر ہلاک کر دینا چاہئے حالانکہ ستون اس کے اندر سے ایسا گذر جاتا جیسے سیخ چوزے کے جسم سے گذر جاتی ہے کیونکہ لڑکا صرف چار سال کا تھا۔بہرحال، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اس کی عمر کوئی عذر نہیں ہوسکتی۔میرے دل کو ان زبردست برائیوں کے خیال سے سخت رنج ہوتا ہے جو ہمارے بخارا میں پھیل گئی ہیں۔بہرنوع، ہمیں امید ہے کہ امیر کے جلادوں اور پہرے داروں کی مدد سے یہ برائیاں ختم ہو جائیں گی اور ان کی جگہ اچائیاں لے لیں گ ے۔''

اُنہوں نے اس طرح یہ سب کچھ کہا جیسے کوئی ملا وعظ دے رہا ہو۔ان کا لہجہ اور الفاظ دونوں اچھے تھے لیکن جن کے کان تھے اُنہوں نے ان الفاظ کو سنا اور سمجھا اور چپکے چپکے اپنی داڑھیوں میں تلخی سے مسکرائے۔

11

اچانک خواجہ نصرالدین نے دیکھا کہ مجمع چھٹنے لگا۔بہت سے لوگ جلدی جانے لگے اور کچھ تو بھاگ ہی رہے تھے۔

''کیا پہرے دار میرا پیچھا کر رہے ہیں؟'' انہوں نے گھبرا کر سوچا۔

لیکن وہ سودخور کو آتے دیکھ کر اس کا سبب سمجھ گئے۔اس کے پیچھے، پہریداروں کے محاصرے میں،

ایک نحیف سفید داڑھی والا بڈھا تھا جس کی قبا مٹی سے لتھڑی ہوئی تھی اور ایک برقع پوش عورت یا یہ کہنا یادہ صحیح ہوگا جوان لڑکی تھی جیسا کہ خواجہ نصرالدین کی تجربہ کار نگاہیں اس کی چال سے بھانپ سکیں۔

''اور ذاکر، جورا، محمد اور صادق کہاں ہیں؟'' اپنی چیچیاتی ہوئی آواز میں سودخور نے لوگوں کا کانی آنکھ سے جایزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ دوسری آنکھ دھندلی اور غیر متحرک تھی اور اس پر جالا چھایا ہوا تھا۔''وہ ابھی ابھی تو یہاں تھے۔ میں نے ان کو دور سے دیکھا تھا۔ ان کے قرض جلد ہی واجب الادا ہیں۔ ان کے لئے بھاگ کر چھپنا بے سود ہے۔''

اور اب یہ کبڑا لنگڑاتا ہوا آگے بڑھا۔

لوگوں نے آپس میں کہنا شروع کیا:

''دیکھو، یہ بڈھا کھوسٹ، کمہار نیاز اور اس کی بیٹی کو امیر کے سامنے گھسیٹ لایا ہے۔''

''اس نے کمہار کو ایک دن کی بھی چھوٹ نہیں دی۔''

''لعنت ہو اس پر، میرا قرض پندرہ دن میں واجب الادا ہے۔''

''اور میرا ایک ہفتے ہیں۔''

''دیکھو، لوگ اس کے آنے پر کس طرح بھاگتے اور چھپتے ہیں جیسے وہ کورھ یا ہیضے کی بیماری لایا ہو!''

''یہ سودخور کوڑھ سے بھی بدتر ہے!''

خواجہ نصرالدین کی روح کو پشیمانی سے تکلیف تھی۔ انہوں نے اپنی قسم کو دہرایا کہ''میں اس کو اسی تالاب میں ڈبوؤں گا!''

ارسلان بیگ نے سودخور کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنی باری کے بغیر آ جائے۔ اس کے پیچھے پیچھے کمہار اور اس کی بیٹی تھے۔ اُنہوں نے گھٹنوں کے بل جھک کر قالین کے دامن کو بوسہ دیا۔

''سلام علیکم، لایق جعفر'' وزیراعظم نے اخلاق سے کہا

''کیسے آئے؟ باعظمت امیر سے اپنا کام بتاؤ۔''

''اے باعظمت بادشاہ، میرے آقا!'' جعفر نے امیر کو مخاطب کر کے کہا جس نے نیند کی حالت میں سر ہلایا اور پھر خراٹے بھرنے لگا۔''میں آپ سے انصاف مانگنے آیا ہوں۔ یہ آدمی جس کا نام نیاز ہے

اور پیشے کا کمہار ہے میرا سوتا نگے کا قرض دار ہے اور اس قرض پر تین سوتا نگے کا مزید سود چڑھ گیا ہے۔ آج صبح یہ قرض واجب الادا تھا لیکن کمہار نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ اے دانش ور امیر، آفتاب جہاں، آپ ہی ہمارا فیصلہ کیجئے۔''

احکام نویسوں نے سودخور کی شکایت اپنے رجسٹر میں درج کر لی۔ اب وزیر اعظم نے کمہار سے کہا:

''کمہار، باعظمت امیر کی بات کا جواب دو۔ کیا تم یہ قرض مانتے ہو؟ شائد تمہیں ادائیگی کے دن اور گھنٹے پر اعتراض ہے؟''

''نہیں'' کمہار نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ ''نہیں، دانش ور اور منصف وزیر۔ مجھے کسی بات پر اعتراض نہیں ہے۔ نہ تو قرض پر اور نہ دن اور گھنٹے پر۔ میں صرف ایک ماہ کی مہلت چاہتا ہوں۔ میں اپنے کو امیر کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں۔''

''میرے آقا، مجھے فیصلے کا اعلان کرنے کی اجازت دیجئے جو میں نے آپ کے چہرے سے پڑھ لیا ہے'' بختیار نے کہا ''خداوند رحیم و کریم کے نام پر قانون کے مطابق جو بھی وقت پر اپنا قرض نہیں ادا کرتا وہ اپنے بہاجن کا معہ اپنے خاندان کے غلام ہو جاتا ہے اور اس وقت تک غلام رہتا ہے جب تک وہ ساری مدت کے لئے، جس میں غلامی کا زمانہ بھی شامل ہے، سود اور اصل نہیں ادا کر دیتا۔''

کمہار کا سر جھکتا گیا اور وہ اچانک کانپنے لگا۔ مجمع میں بہت سے لوگوں نے اپنی آہیں روک کر منہ پھیر لیا۔ لڑکی کے شانے کانپ رہے تھے۔ وہ برقع میں رو رہی تھی۔ خواجہ نصر الدین بار بار یہ بات اپنے آپ دہرا رہے تھے:

''میں غریبوں پر اس وحشیانہ مظالم کرنے والے کو ڈبو کر رہوں گا!''

''لیکن ہمارے آقا رحم و کرم لا انتہا ہے'' بختیار نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔

مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ بڈھے کمہار نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر امید کی کرن جھلک رہی تھی۔

''حالانکہ قرض ابھی واجب الادا ہے لیکن امیر کمہار نیاز کو مہلت دیتے ہیں۔ ایک گھنٹے کی۔ اگر ایک گھنٹہ ختم ہونے پر نیاز مذہبی اصولوں سے لاپرواہی برتتا ہے اور پورا قرض معہ سود کے ادا نہیں کرتا تو قانون کی تکمیل ہوگی جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ جا، اے کمہار امیر کی مہربانی تیرا ساتھ دے!''

بختیار نے فیصلہ ختم کیا نہیں کہ تخت کے پیچھے کھڑے ہوئے خوشامدیوں نے اپنا چرخہ چلایا:

''صاحبِ انصاف امیر، آپ کے انصاف کے سامنے تو انصاف خود شرمندہ ہے! اے رحیم اور دانشور امیر! فیاض امیر، زمین و آسمان کی شوکت و شان، ہمارے مقدس امیر!''

اس بار خوشامدیوں نے تعریفوں سے اس طرح آسمان اٹھا لیا کہ امیر کی نیند ٹوٹ گئی اور اس نے غصے سے ڈانٹ کر ان کو چپ رہنے کے لئے کہا۔ وہ سب سناٹے میں آ گئے۔ چوک پر مجمع بھی خاموش تھا۔ اچانک زوردار، سمع خراش رینکنے کی آواز نے اس عام خاموشی کو توڑا۔

یہ خواجہ نصرالدین کا گدھا تھا۔ یا تو وہ ایک جگہ کھڑے کھڑے تنگ آ چکا تھا یا پھر اس نے اپنے کسی لمبے کانوں والے بھائی کو دیکھ لیا تھا جس سے وہ صاحب سلامت کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال ہوا یہ کی وہ رینکنے لگا، دُم اوپر اٹھا دی، تھوتھن آگے بڑھا دیا اور زرد زرد دانت نکوس دئے۔ اس کی آواز کان پھاڑنے والی اور قابو سے باہر تھی اور اگر وہ ایک لمحے کے لئے رکتا بھی تھا تو محض سانس لینے کے لئے، اپنے جبڑے زیادہ کشادہ کرنے اور زیادہ زور سے رینکنے اور چیخنے کے لئے۔

امیر نے اپنے کان بند کر لئے۔ پہرے دار مجمع کی طرف جھپٹے۔ لیکن خواجہ نصرالدین وہاں سے دور تھے۔ انہوں نے اپنے رینکتے ہوئے گدھیت کو کھینچتے اور دھکا دیتے ہوئے زور سے اسے ملامت کی:

''بد ذات گدھے، تو کس بات پر خوش ہے۔ کیا تو ہمارے امیر کے رحم و کرم کی تعریف اتنا شور مچائے بغیر نہیں کر سکتا؟ شاید تو اس طرح دربار کا سب سے بڑا خوشامدی بننا چاہتا ہے؟''

مجمع میں ان باتوں پر زور سے قہقہہ پڑا اور لوگوں نے خواجہ کو نکلنے کا راستہ دے دیا اور قبل اس کے کہ پہرے دار اُن تک پہنچ سکیں جگہ پھر گھر گئی۔ اگر وہ خواجہ نصرالدین کو پکڑ پاتے تو اس بدتمیزی سے بدامنی پیدا کرنے کے لئے ان کے درے لگاتے اور ان کا گدھا ضبط کر لیتے۔

12

''فیصلہ ہو گیا اور اب تمہارے اوپر میرے اختیا کی کوئی حد نہیں'' سود خود جعفر نے کمہار نیاز اور اس کی بیٹی گل جان سے عدالت چھوڑنے کے بعد کہا۔ میری حسینہ، جب سے تجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا میرے دل کا صبر و قرار جاتا رہا۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ جلدی سے اپنا چہرہ دکھا۔ آج ٹھیک ایک گھنٹے میں تو میرے گھر میں ہو گی۔ اگر تو مجھ پر مہربان ہوئی تو میں تیرے باپ کو ہلکا کام اور اچھا کھانا دوں گا۔ اگر تو نے ضد کی تو اپنی

آنکھوں کی قسم میں اس کو کچے مٹر کھانے کو دوں گا اور اس سے پتھر ڈھلواؤں گا اور خیوا والوں کے ہاتھ فروخت کر دوں گا جو تجھے معلوم ہے اپنے غلاموں پر بڑا ظلم کرتے ہیں، ضد مت کر، پیاری گل جان، اپنی صورت دکھا دے مجھے!''

اپنی ٹیڑھی عیاش انگلیوں سے اس نے گل جان کی نقاب ذرا کھسکائی۔ اس نے غصے سے سودخور کا ہاتھ جھٹک دیا۔ گل جان کا چہرہ ایک لمحہ کے لئے کھلا لیکن یہ خواجہ نصر الدین کے لئے کافی تھا جو ادھر سے اپنے گدھے پر گذر رہے تھے۔ لڑکی کا حسن ایسا جاں گداز تھا کہ خواجہ جصر الدین پر تقریباً غشی طاری ہو گئی۔ ان کی آنکھوں میں دنیا تاریک ہوگئی، وہ خود زرد پڑ گئے اور گدھے کی پیٹھ پر لڑکھڑائے۔ اُنہوں نے پریشان ہوکر اپنی آنکھیں ڈھک لیں۔ ان پر اچانک محبت نے بجلی گرادی۔ سنبھلنے میں ذرا وقت لگا۔

''اور یہ لنگڑا، کبڑا، کانا لنگور اس حسینہ کی محبت کا دم بھرتا ہے جس کا حسب دنیا میں بے مثال ہے!'' انہوں نے اپنے آپ سے کہا ''ارے، ہائے، میں نے اس کو کل پانی سے کیوں باہر نکالا؟ اب تو میں نے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی۔ لیکن دیکھا جائے گا، بدذات سودخور! ابھی تو تم کمہار اور اس کی بیٹی کے آقا نہیں ہو۔ ان کو ابھی ایک گھنٹے کی مہلت ہے اور خواجہ نصر الدین ایک گھنٹے میں اس سے زیادہ کر سکتا ہے جتنا کوئی اور ایک سال میں نہیں کر سکتا ہے۔''

اس دوران میں سودخور نے اپنے تھیلے سے ایک چوبی سورج کھڑی نکالی اور وقت دیکھا۔

''کمہار، میرے لئے اس درخت کے نیچے انتظار کر۔ میں ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ دیکھ، چھپنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ میں تجھے سمندر کی تہہ سے بھی ڈھونڈھ نکالوں گا اور تیرے ساتھ مفرور غلام جیسا برتاؤ کروں گا۔ اور تو حسین گل جان، میرے بات کے بارے میں سوچ، تیرے باپ کی قسمت کا انحصار اس پر ہے کہ تو میرے ساتھ کیسا برتاؤ کرتی ہے۔''

اور اپنے بدنما چہرے پر اطمینان بخش مسکراہٹ کے ساتھ وہ جوہریوں کے بازار سے اپنی نئی داشتہ کے لئے زیورات خریدنے روانہ ہوگیا۔

غم سے چور کمہار اپنی بیٹی کے ساتھ سڑک کے کنارے درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔

خواجہ نصر الدین ان کے پاس گئے:

''کمہار، میں نے فیصلہ سنا تھا۔ تمہارے اوپر بڑی مصیبت آن پڑی ہے لیکن شاید میں تمہاری مدد کر

سکوں۔''

''نہیں، مہربان'' کمہار نے ناامیدی سے جواب دیا''میں تمہارے پیوند لگے ہوئے کپڑوں سے ہی دیکھ سکتا ہوں کہ تم امیر نہیں ہو اور مجھے چار سو تانگوں کی ضرورت ہے۔ میرے دوست امیر نہیں ہیں، سب ٹیکسوں اور محصلوں سے تباہ غریب لوگ ہیں۔''

''بخارا میں میرے بھی دوست امیر نہیں ہیں'' خواجہ نصرالدین نے کہا''پھر بھی میں یہ رقم جمع کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''چار سو تانگے ایک گھنٹے میں!'' بڈھے نے اپنا سفید سر ہلایا اور تلخی سے مسکرایا۔''اجنبی، تم مجھے چڑھا رہے ہو۔ صرف خواجہ نصرالدین ہی یہ کارنامہ کر سکتے ہیں۔''

''اجنبی، ہم کو بچایئے، بچایئے!'' گل جان نے اپنے باپ سے لپٹتے ہوئے کہا۔

خواجہ نصرالدین نے جان گل کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ اس نے خواجہ کو نظر بھر کر دیکھا اور نقاب کے اندر ہی خواجہ نصرالدین نے ان آنکھوں کی پگھلی ہوئی چمک کو دیکھ لیا جن میں التجا اور امید تھی۔ خواجہ نصرالدین کی رگوں میں خون آگ کی طرح دوڑ گیا اور ان کی محبت ہزار گنی فروزاں ہو گئی۔ اُنہوں نے کمہار سے کہا:

''بڑے میاں، یہیں ٹھہرو، اگر میں سود خور کی واپسی سے پہلے چار سو تانگے نہ حاصل کر سکا تو میں اپنے آپ کو دنیا کا انتہائی قابلِ نفرت اور ذلیل آدمی سمجھوں گا۔''

وہ کود کر اپنے گدھے پر بیٹھے اور بازار کے مجمع میں غائب ہو گئے۔

13

اس وقت بازار میں صبح کے مقابلے میں، جبکہ انتہائی مصروف گھنٹوں میں ہر شخص اس ڈر سے بھاگتا دوڑتا، چیختا اور عجلت میں ہوتا ہے کہ کہیں موقع ہاتھ سے جاتا نہ رہے، سناٹا تھا اور مجمع بھی کم ہو گیا تھا۔ دوپہر ہو چلی تھی اور لوگ گرمی سے بچنے کے لئے چائے خانوں کو جا رہے تھے جہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنے نفع نقصان کا جائزہ لے سکتے تھے۔ گرم دھوپ سے سارا چوک بھرا ہوا تھا، سائے چھوٹے پڑ گئے تھے اور ایسے صاف نظر آ رہے تھے جیسے سخت زمین پر نقش ہوں۔ فقیر سایہ دار کونوں میں دبکے ہوئے تھے اور

گوریاں ان کے چاروں طرف اچھل اچھل کر دانے دنکے چگ رہیں تھیں اور خوشی خوشی چہچہا رہی تھیں۔

''اللہ بھلا کرے، بھلے آدمی ہم کو بھی کچھ دیتے جاؤ فقیر اپنے پھوڑے اور جسمانی عیب دکھا کر خواجہ نصرالدین سے بھیک کے لئے گھگھیا رہے تھے۔

انہوں نے جھڑک کر جواب دیا:

''الگ رہو، میں خود بھی تمہاری طرح غریب ہوں اور کوئی ایسی اسامی ڈھونڈ رہا ہوں جو مجھ کو چار سو تانے دے سکے۔''

فقیر نے یہ خیال کر کے کہ وہ ان کو چڑھا رہے ہیں خوب گالیاں دیں لیکن خواجہ نصرالدین اپنے خیالات میں ایسے منہمک تھے کہ ان کو ان باتوں کا جواب دینے کا موقع کہاں۔

چائے خانوں کی قطار میں انہوں نے ایک ایسا چائے خانہ چنا جو سب سے بڑا تھا اور جہاں مجمع بھی زیادہ تھا لیکن وہاں قیمتی قالین اور ریشمی گدے نہ تھے۔ وہ اس میں داخل ہوئے اور اپنے گدھے کو باہر باندھنے کے بجائے زینوں پر کھینچتے ہوئے لے آئے۔

لوگوں نے ان کا متحیر کن خاموشی سے خیر مقدم کیا۔ اس سے وہ ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ انہوں نے اپنی خورجین سے وہ مقدس کتاب نکالی جو دو دن پہلے ان کو بڈھے نے دی تھی اور اس کو کھول کر گدھے کے سامنے رکھ دیا۔

انہوں نے یہ کام بڑے اطمینان سے ذرا بھی مسکرائے بغیر کیا جیسے بالکل فطری بات ہو۔ چائے خانے میں جو لوگ تھے انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

گدھے نے چوبی فرش پر گونجدار آواز میں اپنے پیر پٹکے۔

''ابھی سے؟'' خواجہ نصرالدین نے ورق الٹتے ہوئے کہا ''تو نے نمایاں ترقی کی ہے۔''

اب چائے خانے کا تو ندیل اور زندہ دل مالک اپنی جگہ سے اٹھا اور خواجہ نصرالدین کے پاس آیا۔

''دیکھو، بھلے آدمی کیا یہ تمہارے گدھے کے لئے مناسب جگہ ہے؟ اور تم نے یہ مقدس کتاب گدھے کے سامنے کیوں کھول کر رکھی ہے؟''

''میں اس گدھے کو دینیات کی تعلیم دے رہا ہوں'' خواجہ نصرالدین نے اطمینان سے جواب دیا ''اب یہ مقدس کتاب ختم ہونے والی ہے پھر ہم شریعت کا مطالعہ کریں گے۔''

سارے چائے خانے میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ بہت سے لوگ اچھی طرح دیکھنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ چائے خانے کے مالک کی آنکھیں پھیلی اور منہ کھلا رہ گیا۔اس نے اپنی زندگی میں ایسا عجوبہ نہیں دیکھا تھا۔اس موقع پر گدھے نے پھر پیر پٹکے۔

''شاباش'' خواجہ نصرالدین نے ورق الٹتے ہوئے کہا''بہت اچھے،تھوڑا اور پڑھ لے تو تُو مدرسۂ عرب میں صدر معلم دینیات کی جگہ لے سکے گا۔صرف یہ ورق خود نہیں پلٹ سکتا ہے اور اس کو کسی کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔اللہ نے اس کو تیز فہم بنایا ہے اور یاد داشت بھی لاجواب ہے لیکن خدا نے اس کو انگلیاں نہیں دیں'' خواجہ نصرالدین نے چائے خانے کے مالک سے کہا۔

لوگ اپنی اپنی چائے چھوڑ کر قریب جمع ہو گئے اور چند لمحوں میں خواجہ نصرالدین کے گرد ایک بڑا مجمع ہو گیا۔

''یہ معمولی گدھا نہیں ہے!'' یہ بذاتِ خود امیر کی ملکیت ہے۔ایک دن امیر نے مجھے طلب کیا اور پوچھا: کیا تم میرے محبوب گدھے کو دینیات پڑھا سکتے ہو تا کہ وہ اتنا ہی جان جائے جتنا میں جانتا ہوں؟ لوگوں نے مجھے گدھا دکھایا، میں نے اس کی لیاقت کی جانچ کی اور جواب دیا:'اے تقدس مآب امیر! یہ لاجواب گدھا عقل و دانش میں آپ کے کسی وزیر سے کم نہیں ہے بلکہ آپ سے بھی۔ میں اس کو دینیات پڑھاؤں گا اور وہ اتنا ہی قابل ہو جائے گا جتنے آپ ہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ لیکن اس میں بیس سال لگیں گے۔'امیر نے حکم دیا کہ خزانے سے مجھے سونے کے پانچ ہزار تانگے دئے جائیں اور کہا:'گدھے کو لے جاؤ اور اسے پڑھاؤ۔لیکن میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر بیس سال ختم ہونے پر اسے دینیات کا علم نہ ہوا اور وہ مذہبی کتابیں حفظ نہ کر سکا تو میں تمہارا سر اڑا دوں گا!''

''تو پھر تم اپنے سر کو سلام کر لو!'' چائے خانے کے مالک نے کہا''کس نے سنا ہے کہ گدھا دینیات سیکھ سکتا ہے اور مذہبی کتابیں زبانی سنا سکتا ہے!''

''بخارا میں ایسے کافی گدھے ہیں'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا''میں یہ بھی بتا دوں کہ سونے کے پانچ ہزار تانگے اور اچھا گدھا روز روز نہیں ملتے۔اور رہا میرا سر تو اس کے لئے فکر نہ کرو کیونکہ بیس سال میں ہم میں سے کوئی نہ کوئی مرے گا ضرور۔یا تو میں یا امیر یا پھر گدھا۔اس وقت یہ پرکھنے کا وقت گذر چکا ہو گا کہ ہم تینوں میں سے دینیات کا بڑا عالم کون ہے۔''

چائے خانہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ چائے خانے کا مالک تو ہنسی سے بے قابو ہو کر نمدوں پر گر پڑا اور اتنا ہنسا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھا۔

''یہ سنا آپ نے'' اس نے گھٹے ہوئے گلے سے خرخراتے ہوئے کہا'' اس وقت یہ پرکھنے کا وقت گزر چکا ہو گا کہ کون دینیات کا بڑا عالم ہے!'' یقیناً ہنسی سے اس کا پیٹ پھٹ جاتا اگر اچانک اس کو خیال نہ آ گیا ہوتا۔

''ٹھہرئے، ٹھہرئے!'' اس نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لئے ہاتھ ہلائے ''تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو، دینیات کے استاد؟ کیا تم خود خواجہ نصرالدین ہو سکتے ہو؟''

''کیا یہ کوئی حیرت کی بات ہے؟ تمہارا قیاس صحیح ہے۔ میں خواجہ نصرالدین ہوں۔ بخارا شریف کے شہریو، سلام علیکم!''

ذرا دیر کے لئے ایسی خاموشی چھا گئی جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ یک دم ایک پرمسرت آواز نے خاموشی توڑ دی:

''خواجہ نصرالدین!''

''خواجہ نصرالدین! خواجہ نصرالدین!'' یکے بعد دیگرے ہر ایک کی زبان پر آتا گیا۔ یہ آواز دوسرے چائے خانوں تک پہنچی اور پھر سارے بازار میں گونج گئی۔ ہر جگہ یہ آواز پھیل کر گونج رہی تھی:

''خواجہ نصرالدین! خواجہ نصرالدین!''

لوگ ہر طرف سے دوڑ دوڑ کر اس چائے خانے آنے لگے۔ ان میں ازبک، تاجک، ترکمان، عرب، ترک، جارجیائی، آرمینائی، اور تاتاری سبھی تھے۔ وہ اپنے محبوب خواجہ نصرالدین کو، مشہور، زندہ دل اور ہوشیار خواجہ نصرالدین کو زور زور سے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

مجمع بڑھتا گیا۔

کہیں سے جئی کا ایک بورا، ایک گٹھا گھاس اور صاف پانی کی بالٹی بھی آ گئی۔ یہ سب چیزیں گدھے کے سامنے پیش کر دی گئیں۔

''خوش آمدید، خواجہ نصرالدین!'' مجمع نے کہا'' آپ کہاں گھومتے پھرتے رہے، ہمیں کچھ بتائیے خواجہ نصرالدین!''

وہ برآمدے کے کنارے تک آئے اور مجمع کے سامنے کافی خم ہو کر بولے:

''بخارا کے شہریو، تم کو سلام! دس سال تک میں تم سے جدا رہا اور اب میرا دل اس ملاپ سے باغ باغ ہے۔ تم نے مجھ سے کچھ بتانے کو کہا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ میں اس کو گا کر سناؤں!''

انہوں نے ایک بڑا سا مٹی کا گھڑا لے لیا، اس کا پانی انڈیل دیا اور اس کو ہاتھ سے بجاتے ہوئے گانا شروع کیا:

باج باج، گھڑے رے باج
اور کرامیر کے گن گان
کہہ سارے سنسار سے کتھا
ہمرے سندر جیون کی، امیر کے راج

گھڑا بھن بھنایا، ٹھن ٹھنایا
اور آ کر تاؤ میں گھڑ گھڑایا
گرما کر گھوما چاروں اور
اونچے سر میں سب سے فرمایا

ہاں، اونچے سر میں فرمایا:
دیکھو! یہ کمہار نیاز ہمارا
برتنوں کا استاد نیارا
لیکن روزی سے بالکل ہارا
پیٹ سے ٹوٹا پیسے کا مارا
اور جعفر کبڑے کو نیند نہ آئے
ڈرا اپنی سونے کی دیگوں کا ستائے
خزانہ امیر کا بھی سونے سے اٹ آئے

اس کی گنتی بھیا کون تمہیں بتائے

اک دن بوڑھے نیاز پہ جو بپتا آئی
برق اندازوں نے کی چپکے سے چڑھائی
اور کچھ نہ سنی اس کی دھائی
پیشی امیر کی عدالت میں آئی
پیچھے پیچھے جعفر کبڑا دوڑا آیا
منحوس شکل اپنی سرکار میں لایا

ہم ظلم کب تک برداشت کریں گے
کہہ رے گھڑے، سب تو سنیں گے
تیری مٹی کی جیبھ سے سچی پیارے
اس سے سب نیاز کا دوش سنیں گے

گھڑا اونچے سُر میں بولا
سارا ماجرا سچ سچ کھولا
دوش تو ہے کمہار کا سارا
جو اس جال میں آیا
اب تو وہ ہے جال میں مکڑے کے
اور مکڑے نے اس کو اپنا داس بنایا
نیاز نے دے امیر کی دھائی
آنسو بھر کر آنکھ قدموں سے لگائی
پھر بولا ''ساری دنیا کو ہے گیان

امیر اپنا مہربان، مہان
اور وہ دے گا مجھ کو امان''
''مت رو بڈھے'' بولا امیر والا شان
''میں کرتا ہوں تجھ کو پورا گھنٹہ دان
ساری دنیا کو ہے گیان
میں ہوں مہربان، مہان''

ہم ظلم کب تک برداشت کریں گے
کہہ رے گھڑے، سب تو سنیں گے

گھڑا اونچے سُر میں بولا
سارا ماجرا سچ سچ کھولا
سچ مچ وہ ہے دیوانہ
جس نے امیر کو منصف جانا
ایسا نیچ ہے مشکل پانا
سر اُس کا کوڑا خانہ

کب تک ہم یہ نراج سہیں گے؟
کب تک ہم مریں کھپیں گے؟
کب لوگ اٹھیں گے؟
کب خوشی سے گلے ملیں گے؟

گھڑا اونچے سُر میں بولا

سارا ماجرا سچ سچ بولا

''ابھی تو امیر ہے بڑا بلوان

لیکن گرے گا منہ کے بل آن

تب یہ دیکھ کر دن بیتیں گے

برس برس میں دن آئے گا

جب وہ مٹی کے گھڑے سمان

ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا!''

گھڑے کو سر سے اونچا اٹھا کر خواجہ نصرالدین نے اس کو زمین پر پٹک دیا اور اس کے سینکڑوں ٹکڑے ہو گئے۔ مجمع کے شور کے اوپر اپنی آواز بلند کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''اچھا، ہم سب کو چاہئے کہ ہم سود خور اور امیر کے رحم سے نجات دلانے کے لئے نیاز کمہار کی مدد کریں! تم تو خواجہ نصرالدین کو جانتے ہو! ان کو دیا ہوا قرض کبھی ڈوبتا نہیں! تھوڑے دن کے لئے ان کو چار سو تانگے کون دے گا؟''

ایک سقہ جو ننگے پیر تھا سامنے آیا:

''خواجہ نصرالدین! ہمارے پاس پیسہ کہاں؟ ہمیں بہت بھاری ٹیکس ادا کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن میرے پاس ایک پٹکہ ہے، تقریباً بالکل نیا، اس سے کچھ ہاتھ لگ سکتا ہے۔''

اور اس نے اپنا پٹکہ خواجہ نصرالدین کے قدموں پر ڈال دیا۔ مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ ٹوپیاں، جوتے، پٹکے، رومال، حتیٰ کہ قبائیں تک خواجہ نصرالدین کے قدموں پر برسنے لگیں۔ خواجہ نصرالدین کی مدد ہر ایک اپنی عزت خیال کرتا تھا۔ چائے خانے کا موٹا مالک اپنی دو بہترین چائے دانیاں اور تانبے کی ایک کشتی لے آیا۔ اس نے اپنی اس فیاضی کے لئے دوسروں کی طرف فخر سے دیکھا۔ تحفوں کا انبار بڑھتا جا رہا تھا۔ خواجہ نصرالدین نے اپنی پوری طاقت سے چلا کر کہا:

''کافی ہے، کافی، بخارا کے فیاض شہریو! کافی ہے۔ سن رہے ہو نا؟ زین ساز اپنی زین واپس لے لو۔ بس کافی ہے، میں کہتا ہوں۔ کیا تم اپنے خواجہ نصرالدین کو پرانے کپڑوں کا بیوپاری بنا دینا چاہتے ہو؟

اب نیلام شروع کرتا ہوں۔ یہ رہا ستے کا پٹکہ۔ جو اسے خریدے گا اسے پیاس کبھی نہیں ستائے گی۔ آؤ، آؤ، سستا مال ہے! یہ رہے کچھ پرانے پیوند لگے جوتے۔ کم از کم یہ دو بار تو ضرور مکہ شریف کا سفر کر چکے ہیں۔ جوان کو پہنے گا وہ یہی محسس کرے گا کہ وہ زیارت کے لئے جا رہا ہے۔ یہ رہے چاقو، ٹوپیاں، قبائیں اور جوتے! آؤ، آؤ سستا مال ہے، کوئی طے توڑ کی بات نہیں ہے۔ وقت بہت قیمتی ہے!''

لیکن وزیر اعظم بختیار وفادار رعایا کی برابر فکر رکھتا تھا اور اس نے بڑی محنت سے بخارا میں ایسا انتظام کیا تھا کہ لوگوں کی جیب میں ٹکا بھی ہو رہے اور سب کا سب امیر کے خزانے میں پہنچ جائے۔ خواجہ نصرالدین کی یہ سب تعریف بے سود ثابت ہوئی۔ کوئی خریدار نہ ملا۔

14

ٹھیک اسی وقت اتفاق سے جعفر سودخور کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس کی تھیلی سونے چاندی کے زیورات سے بھری ہوئی تھی جو اس نے جوہریوں کے بازار سے گل جان کے لئے خریدا تھا۔

حالانکہ ایک گھنٹے کی مدت ختم ہو چکی تھی اور سودخور اپنی عیاشانہ خواہشات سے چور جلدی جلدی جا رہا تھا لیکن جب اس نے خواجہ نصرالدین کو سستا مال بیچتے سنا تو لالچ غالب آیا۔

سودخور کو دیکھتے ہی سارا مجمع کھسک گیا کیونکہ ہر تیسرا آدمی اس کا ضرور قرض دار تھا۔

جعفر نے خواجہ نصرالدین کو پہچان لیا۔

''اچھا تو یہ تم ہو، جس نے مجھ کو کل پانی سے نکالا تھا؟ تم یہاں کاروبار کرتے ہو؟ اتنا سامان تم کو بیچنے کے لئے کہاں سے مل گیا؟''

عزت مآب جعفر! آپ کو یاد نہیں کہ کل آپ نے مجھے آدھا تانگہ دیا تھا؟'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا ''اور میں نے اس سے پیسہ بنایا ہے۔ کام اور قسمت نے میرے کاروبار کا ساتھ دیا۔''

''اور تم نے ایک ہی دن میں یہ سارا سامان جمع کر لیا؟'' سودخور نے حیرت سے کہا ''واقعی میرے پیسے نے تمہیں بڑی برکت دی! اچھا تو سب سامان کے لئے تم کیا مانگتے ہو؟''

''چھ سو تانگے۔''

''پاگل ہو گئے ہو؟ تمہیں اپنے محسن سے اتنی بڑی رقم مانگتے شرم آنی چاہئے! میری بدولت ہی یہ

خوش حالی آئی ہے؟ دوسو تانگے یہ ہیں میرے دام۔''

''پانچ سو'' خواجہ نصرالدین نے کہا'' آپ کا لحاظ کر کے، معزز جعفر، پانچ سو تانگے!''

''ارے ناشکرے! ایک بار پھر یاد دلاتا ہوں۔ کیا یہ خوشحالی میری بدولت نہیں ہے؟''

''اور مہاجن، کیا تمہاری زندگی میری وجہ سے نہیں بچی؟'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا'' یہ سچ ہے کہ تم نے مجھ کو آدھا تانگہ اپنی جان بچانے کے لئے دیا تھا لیکن تمہاری زندگی اس سے زیادہ قیمت نہیں رکھتی اس لئے مجھے برا نہیں لگا۔ اگر تمہیں خریدنا ہے تو ٹھیک دام لگاؤ۔''

''تین سو!''

خواجہ نصرالدین کچھ نہ بولے۔

سودخور رکا۔ اس نے تجربے کار نگاہ سے سامان کو آنکا اور یہ اطمینان کر کے کہ یہ سب قبائیں، جوتے اور ٹوپیاں کم از کم سات سو تانگے کی ہوں گی بولی بڑھانے کا فیصلہ کیا:

''ساڑھے تین سو۔''

''چار سو۔''

''پونے چار سو۔''

''چار سو۔''

خواجہ نصرالدین اپنی ضد پر اڑ گئے۔ کئی مرتبہ سودخور نے یہ بناوٹ کی کہ وہ جا رہا ہے لیکن پھر لوٹ آیا اور ایک ایک تانگہ بڑھاتا رہا یہاں تک کہ آخر وہ راضی ہو گیا۔ سودا ہو گیا۔ طوعاً و کرھاً سودخور نے رقم گنی۔

''خدا کی قسم، میں مال سے دگنی رقم دے رہا ہوں۔ لیکن میری فطرت ہی یہی ہے کہ مہربانی کر کے نقصان اٹھاؤں۔''

''یہ سکہ جعلی ہے'' خواجہ نصرالدین نے بیچ میں لقمہ دیا'' اور چار سو تانگے بھی نہیں ہیں۔ صرف تین سو اسی تانگے ہیں۔ نگاہ کمزور ہو گئی ہے، معزز جعفر۔''

سودخور کو مجبوراً بیس تانگے اور دینے پڑے اور جعلی سکہ بھی بدلنا پڑا۔ سودا ہونے کے بعد اس نے ایک قلی چوتہائی تانگے پر لیا، اس پر سارا سامان لادا اور اپنے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ بیچارا قلی تو سامان کے بوجھ سے گرا جا رہا تھا۔

''ہم ایک ہی طرف جا رہے ہیں'' خواجہ نصر الدین نے کہا۔

خواجہ گل جان کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھے اور تیزی سے آگے چل رہے تھے۔ سود خور اپنے لنگڑے پن کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔

تم کہاں جلدی جلدی جا رہے ہو؟'' سود خور نے آستین سے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''جہاں تم جا رہے ہو'' خواجہ نصر الدین نے جواب دیا، ان کی سیاہ آنکھوں میں شرارت کی جھلک تھی

''معزز جعفر، تم اور میں ایک ہی جگہ اور ایک ہی کام سے جا رہے ہیں۔''

''لیکن تم میرے کام کے بارے میں نہیں جانتے ہو'' سود خور نے کہا ''اگر تم جانتے ہوتے تو مجھ پر رشک کرتے۔''

اس بات کے اندر جو مطلب پنہاں تھا اس کو خواجہ نصر الدین سمجھ گئے اور انہوں نے زندہ دلی سے ہنس کر جواب دیا:

''لیکن مہاجن، اگر تمہیں میرے کام کا پتا ہوتا تو تم مجھ پر دس گنا رشک کرتے۔''

جعفر نے گستاخانہ جواب کو محسوس کر کے گھورا اور کہا ''تمہاری زبان بہت تیز ہے۔ تمہارے ایسے آدمیوں کو مجھ سے باتیں کرتے ڈرنا چاہئے۔ بخارا میں چند ہی ایسے لوگ ہیں جن پر میں رشک کر سکتا ہوں۔ میں دولت مند ہوں اور میری مرضی کسی طرح سے پابند نہیں ہے۔ میں نے بخارا کی حسین ترین دوشیزہ کی خواہش کی اور آج وہ میری ہوگی۔''

اسی وقت ایک آدمی ٹوکری میں بیریاں بیچتا ہوا ادھر سے گزرا۔ خواجہ نصر الدین نے ایک لمبے ڈنٹھل کی بیری ٹوکری سے چن کر سود خور کو دکھائی اور بولے:

''معزز جعفر، میری بات سنو___ کہتے ہیں کہ ایک دن ایک گیدڑ نے درخت میں اونچے پر ایک بیری دیکھی اور اس نے اپنے آپ سے کہا 'میں تو اس کو کھائے بغیر چین نہیں لوں گا۔' تو اس نے درخت پر چڑھنا شروع کیا اور دو گھنٹے تک چڑھتا رہا اور اس کے شاخوں سے بہت سے کھرونچے بھی آ گئے۔ اور ٹھیک اس وقت جب وہ بیری کھانے جا رہا تھا اور منہ بھاڑ سا کھول چکا تھا اچانک ایک باز جھپٹا اور بیری لے کر اڑ گیا۔ اس کے بعد گیدڑ کو اترنے میں دو گھنٹے اور لگے اور اس کے بدن پر اور زیادہ خراشیں آ گئیں۔ وہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا: 'ہائے، میں بیری کے لئے کیوں درخت پر چڑھا کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ بیریاں

درختوں پر گیدڑوں کے لئے نہیں لگتی ہیں!''

''تم احمق ہو'' سودخور نے حقارت سے کہا ''تمہارے قصے کا کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔''

''گہرے معنی فوراً سمجھ میں نہیں آتے'' خواجہ نصرالدین جھٹ سے بولے۔

بیری اس کے کان پیچھے لٹک رہی تھی اور ڈنٹھل ٹوپی میں دبا ہوا تھا۔

سڑک کی موڑ آئی۔ موڑ کی دوسری طرف کمہار اور اس کی بیٹی پتھروں پر بیٹھے تھے۔

کمہار کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جن میں امید کی روشنی جھلکی تھی دھیمی پڑھ گئیں کیونکہ اس نے سوچا کہ اجنبی رقم نہیں حاصل کر سکا۔ گل جان نے ہلکی آہ کے ساتھ پیٹھ موڑ لی۔

''ابا، ہم تباہ ہو گئے!'' اس نے ایسی درد بھری آواز میں کہا کہ پتھر بھی اس کو سن کر پگھل جاتا۔ لیکن سودخور کا دل تو پتھر سے بھی سخت تھا۔ صرف ظالمانہ فتح اور عیاشی کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔ وہ بولا:

''کمہار، مدت ختم ہو گئی۔ اب سے تو میرا غلام ہے اور تیری بیٹی بھی میری کنیز اور داشتہ۔''

خواجہ نصرالدین کو چرکا لگانے اور ذلیل کرنے کے لئے اس نے مالکانہ غرور کے ساتھ لڑکی کے چہرے سے نقاب ہٹا دی۔

''دیکھو، کیا یہ حسین نہیں ہے؟ آج میں اس کے ساتھ ہم بستر ہوں گا۔ اب بتاؤ کون کس پر رشک کرے گا؟''

''واقعی حسین ہے'' خواجہ نصرالدین نے کہا ''لیکن تمہارے پاس کمہار کا پرونوٹ ہے؟''

''ضرور ہے، پرونوٹ کے بغیر کاروبار کیسے ممکن ہے؟ سب آدمی دھوکے باز اور چور ہوتے ہیں۔ یہ رہا پرونوٹ، اس میں قرض کی رقم اور ادائیگی کی تاریخ درج ہے۔ نیچے کمہار کی انگوٹھا نشانی ہے۔''

اس نے پرونوٹ خواجہ نصرالدین کو دکھایا۔

''پرونوٹ تو ٹھیک ہے'' خواجہ نصرالدین نے تصدیق کی ''اچھا، اب اس پرونوٹ کے مطابق اپنی رقم لو۔ آپ حضرات ذرا ٹھہر جایئے اور گواہ بن کر جایئے'' انہوں نے کچھ راہ گیروں کی طرف مڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

انہوں نے رسید کے دو ٹکڑے کر دئے، پھر چار اور پھر اس کے پرزے پرزے چاک کر کے ہوا میں

بکھیر دئے۔اب انہوں نے پٹکہ کھولا اور سودخور کو وہ سب رقم واپس لوٹا دی جس ذرا دیر پہلے اس سے لی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کمہار اور اس کی بیٹی حیرت اور خوشی سے جم کر پتھر ہو گئے ہیں اور سودخور کا بھی غصے سے یہی حال تھا۔گواہ ایک دوسرے کو آنکھ مار رہے تھے۔وہ نفرت انگیز سودخور کی پریشانی پر ہنس رہے تھے اور اس سے لطف اٹھا رہے تھے۔

خواجہ نصرالدین نے کان کے پیچھے سے بیری نکالی اور اپنے منہ میں رکھ لی۔پھر سودخور کی طرف آنکھ مار کر اپنے ہونٹ چاٹے۔

''سودخور کے بھدے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ کی لہر دوڑ گئی،اس کے ہاتھ چنگلوں کی طرح بھنچ گئے،اس کی کانی آنکھ غصے سے ابل پڑی اور اس کے کوبڑ میں لرزش ہوئی۔

کمہار اور گل جان نے التجا کی:

''اجنبی،ہمیں اپنا نام تو بتا دو تا کہ ہم تمہارے لئے دعا کر سکیں۔''

''ہاں!'' سودخور نے جس کا منہ کف سے بھرا تھا اس بات پر صاد کیا۔''اپنا نام بتا دو تا کہ میں اس پر لعنت بھیج سکوں!''

خواجہ نصرالدین کا چہرہ چمک اٹھا۔انہوں نے صاف اور زور کی آواز میں جواب دیا:

''بغداد میں اور طہران میں،استنبول اور بخارا میں___ ہر جگہ مجھ کو لوگ ایک ہی نام سے جانتے ہیں___ خواجہ نصرالدین!''

سودخور پیچھے ہٹ گیا۔وہ زرد پڑ گیا تھا:

''خواجہ نصرالدین!''

ڈر کے مارے وہ اپنے قلی کو لے کر رفو چکر ہو گیا۔

جہاں تک دوسروں کا تعلق تھا انہوں نے''خواجہ نصرالدین! خواجہ نصرالدین!'' کے نعروں سے ان کا استقبال کیا۔گل جان کی آنکھیں نقاب کے اندر چمک رہی تھیں۔کمہار کے حواس ابھی تک درست نہیں ہوئے تھے اور وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا اور ہاتھ ہلا رہا تھا۔

15

امیر کی عدالت ابھی جاری تھی۔ جلاد کئی بار بدلے جا چکے تھے۔ جسمانی سزا پانے والے بدقسمت لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ دو مصیبت زدہ ستونوں پر چیخ رہے تھے، تیسرے کا خود آلود سر زمین پر پڑا تھا۔ لیکن لوگوں کی چیخ پکار اور آہیں اونگھتے ہوئے امیر کا کانوں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ وہ درباری خوشامدیوں کے کورس میں ڈوب جاتی تھیں، تعریف کرتے کرتے جن کے گلے بیٹھ گئے تھے۔ اپنی تعریفوں میں وہ اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ وزیرِ اعظم دوسرے وزرا اور ارسلان بیگ کو بھی شامل کر لیں۔ حتیٰ کہ وہ مورچھل بردار اور حقہ بردار کو بھی نہیں بھولتے تھے کیونکہ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ ہر شخص کو خوش رکھنا ہی سلامتی کی ضمانت ہے، کچھ کو اس لئے کہ وہ کارآمد ہو سکتے ہیں اور دوسروں کو اس لئے کہ وہ خطرناک نہ بن سکیں۔

کچھ دیر سے ارسلان بیگ ایسی آوازوں کی عجیب بھین بھناہٹ بے چینی سے سن رہا تھا جو دور سے آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے دو بہت لائق اور تجربہ کار جاسوسوں کو بلایا اور کہا ''جا کر معلوم کرو کہ لوگوں میں اتنا جوش و خروش کیوں ہے۔ جاؤ اور فوراً مجھے خبر دو۔''

جاسوس روانہ ہو گئے۔ ایک فقیر کے بھیس میں تھا اور دوسرا درویش بن گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ لوٹیں سود خور بھاگتا ہوا آیا۔ وہ زرد تھا اور اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ خود اپنی قبا کے دامنوں میں پھنس رہا تھا۔

''کیا ہوا، معزز جعفر؟'' ارسلان بیگ نے گھبرا کر پوچھا۔

''مصیبت آ گئی!'' سود خور نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے ''معزز ارسلان بیگ، ہمارے اوپر بڑی بلا نازل ہو گئی ہے۔ خواجہ نصرالدین ہمارے شہر میں ہے۔ میں نے ابھی ابھی اس کو دیکھا ہے اور اس سے باتیں کی ہیں۔''

ارسلان بیگ کی آنکھیں نکل پڑیں۔ چبوترے کے زینے اس کے قدموں تلے چرچرا رہے تھے۔ وہ دوڑ کر گیا اور اپنے نیند میں ماتے آقا کے کان میں کچھ کہا۔

امیر اس طرح چونک کر تخت پر سیدھا ہوا جیسے اس کے کسی نے سوئی چبھو دی ہو۔

''جھوٹ کہتے ہو!'' وہ چیخا۔ اس کا چہرہ خوف اور غصے سے بگڑ گیا ''یہ جھوٹ ہے۔ خلیفہ بغداد نے

مجھے چند ہی دن ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کا سر قلم کروا دیا! ترکی کے سلطان نے لکھا ہے کہ اُنہوں نے اسے ستون پر چڑھوا کر مار دیا! شاہ ایران نے خود اپنے قلم سے لکھا کہ انہوں نے اس کو پھانسی دلوادی! خان خیوا نے عام اعلان کیا ہے کہ انہوں نے زندہ جان اس کی کھال کھنچوالی! یہ ملعون خواجہ نصر الدین کیسے چار بادشاہوں کے ہاتھ سے بچ کر نکل سکتا ہے؟''

خواجہ نصر الدین کا نام سنتے ہی وزرا اور عمائدین کے چہرے فق ہو گئے۔ مور چھل بردار اچھل پڑا اور اس کے ہاتھ سے مور چھل گر گئی۔ حقے بردار کا گلا دھوئیں سے گھٹ گیا اور وہ کھانسنے لگا اور خوشامدیوں کی زبانیں مارے خوف کے تالو سے چپک گئیں۔

''وہ یہاں ہے'' ارسلان بیگ نے دہرایا۔

''تم جھوٹے ہو!'' امیر نے چلا کر شاہی ہاتھ سے اس کے ایک زوردار چانٹا جڑ دیا ''تم جھوٹ کہتے ہو۔ لیکن اگر وہ واقعی یہاں ہے تو وہ بخارا میں کیسے داخل ہوا اور تمہارے پہرے داروں اور تم سے کیا فائدہ ہے؟ تو پھر وہی ہے جس نے روت کو بازار میں سارا ہنگامہ برپا کیا! وہ لوگوں کو میرے خلاف اکسانا چاہتا تھا جبکہ تم سو رہے تھے اور کچھ نہیں سن رہے تھے!''

امیر نے ارسلان بیگ کو پھر چانٹا مارا۔ ارسلان بیگ نے کافی جھک کر امیر کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا:

''میرے آقا، وہ یہاں ہے۔ آپ سن نہیں رہے ہیں؟''

دور کی گڑگڑاہٹ رفتہ رفتہ ڑھ اور پھیل رہی تھی جیسے کوئی زلزلہ آ رہا ہو۔ اور پھر عدالت کے چاروں طرف مجمع نے بھی عام ہیجان میں مبتلا ہو کر ہنگامہ شروع کر دیا۔ پہلے تو آہستہ اور مدھم آواز میں، پھر زور سے یہاں تک کہ امیر کو محسوس ہونے لگا جیسے چبوترہ اور اس کا مرصع تخت ہل رہا ہے۔ اچانک آوازوں کی بھن بھناہٹ اور گھن گرج سے ایک نام ابھرا، جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر شخص کی زبان پر تھا:

''خواجہ نصر الدین!''

''خواجہ نصر الدین!''

پہرے دار دھواں دھار مشعلیں لئے ہوئے توپوں کی طرف دوڑے۔ امیر کا چہرہ جذبات سے بھرا

ہوا تھا۔

''برخواست کرو!'' وہ چیخا''محل واپس چلو''

اپنے مرصع لباس کے دامن سمیٹتے ہوئے وہ عجلت کے ساتھ محل واپس گیا۔اس کے پیچھے خالی پالگی لئے ہوئے کڑکھڑاتے اور بھاگتے ہوئے ملازمین تھے۔آگے نکل جانے کی کوشش میں ایک دوسرے کی ڈھکیلتے ہوئے خوف زدہ وزیر، جلاد، طائفے ، پہرے دار، مورچھل اور حقہ بردار سبھی اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔جن کے جوتے اتر گئے تھے وہ انہیں اٹھانے کے لئے بھی نہیں رک رہے تھے۔

صرف ہاتھی اپنے روایتی وقار کے ساتھ سست رفتاری سے چل رہے تھے کیونکہ امیر کے عملے میں ہونے کے باوجود ان کو آدمیوں سے ڈر نہیں لگتا تھا۔

پیتل سے منڈھے ہوئے محل کے بھاری پھاٹک امیر اور اس کے درباریوں کے داخلے کے بعد جھنکار کے ساتھ بند ہو گئے۔

اس دوران میں سارے بازار میں جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا خواجہ نصر الدین کے نام کی گونج سنائی دے رہے تھی۔

حصہ دوم

''یہ عجیب واقعات ہیں، کچھ تو میری موجودگی ہی میں ہوئے اور
کچھ مجھ سے معتبر اشخاص نے بیان کئے۔''

عثمان ابن منقض
''کتاب پند و نصیحت''

16

بہت ہی قدیم زمانے سے بخارا کے کمہار شہر کے مشرقی پھاٹک کے قریب، ایک بڑے مٹی کے ٹیلے کے اطراف میں بس گئے تھے اور ان کے لئے اس جگہ سے کوئی بہتر جگہ ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ چکنی مٹی قریب تھی اور ایک نالی سے جو شہر کی فصیل کے برابر چلی گئی تھی پانی بھی افراط سے مل جاتا تھا۔ کمہاروں کے داداؤں، پردداداؤں، اور نگڑ داداؤں نے اس ٹیلے کو آدھا کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر مٹی سے بناتے تھے، برتن مٹی سے بناتے تھے اور پھر خود بھی اعزا و اقربا کو ماتم کنان چھوڑ کر اسی مٹی میں آرام کرنے چلے جاتے تھے۔ اور اس کے برس ہا برس بعد متعدد بار ایسا ہوتا رہا کہ کسی کمہار نے کوئی برتن یا صراحی بنائی، دھوپ میں سکھائی اور آگ میں پکائی اور اس کو صاف اور زوردار کھن کھناہٹ پر متحیر رہ گیا لیکن اسے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ کسی بہت زمانے پہلے کے بزرگ نے، جو اپنے آنے والی نسلوں کی بہبودی اور اپنے برتنوں کی بکری کی بڑی فکر رکھتا تھا، اس مٹی کو اپنی خاک کے ایک ذرے سے پاکیزہ بنایا ہے تاکہ اس میں خالص چاندی جیسی کھنک پیدا ہو سکے۔

یہاں ایک زبردست اور پرانے چنار کے درخت کے سائے میں بالکل نالی کے کنارے کمہار نیاز کا گھر تھا۔ ہوا میں پتیوں کی سرسراہٹ ہوتی تھی، پانی قلقل کرتا بہتا تھا اور باغیچے میں صبح سے رات تک حسین گل جان کے نغمے گونجتے تھے۔

خواجہ نصر الدین نے نیاز کے گھر رہائش اختیار کرنے سے انکار کر دیا۔

''نہیں، نیاز'' انہوں نے کہا ''میں تمہارے گھر میں گرفتار ہوسکتا ہوں۔ میں یہاں سے قریب ہی کسی محفوظ جگہ میں رات کو رہوں گا جو میں نے تلاش کر لی ہے۔ دن میں آ کر میں تم کو کام میں مدد دوں گا۔''

اور انہوں نے یہی کیا۔ ہر صبح سورج نکلنے سے پہلے وہ نیاز کے یہاں پہنچ جاتے تھے اور چاک پر بڈھے کمہار کے ساتھ کام کرنے لگتے تھے۔ دنیا میں کوئی ایسا پیشہ نہ تھا جس سے خواجہ نصر الدین واقف نہ ہوں۔ کمہار کا پیشہ اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی بنائی ہوئی صراحیوں میں چکناپن اور لمک ہوتی تھی۔ ان میں انتہائی گرمی کے موسم میں بھی پانی برفر کی طرح ٹھنڈا رہتا تھا۔ پہلے بڈھا کمہار، جس کی نگاہ چند برسوں سے کمزور پڑنے لگی تھی، مشکل سے روزانہ پانچ چھ گھڑے بنا پاتا تھا لیکن اب اس کے یہاں تیس چالیس اور کبھی کبھی پچاس تھڑوں اور صراحیوں کی لمبی قطار دھوپ میں سوکھتی نظر آتی۔ بازار کے دن جب بڈھا گھر لوٹتا تو اس کی تھیلی بھری ہوتی اور رات کو پلاؤ کی اشتہا انگیز مہک اس کے گھر سے ساری سڑک پر پھیل جاتی۔ پڑوسی بڑھے کی خوشحالی پر خوش ہوتے اور کہتے:

''آخر کار نیاز کے دن پھرے اور غریبی نے اس کا پنڈ چھوڑا، خدا کرے یہ ہمیشہ کے لئے ہو!''

''کہتے ہیں کہ اس نے ایک اور کاریگر ملازم رکھا ہے جو لاجواب کسگر ہے۔''

''ہاں میں نے بھی یہ سنا ہے۔ ایک دن نیاز کے یہاں گیا تا کہ اس کے کاریگر کو دیکھ سکوں لیکن باغیچے کے پھاٹک میں داخل ہوا ہی تھا کہ کاریگر اٹھا اور چلا گیا اور پھر سامنے نہیں آیا۔''

''ہاں، بڈھا اپنے کاریگر کو چھپاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہوگا کہ ہم کہیں اس کے ماہر کاریگر کو پھسلا نہ لیں۔ عجیب آدمی ہے! جیسے ہم سب کمہار بالکل بے حیا ہیں اور بڈھے کی قسمت خراب کرنے پر تلے ہیں جو ابھی تو جاگی ہے۔''

اس طرح پڑوسیوں نے معاملے کو آپس میں نبٹ لیا اور کسی کے دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ بڈھے نیاز کا کاریگر خود خواجہ نصر الدین تھے۔ سب کو قبعی یقین تھا کہ خواجہ نصر الدین بہت دن ہوئے بخارا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ انہوں نے خود یہ افواہ پھیلائی تھی تا کہ جاسوس دھوکے میں آ جائیں اور تلاش و جستجو میں ڈھیل ڈال دیں۔ اور ان کا مقصد حاصل ہو گیا تھا۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملا کہ رات کو گشت کرنے والے پہرے دار اب بخارا کے باشندوں کو مشعلوں کی روشنی اور ہتھیاروں کی جھنکار سے پریشان نہیں کرتے تھے۔

ایک دن بڈھا نیاز خواجہ نصرالدین کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا اور کراہتا رہا اور پھر بولا:

''خواجہ نصرالدین تم نے مجھے غلامی سے اور میرے بیٹی کو بے عزتی سے بچایا، تم میرے ساتھ کام کرتے ہو اور مجھ سے دس گنا۔ یہ رہے ساڑھے تین سو تانگے خالص منافع کے۔ یہ مجھ کو ان برتنوں کی بکری سے ملے ہیں جب سے تم نے میرے مدد کرنی شروع کی۔ یہ رقم لو۔ یہ تو تمہارا حق ہے۔''

خواجہ نصرالدین اپنا چاک روک کر بڈھے کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

''نیاز میاں، تمہارا دماغ کچھ چل گیا ہے جو ایسی عجیب باتیں کرتے ہو۔ تم مالک ہو اور میں تمہارا کاریگر۔ اگر تم مجھے منافع کا دسواں حصاہ یعنی 35 تانگے دے دو تو میرے لئے بہت کافی ہوں گے۔''

نیاز کی پرانی تھیلی لے کر انہوں نے 35 تانکے گنے اور ان کو اپنی جیب میں رکھا اور باقی بڈھے کو واپس کرنے لگے۔ لیکن نیاز نے رقم لینے سے قطعی انکار کر دیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے، خواجہ نصرالدین۔ یہ رقم تمہاری ہے۔ اگر ساری نہیں لیتے تو کم از کم آدھی تو لے لو۔''

خواجہ نصرالدین کو غصہ آ گیا۔

''نیاز، اپنی تھیلی ہٹاؤ، دنیا میں جو ریت چلی آتی ہے اس کو نہ بگاڑو۔ اگر سب مالک اپنے کاریگروں سے آدھے کا ساجھا لگانے لگے تو کیا ہوگا؟ اس دنیا میں نہ تو مالک رہیں گے اور نہ نوکر، نہ امیر رہیں گے، اور نہ غریب، نہ پہریدار رہیں گے اور نہ امیر رہے گا۔ ذرا سوچو تو قدرت اس گڑبڑ کو کیسے برداشت کر سکتی ہے؟ ہم پر فوراً ایک اور طوفانِ نوح نازل ہو جائے گا! لو، اپنی تھیلی اچھی طرح چھپا دو نہیں تو تمہارے پاگل بن کے خیالات انسانیت پر خدا کا قہر نازل کر دیں گے اور ساری بنی نوع انسان تباہ ہو کر رہ جائے گی۔''

یہ کہہ کر خواجہ نصرالدین نے پھر اپنا چاک چالو کر دیا۔

''یہ بہترین گھڑا ہوگا'' انہوں نے ہاتھوں میں تم مٹی کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا ''یہ ہمارے امیر کے سر کی طرح بجتا ہے۔ میں یہ گھڑا لے کر محل جاؤں گا۔ ان کو اسے رکھنا چاہئے ممکن ہے کہ امیر کا سر غائب ہو جائے۔''

''دیکھو، خواجہ نصرالدین، کہیں تمہارا سر ایسی باتوں کی وجہ سے کسی دن نہ غائب ہو جائے۔''

''ارے، تمہارے خیال میں خواجہ نصرالدین کا سر غائب کرنا ایسا آسان ہے؟''

ہوں میں خواجہ نصرالدین، آزاد سدا کا
یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا
تیشے کو تیز کر کے کہنا ہے مجھے امیر
لٹیرا، فتنۂ عالم، زمانے کا شریر
ہوں میں خواجہ نصرالدین، آزاد سدا کا
یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا
میں زندہ رہ کر گاؤں گا
روشن دنیا میں موج اڑاؤں گا
دنیا بھر میں نعرہ یہ لگاؤں گا
''مردہ باد امیر، مردہ باد!''
ہاں، سلطان بھی کہتے ہیں میرا سر کٹوانے کو
اور شاہ نے فرمایا مجھ کو پھانسی پر لٹکانے کو
خیوا میں ہے تیار چتا میرے جلانے کو
ہوں میں خواجہ نصرالدین، آزاد سدا کا
یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا
غربت کا مارا، آوارہ ہوں ضرور
پر فکر پھٹکتی نہیں نزدیک و دور
جگت کی آنکھ کا تارا
قسمت کا راج دلارا
ہوں گے سلطان و خان و امیر
سب کو جوتی کی نوک پر مارا

ہوں میں خواجہ نصرالدین، آزاد سدا کا
یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

نیاز کی پیٹھ کے پیچھے گل جان کے ہنستے ہوئے چہرے کی جھلک انگور کی بیلوں میں دکھائی دی۔ خواجہ نصرالدین کا گیت بیچ میں رہ گیا اور گل جان سے رمز و کنائے ہونے لگے۔

''تم کیا دیکھ رہے ہو؟'' نیاز نے پوچھا ''ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟''

''میں جنت کی چڑیا دیکھ رہا ہوں، دنیا کی حسین ترین چڑیا!''

بڑھا کراہتے ہوئے پیچھے مڑا لیکن گل جان ہرے بھری بیلوں کے درمیان غائب ہو چکی تھی اور صرف دور سے نقرئی ہنسی کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ بڑی دیر تک بڈھا تیز دھوپ کی روشنی سے بچنے کے لئے اپنی کمزور آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے ہر طرف کھورتا رہا لیکن اس کو صرف ایک گوریا دکھائی دی جو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدک رہی تھی۔

''ہوش کی دوا کرو، خواجہ نصرالدین، کیسی جنت کی چڑیا، یہ تو گوریا ہے!''

خواجہ نصرالدین نے دل کھول کر ٹھٹھا لگایا۔ بے چارہ نیاز اس خوشی کی وجہ نہ سمجھ کر سر ہلاتا رہا۔

رات کو کھانے کے بعد جب خواجہ نصرالدین چلے گئے تو نیاز چھت پر ہلکی ٹھنڈی ہوا میں لیٹ گیا۔ جلد ہی وہ خراٹے لینے لگا۔ اب نیچی باڑ کے پیچھے سے کھنکھنارنے کی آواز آئی۔ خواجہ نصرالدین لوٹ آئے تھے۔

''سو گئے ہیں'' گل جان نے چپکے سے کہا۔

ایک چھلانگ میں وہ باڑ کے اس پار تھے۔

وہ تالاب کے کنارے حور کے درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ان کو لگا جیسے درخت اپنے لمبے سبز لباسوں میں لپٹے ہلکے ہلکے سے اونگھ رہے ہیں۔ صاف آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور چاندنی نے ہر چیز کو پراسرار نیلگوں بنا دیا تھا۔ بہتا ہوا پانی گنگنا رہا تھا اور روشنی کی کرنوں سے کہیں کہیں چمک اٹھتا تھا اور پھر سائے میں غائب ہو جاتا تھا۔

گل جان بھرپور چاندنی میں خواجہ نصرالدین کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ خود ماہ کامل کی طرح نورانی

تھی۔ نازک اور لچکیلی، اپنی زلفوں کے پیچ وخم میں لپٹی ہوئی۔ خواجہ نصرالدین نے چپکے سے کہا:

''میں تجھے پیار کرتا ہوں، میرے ملکہ، صرف تجھ سے پہلی مرتبہ میں نے پیار کیا ہے، میں تیرا غلام ہوں، تیرے آنکھ کے اشارے پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔ میں ساری زندگی تیرا انتظار کرتا رہا ہوں اور اب میں نے تجھے ڈھونڈ نکالا ہے۔ میں تجھے کبھی دل سے نہیں نکال سکتا۔ میری زندگی تیرے بغیر ممکن نہیں ہے!''

''مجھے یقین ہے کہ تم یہ بات پہلی بار نہیں کہہ رہے ہو۔ گل جان سے حسد آمیز لہجے میں کہا۔

''میں؟'' خواجہ نصرالدین نے ناراضگی سے کہا ''ارے گل جان! تو نے یہ بات کیسے کہی؟''

خواجہ کی باتوں میں اتنا خلوص تھا کہ گل جان نے ان پر اعتبار کر لیا۔ وہ نرم پڑ گئی اور خواجہ کے پاس مٹی کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ انہوں نے اس کا ایسا طویل بوسہ لیا کہ وہ ہانپ گئی۔

''سنو'' گل جان نے ذرا رک کر کہا ''ہمارے یہاں یہ رواج ہے کہ جس لڑکی کو چومتے ہیں اسے کوئی تحفہ دیتے ہیں اور تم ہو کہ مجھے ایک ہفتے سے زیادہ سے چوم چاٹ رہے ہو لیکن ایک تاگا تک نہیں دیا۔''

''صرف اس وجہ سے کہ میرے پاس پیسے نہیں تھے'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا ''لیکن آج تمہارے باپ نے مجھے تنخواہ دی ہے اور کل میں تمہارے لئے ایک اچھا سا تحفہ لاؤں گا۔ تمہیں کیا پسند ہے ___ ہار یا رومال یا پھر یاقوت کی انگوٹھی؟''

''اس کی کوئی بات نہیں'' گل جان نے چپکے سے کہا ''اس کی کوئی بات نہیں ہے، پیارے، مجھے تو تمہارے تحفے سے مطلب ہے۔ مجھے تو تم سے اسی دن محبت ہو گئی تھی جب تم بازار میں ہمارے پاس آئے تھے اور جب تم نے اس پاجی سود خور جعفر کو بھگا دیا تو یہ محبت اور بھی زیادہ ہو گئی۔''

نالی میں نیلگوں پانی گنگنات رہا اور صاف آسمان پر روشن ستارے جھلملاتے رہے۔ خواجہ نصرالدین لڑکی سے اور ٹھس کر بیٹھ گئے اور اپنی ہتھیلی اس کے گرم سینے پر رکھ دی۔ ان کے اوپر ایک مدہوشی کا عالم طاری ہو گیا کہ اچانک ان کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی ہیں۔ ان کا گال ایک زوردار تھپڑ سے جل اٹھا۔ انہوں نے پیچھے کھسک کر اپنے کو ہاتھ آڑ کر کے بچایا۔ گل جان غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرے خیال میں مَیں نے ایک تھپڑ کی آواز سنی'' خواجہ نے سہم کر کہا۔''اگر زبان سے کہنے سے کام چل جائے تو بھلا مار پیٹ کی کیا ضرورت ہے؟''

''زبان سے!'' گل جان نے بات کاٹ کر کہا''یہی بڑی بری بات ہے کہ میں نے شرم وحیا کو طاق پر رکھ کر تمہارے سامنے نقاب اتار دی۔ پھر تمہارے لمبے ہاتھ وہاں تک پھیلنے لگے جہاں تک نہ چاہئے۔''

''اور مہربانی کر کے یہ تو بتاؤ کہ یہ فیصلہ کس نے کیا ہے کہ کہاں تک ہاتھوں کو پھیلانا چاہئے اور کہاں تک نہیں؟'' خواجہ نصرالدین نے حاضر جوابی سے کہا لیکن وہ کافی گھبرائے ہوئے تھے''اگر تم نے دانش منداِبنِ طفیل کی کتابیں پڑھی ہوتیں....''

''شکر ہے خدا کا'' گل جان نے غصے سے پیچ میں بولتے ہوئے کہا''شکر ہے خدا کا کہ میں نے ایسی آوارگی کی کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔ میں اپنی عصمت کی حفاظت اسی طرح کرتی ہوں جیسی ایک اچھی لڑکی کو کرنی چاہئے۔''

وہ اس طرف سے مڑ کر چلی گئی۔ زینے اس کے ہلکے قدموں تلے چرچرائے اور جلد ہی بالکونے کی جھلملیوں سے روشنی چمکنے لگی۔

''میں نے اس کے جذبات کو ٹھیس لگادی'' خواجہ نصرالدین نے سوچا''میں کیسا احمق ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ تو پتا چل گیا کہ وہ کیسے مزاج کی ہے۔ اگر وہ میرے گال پر اس طرح چانٹا رسید کر سکتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ دوسرے کے بھی تھپڑ مار سکتی ہے اور وہ وفادار بیوی ہوگی۔ ہاں، اگر شادی کے بعد وہ دوسرے مردوں کے ساتھ اپنے تھپڑوں سے ایسے ہی فیاضی برتے تو میں شادی سے پہلے اس کے سینکڑوں چانٹے سہنے کے لئے تیار ہوں۔''

وہ پنجوں کے بل بالکونی تک گئے اور دھیمے سے پکارا:

''گل جان!'' کوئی جواب نہ ملا۔

''گل جان!''

مہک، تاریکی اور خاموشی۔ خواجہ نصرالدین افسردہ ہو گئے۔ انہوں نے ایسی مدہم آواز میں گانا شروع کیا کہ بڑے میاں کی نیند نہ کھلے:

چرا لے گئیں دل تیری پلکیں
گرتی ہو اپنی نظروں سے
اور چراتی ہوں اپنی پلکوں سے
اور ستم پر ستم تو دیکھو
ہمیں سے معاوضے کی طالب
اچھا، کچھ پیار ہو جائے
آؤ، بوس و کنار ہو جائے
لیکن ان کا تلخ شربت
بھڑکاتا ہے شعلۂ الفت
در و بام بند کئے مجھ پر
زندگی حرام کی مجھ پر
اب نیند کہاں سے لاؤں
بتاؤ، چین کہاں سے پاؤں
تیری اک نگاہ کی آرزو
تیرِ بے پناہ کی آرزو
تیری زلفِ مشک بو کا شیدائی
تیرے گیسوئے عنبریں کی سودائی

اس طرح وہ گاتے رہے اور حالانکہ نہ تو گل جان آئی اور نہ اس نے کوئی جواب دیا لیکن خواجہ جانتے تھے کہ وہ توجہ سے سن رہی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایسے گیت سے ہر عورت ضرور متاثر ہوگی اور ان کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ کواڑ کا پٹ ذرا سا کھلا۔

''آجاؤ'' گل جان نے چپکے سے کہا ''ذرا چپکے سے آنا، کہیں ابا کی آنکھ نہ کھل جائے۔''

وہ زینوں پر چڑھ گئے اور اب اس کے پاس بیٹھے تھے۔ چربی سے بھرے ہوئے چراغ کی لو صبح

تک لہراتی اور چلتی رہی۔ وہ باتیں کرتے رہے لیکن ان کا دل نہیں بھرا۔ مختصر یہ کہ سب کچھ وہی ہوا جیسا کہ ہونا چاہئے اور جیسا کہ ابو محمد علی ابن حزم نے اپنی کتاب ''قمری کے ہار'' کے محبت کی فطرت والے باب میں بیان کیا ہے۔

''محبت، اللہ اس کو سلامت رکھے، ایک کھیل کی طرح شروع ہوتی ہے لیکن بہت سنگین معاملے پر ختم ہوتی ہے۔ وہ اتنی اعلیٰ خوبیوں کی حامل ہے کہ ان کا بیان امکان سے باہر ہے اور اس کے اصل وہر کو سمجھنا مشکل ہے۔ جہاں تک اس کا سوال ہے کہ محبت زیادہ تر حسنِ ظاہر کی وجہ سے کیوں ہوتی ہے تو اس کا سمجھنا مشکل نہیں ہے کیونکہ روح خود حسین ہے اور حسین اور بے عیب شکل وصورت کی طرف کھنچتی ہے۔ ایسی شکل کو دیکھ کر روح اس کا جائزہ لیتی ہے اور اگر سطح سے نیچے بھی کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جو اس سے یگانگت رکھتی ہے تو سنجوگ ہو جاتا ہے اور پھر سچی محبت جنم لیتی ہے.....واقعی، ظاہری شکل وصورت حیرت انگیز طریقے سے روح کے دور افتادہ ذرات کو بھی متحد کر دیتی ہے!''

17

چھت پر بڈھے نے کروٹ لی۔ وہ چھینکا اور کھانسا اور نیند ہی میں گل جان سے پینے کے لئے ٹھنڈا پانی لانے کو کہا۔ گل جان نے خواجہ کو دروازے کی طرف ڈھکیلا اور وہ زینوں پر اس طرح بھاگے کہ ان کے پیر مشکل سے قدمچوں کو چھو رہے تھے۔ پھر وہ کود کر باڑ کے پار ہو گئے اور اپنی قبا کے دامن سے چہرہ پونچھ کر پھر لکڑی کے پھاٹک کو کھٹکھٹا رہے تھے۔

''صبح بخیر، خواجہ نصر الدین'' بڈھے نے چھت ہی پر ان کو خوش آمدید کہا ''پچھلے چند دنوں سے تم کتنے سویرے اٹھنے لگے ہو۔ تم سوتے کب ہو۔ اچھا، کام شروع کرنے سے پہلے ہم چائے پی لیں۔''

دوپہر کو خواجہ بڈھے کو چھوڑ کر گل جان کے لئے تحفہ خریدنے بازار چلے گئے۔ انہوں نے حسبِ معمول یہ احتیاط کی کہ بدخشاں کا رنگین امامہ باندھا اور مصنوعی داڑھی لگا لی۔ اس بھیس میں وہ پہچانے نہیں جا سکتے تھے اور جاسوسوں سے نڈر ہو کر وہ دکانوں اور چائے خانوں میں جا سکتے تھے۔

انہوں نے مونگے کا ایک ہار منتخب کیا جس کے رنگ نے ان کو اپنی محبوبہ کے ہونٹوں کی یاد دلا دی۔ جوہری معقول آدمی ثابت ہوا اور صرف ایک گھنٹہ خوب طے توڑ کر کے خواجہ نے تیس تانگے کا ہار خرید لیا۔

واپسی میں خواجہ نصرالدین نے بازار کی مسجد کے قریب بڑی بھیڑ دیکھی۔ لوگ گھس گھس کر ایک دوسرے کے کندھوں کے اوپر سے اپنی گردنیں نکال کر دیکھ رہے تھے۔ جب وہ قریب پہنچ گئے تو انہوں نے ایک درشت اور تیز آواز سنی:

''مومنو، خود دیکھ لو! اس پر فالج گرا ہے اور یہ دس سال سے بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اس کے تمام عضو مفلوج اور ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ دیکھو، یہ اپنی آنکھیں تک نہیں کھولتا۔ یہ بہت دور سے ہمارے شہر آیا ہے۔ خدا ترس رشتے دار اور دوست اسے یہاں صرف اس علاج کے لئے لے آئے ہیں جس کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے۔ ایک ہفتے میں مقدس ترین اور بے مثال بزرگ حضرت بہاٗ الدین کے عرس کے دن اس کو مزار کے زینوں پر لٹا دیا جائے گا۔ اس طرح اندھے، لنگڑے اور صاحب فراش مریض متعدد بار شفا پا چکے ہیں۔ اس لئے اے مومنوں آئے ہم دعا کریں کہ مقدس شیخ اس پر رحم کھائیں اور اس بدقومت انسان کو شفا عطا فرمائیں۔''

مجمع نے دعا پڑھی اور پھر اس اس تیز آواز نے شروع کیا:

''مومنو، خود دیکھ لو! اس پر فالج گرا ہے اور یہ دس سال سے بے حس و حرکت پڑا ہے!''

خواجہ نصرالدین نے دھکم دھکا کر کے مجمع میں اپنے لئے راستہ بنایا اور پنجوں پر کھڑے ہو کر ایک لمبا، سوکھا سا ملا دیکھا جس کی آنکھوں میں کمینگی جھلک رہی تھی۔ اس کی داڑھی چھدری تھی۔ وہ چلا چلا کر بیماروں کی ایک ڈولی کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہا تھا جس پر مفلوج آدمی پڑا تھا۔

''دیکھو، اے مسلمانو! دیکھو، ی کیسا قابلِ رحم اور بدقسمت آدمی ہے! لیکن ایک ہفتے میں مقدس بہاٗ الدین اس کو شفا بخشیں گے اور اس کو دوبارہ زندگی عطا فرمائیں گے!''

مفلوج آدمی پڑا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں اور ایک افسردہ اور قابلِ رحم تاثر اس کے چہرے پر تھا۔ خواجہ نصرالدین نے حیرت سے آہ بھری۔ وہ ہزاروں آدمیوں میں بھی یہ چیچک بھرا چہرہ اور چپٹی ناک پہچان سکتے تھے۔ بظاہر یہ آدمی کافی دن سے مفلوج تھا کیونکہ سستی اور بے کاری سے وہ زیادہ موٹا ہو گیا تھا۔

اس دن سے جب بھی خواجہ نصرالدین اس مسجد کی طرف سے گذرے وہ ہمیشہ ملا اور مفلوج کو وہاں ضرور پاتے جس کا چیچک دار چہرہ روز بروز زیادہ موٹا اور چکنا ہوتا جا رہا تھا۔

آخر کار مقدس شیخ کے عرس کا دن آیا۔ یہ پرانی روایت چلی آتی ہے کہ ان کی وفات مئی کے مہینے

میں ٹھیک دوپہر کو ہوئی تھی اور حالانکہ دن بہت صاف تھا اور آسمان پر بادل کا کوئی ٹکڑا تک نہیں تھا لیکن ان کی موت کے وقت سورج سیاہ پڑ گیا اور زمین کانپنے لگی اور بہت سے گناہ گاروں کے مکانات مسمار ہو گئے جن میں یہ گناہ گار بھی دفن ہو گئے۔ یہ تھی وہ کہانی جو ملا لوگ مسجدوں میں کہتے تھے اور مسلمانوں سے اپیل کرتے تھے کہ وہ شیخ کے مزار پر ضرور آئیں اور ان کو خراجِ عقیدت پیش کریں تا کہ ان کا شمار منکروں میں نہ ہو اور ان کا حشر بھی ان گناہ گاروں جیسا نہ ہو۔

رات رہے سے ہی زائرین روانہ ہونا شروع ہو گئے اور سورج نکلتے نکلتے مقبرے کے چاروں طرف بڑے میدان میں زبردست مجمع ہو گیا اور بہت سے لوگ ابھی چلے آ رہے تھے۔ پرانے رواج کے مطابق سب ننگے پیر تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو دور دراز سے آئے تھے۔ خصوصاً متقی اور پرہیزگار لوگ جنہوں نے سنگین گناہ کئے تھے اور بخشائش کے امیدوار تھے۔ شوہر اپنی بانجھ بیویوں کو لائے تھے، مائیں بیمار بچوں کو لئے تھیں، بڈھے بیساکھیوں کے سہارے چل کر آئے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر کوڑھیوں کا مجمع تھا جو آس لگائے مقبرے کے سفید گنبد کی طرف دیکھ رہے تھے۔

عبادت کافی دیر تک نہیں شروع ہوئی کیونکہ امیر کا انتظار تھا۔ مجمع تپتی ہوئی دھوپ میں ٹھسا ٹھس کھڑا تھا۔ کوئی بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں حریص اور گرسنہ شعلے تھے۔ دنیاوی مسرتوں پر سے ان کا عقیدہ اٹھ چکا تھا، آج وہ کسی معجزے کی توقع کرتے تھے اور ہر زور کی آواز پر چونک پڑتے تھے۔ شاید اشتیاق ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا اور دو درویش تشنج میں مبتلا ہو کر دانتوں سے مٹی کھرچ رہے تھے، ان کی منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ مجمع میں ہلچل تھی، ہر طرف عورتیں چیخ اور رو رہی تھیں۔ اچانک ہزاروں گلوں سے ایک غلغلہ بلند ہوا:

''امیر! امیر!''

مجمع کے درمیان راستہ بنانے کے لئے شاہی پہریداروں نے ڈنڈوں سے کام لیا اور اس چوڑے راستے پر امیر ننگے پیر، سر جھکائے استغراق کی حالت میں دنیا کے ہنگامے سے بے خبر اور بے نیاز زیارت کے لئے چکا جا رہا تھا۔ امیر کے پیچھے پیچھے اس کے ماہی مراتب خاموشی سے جا رہے تھے۔ خدام تیزی کے ساتھ ادھر اُدھر دوڑ کر اس کے پیچھے قالین لپیٹتے جاتے تھے اور پھر ان کو تیزی سے آگے لے جا کر بچھاتے تھے۔

اس نظارے کو دیکھ کر بہت سے لوگوں میں رقت طاری ہو رہی تھی اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ امیر اس مٹی کے چبوترے پر چڑھا جو مزار کے دامن میں تھا۔ جانماز اس کے سامنے بچھا دی گئی اور اپنے وزیروں کی مدد سے جو دونوں پہلوؤں سے اس کو سنبھالے تھے امیر اس پر گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ سفید عباؤں میں ملبوس ملاؤں نے ایک نیم حلقہ بنا لیا اور اپنے ہاتھ گرمی سے سنولائے ہوئے آسمان کی طرف اٹھا کر دعا پڑھنی شروع کی۔

یہ عبادت ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وعظ ہوتے۔ خواجہ نصر الدین مجمع سے چپکے سے کھسک گئے اور اس الگ تھلگ چھوٹے سے گھر کی طرف چلے جہاں اندھے، لنگڑے اور صاحبِ فراش مریض تھے جن سے آج کے دن شفا کا وعدہ کیا تھا تھا۔ وہ اپنی باری کے منتظر تھے۔

اس مکان کے دروازے پٹو پٹ کھلے تھے۔ متجسس لوگ اندر جھانک کر دیکھتے اور آپس میں تبادلۂ خیال کرتے۔ جو ملا یہاں ڈیوٹی پر تھے وہ چڑھاوے کے لئے بڑے بڑے تانبے کے طبق لئے کھڑے تھے۔ بڑا ملا کہہ رہا تھا:

....اور اس وقت سے تقدس مآب شیخ بہأ الدین مقدس بخارا اور اس کے آفتاب زماں امیروں پر سدا کے لئے مستقل طور پر مہربان ہیں۔ اور ہر سال اس دن مقدس بہأ الدین ہم کو، خدا کے حقیر بندوں کو معجزے دکھانے کی طاقت عطا فرماتے ہیں۔ یہ تمام اندھے، لنگڑے، آسیب زدہ اور معذور لوگ شفا پانے کے منتظر ہیں اور ہمیں امید ہے کہ ہم مقدس بہأ الدین کی عنایت سے ان کو مصیبتوں سے نجات دلا سکیں گے۔''

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان باتوں کے جواب میں مکان سے رونے، چیخنے اور دانت کٹکٹانے کی آواز آ رہی ہے۔ اپنی آواز بلند کرتے ہوئے ملا نے بیان جاری رکھا:

''اے مومنوں، دل کھول کر مسجدوں کی آرائش کے لئے دو، آپ کی خیرات خدا کے یہاں مقبول ہو گی۔''

خواجہ نصر الدین نے مکان کے اندر جھانک کر دیکھا۔ دروازے کے قریب چیچک رو موٹا نوکر ڈولی پر لیٹا ہوا تھا۔ دھندلکے میں اس کے پیچھے بہت سے لوگ بیساکھیوں کے سہارے کھڑے، پٹیوں میں لپٹے یا ڈولیوں پر پڑے تھے۔ اچانک مقبرے کی طرف سے بڑے ملا کی آواز گونجی جس نے ابھی وعظ ختم کیا

تھا۔

''اندھے کو! اندھے کو میرے پاس لاؤ۔''

خواجہ نصرالدین کو راستے سے ڈھکیلتے ہوئے ملا امس بھرے تاریک مکان میں گھس گئے اور ایک فقیروں کی طرح چیتھڑے لگے اندھے کو اپنے ساتھ باہر لائے۔ وہ ہاتھ پھیلا کر ٹٹولتا اور پتھروں پر ٹھوکریں کھاتا چل رہا تھا۔

اندھا بڑے ملا کے پاس پہنچا، اس کے سامنے منہ کے بل گر پڑا اور مقبرے کی چوکھٹ کو بوسہ دیا۔ بڑے ملا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور آنکھ جھپکاتے وہ بینا ہو گیا۔

''میں دیکھ سکتا ہوں! میں دیکھ سکتا ہوں!'' وہ زوروں سے کانپتی آواز میں چیخنے لگا ''اے مقدس بہاُ الدین! میں دیکھ سکتا ہوں، دیکھ سکتا ہوں، ارے زبردست اور حیرت انگیز معجزہ ہے!''

عبادت کرنے والوں کے ایک بڑے مجمع نے اس کو گھیر لیا اور چاؤں چاؤں کرنے لگے۔ بہت سے اس کے قریب آ کر پوچھنے لگے:

''اچھا بتاؤ میں نے کون سا ہاتھ اٹھایا ہے، دایاں یا بایاں؟''

اس نے صحیح جواب دئے جس سے سب مطمئن ہو گئے کہ اس کو شفا ہوئی ہے۔

اب ملاؤں کی پوری کی پوری فوج تانبے کے طبق لے کر مجمع میں یہ چلاتی ہوئی گھس گئی:

''اے سچے مومنو، تم نے اپنی آنکھوں سے معجزہ دیکھ لیا۔ کچھ مسجدوں کی آرائش کے لئے دو!''

سب سے پہلے امیر نے مٹھی بھر اشرفیاں طبق میں پھینکیں۔ پھر وزیروں اور عمائدین کی باری آئی جنہوں نے ایک ایک اشرفی دی۔ اب مجمع نے بڑی فیاضی کے ساتھ چاندی اور تانبے کے سکوں کی بارش شروع کر دی۔ طبق جلد ہی بھر گئے اور ملاؤں کو انہیں تین بار بدلنا پڑا۔

جیسے ہی چندے کا سیلاب دھیما پڑا ایک لنگڑا آدمی مکان سے لایا گیا۔ وہ بھی مقبرے کے چوکھٹ چومتے ہی فوراً تندرست ہو گیا اور اپنی بیساکھیاں پھینک پیر اچھال اچھال کر ناچنے لگا۔ اور پھر ملا خالی تھالیاں لئے یہ پکارتے ہوئے آگے بڑھے ''خیرات کیجئے، سچے مومنو!''

ایک سفید داڑھی والا ملا خواجہ نصرالدین کے پاس پہنچا جو اپنے خیالات میں ڈوبے تھے اور ان کی آنکھیں مریضوں والے مکان پر لگی تھیں۔

''اے سچے مومن، تو نے یہ زبردست معجزہ دیکھا ہے۔ خیرات کر، اللہ اس کا اجر دے گا!''

اس طرح زور سے بولتے ہوئے کہ ان کے قریب کے لوگ سن سکیں خواجہ نصر الدین نے جواب دیا ''تم اس کو معجزہ کہہ کر مجھ سے پیسے اینٹھنا چاہتے ہو۔ پہلے بات تو یہ ہے کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور دوسری بات یہ ہے ملا جی کہ میں بھی بڑا بزرگ ہوں اور اس سے بڑا معجزہ دکھا سکتا ہوں!''

''تُو مرتد ہے!'' ملا نے غصہ سے کہا ''مسلمانو، اس کی بات مت سنو، اس کے منہ میں شیطان بیٹھ گیا ہے!''

خواجہ نصر الدین نے مجمع کی طرف رُخ کر کے کہا:

''ملا کو یہ یقین نہیں ہے کہ میں معجزہ دکھا سکتا ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ثبوت دوں گا۔ اس مکان میں اندھے، لنگڑے، بیمار اور معذور جمع ہیں اور میں ان سب کو فوراً بلا چھوئے ہوئے اچھا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ میں صرف دو لفظ کہوں گا اور بس وہ چنگے ہو جائیں گے۔ وہ ادھر اُدھر پھیل جائیں گے اور اتنے تیز بھاگیں گے کہ صبا رفتار عرب گھوڑا بھی ان کو نہ پکڑ سکے گا۔''

مکان کی دیواریں پتلی تھیں اور جس مٹی کی وہ بنی ہوئی تھیں وہ کئی جگہوں پر کافی چٹخ گئی تھی۔ خواجہ نصر الدین نے ایک ایسی جگہ منتخب کر لی تھی جہاں دیوار میں کئی دراڑیں تھیں اور انہوں نے یہاں اپنے بازو سے ایک دھکا دیا۔ مٹی ٹوٹ گئی۔ تھوڑی سی لیکن پراسرار سرسراہٹ ہوئی۔ انہوں نے اور زور سے ڈھکیلا اور دیوار کا ایک بڑا حصہ دھڑام سے گر گیا۔ گری ہوئی تاریک جگہ سے زبردست گرد کا بادل اٹھا۔

''زلزلہ! بھاگو!'' خواجہ نصر الدین زور سے چلائے۔ انہوں نے دیوار کا ایک اور حصہ گرا دیا۔

جھونپڑی کے اندر ایک لمحہ تو بالکل خاموشی رہی اور پھر ہنگامہ ہو گیا۔ چیچک رو مفلوج سب سے پہلے دروازے کی طرف معہ اپنی ڈولی کے بھاگا لیکن اس کی ڈولی دروازے میں پھنس گئی اور دوسروں کے لئے راستہ رک گیا۔ اندھے، لنگڑے اور معذور ایک دوسرے کو ڈھکیلنے، ہنگامہ کرنے اور چلانے لگے۔

جب خواجہ نصر الدین نے دیوار کا تیسرا حصہ گرایا تو مریضوں نے ایک زبردست ریلے میں چیچک رو آدمی، دروازہ اور اس کے چوکھٹ وغیرہ کو اکھاڑ پھینکا اور اپنی معذوری کو بھول کر چاروں طرف نکل بھاگے۔

مجمع غل مچا رہا تھا، سیٹیاں بجا رہا تھا، ہنس رہا تھا اور مذاق اڑا رہا تھا۔ خواجہ نصر الدین نے اس مجمع کا

کاؤں کاؤں کے اوپر اپنی آواز بلند کی:

''مسلمانو! تم نے دیکھ لیا نہ۔ میں نے یہ بات بالکل بجا کہی تھی کہ وہ چند الفاظ سے شفایاب ہو سکتے ہیں!''

اب وعظوں سے کسی کو دلچسپی نہیں رہی، ہر طرف سے لوگ ادھر دوڑنے لگے۔ جب ان کو واقعہ معلوم ہوتا تو وہ خوب قہقہے لگاتے اور قصہ دوسروں سے بیان کرتے۔ تھوڑی ہی دیر میں معتقدین کے پورے مجمع میں مکان کے ساتے واقعہ کی خبر گشت کر گئی اور جب بڑے ملانے اپنا ہاتھ اٹھا کر خاموشی کے لئے کہا تو مجمع نے اس کا جواب لعنت ملامت، شور شرابے اور سیٹیوں سے دیا۔

اور پھر جیسے اُس یادگار دن بازار میں ہوا تھا مجمع میں کھسر پھسر اور ہنگامہ اور چرچا ہونے لگا:

''خواجہ نصر الدین

او اپس آ گئے ہیں وہ! وہ یہاں ہیں، ہمارے خواجہ نصر الدین!''

آوازوں اور فقروں سے گھبرا کر ملا لوگ اپنے طبق چھوڑ کر مجمع سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس وقت تک خواجہ نصر الدین دور پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا رنگین عمامہ اور مصنوعی داڑھی قبا میں چھپالی کیونکہ اب ان کو جاسوسوں سے مڈبھیڑ کا کوئی خطرہ نہ تھا جو مقبرے کے اطراف میں مصروف تھے۔

بہر حال، وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ جعفر سود خور گھروں کے کنارے اور سڑک کے درختوں کی آڑ لے کر ان کا پیچھا کر رہا ہے۔

ایک سنسان گلی میں خواجہ نصر الدین باڑ کے پاس گئے اور ہاتھوں کے بل اوپر اٹھ کر ہلکے سے کھنکھارے۔ فوراً ہی ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دی اور نانی آواز آئی:

''تم ہو، پیارے؟''

درخت کے پیچھے سے جہاں سود ور چھپا تھا اس کو حسین گل جان کی آواز پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پھر اس نے کھسر پھسر، ہلکی ہنسی اور بوسوں کی آواز سنی۔

''اچھا تو تم نے اس کو مجھ سے اپنے لئے چھینا تھا!'' سود خور نے بہت جل کر سوچا۔

گل جان سے رخصت ہو کر خواجہ نصر الدین اتنی تیزی سے نکل گئے کہ سود خور ان کا پیچھا نہ کر سکا اور تنگ گلیوں کی بھول بھلیوں میں ان کا نشان کھو بیٹھا۔

''اچھا اب تو اس کی گرفتاری کا انعام مجھے ملنے سے رہا'' سودخور نے پریشان ہوکر سوچا ''لیکن کوئی بات نہیں! خواجہ نصرالدین ہوشیار رہنا، میں تم سے اس کے لئے عبرت ناک انتقام لوں گا۔''

18

امیر کے خزانے کو زبردست خسارہ ہوا۔ پچھلے برسوں کے مقابلے میں حضرت بہاء الدین کے مقبرے سے رقم کا دسواں حصہ بھی نہیں آیا۔ اور اس سے بری بات تو یہ تھی کہ لوگوں کے دماغوں میں دلیرانہ آزاد خیالی کی پھر سے آبیاری ہوگئی۔ جاسوسوں نے مخبری کی کہ مقبرے کے واقعہ کی خبر ریاست کے کونے کونے میں پھیل گئی اور اس کے نتائج بھی برآمد ہوئے۔ تین گاؤں میں باشندوں نے مسجدوں کی تعمیر کی تکمیل سے انکار کر دیا اور چوتھے میں انہوں نے اپنے ملا کو بہت ذلیل کر کے نکال دیا۔

امیر نے وزیرِ اعظم بختیار کو حکم دیا کہ وہ دیوان یعنی ریاستی کونسل کا جلسہ طلب کرے۔ کونسل کا جلسہ محل کے باغ میں ہوا۔ یہ بھی عجیب وغریب باغ تھا، دنیا کا سب سے حسین باغ۔ شاندار چھتنارے درختوں پر نایاب پھل لگے تھے۔ بہت سے اقسام کے شفتالو، بادام، آلوچے، انجیر اور نارنگیاں اور بہت سے دوسرے پھل جن کا بیان مشکل ہے۔ گلاب اور طرح طرح کے پھول پودوں کی چمن بندیاں تھیں جن سے ساری فضا معطر رہتی تھی۔ کوڑیالے کے پھول مسکرا رہے تھے اور نرگس ان کی طرف محبت سے دیکھ رہی تھی۔ فوارے اچھل رہے تھے اور سنگِ مرمر کے حوضوں میں طرح طرح کی سنہری مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ ہر جگہ نقرئی پنجروں میں نایاب چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

لیکن وزراء عمائدین اور حکماء بے پروائی سے گذر رہے تھے۔ وہ حسن کے جادو سے بے خبر اور ناآشنا تھے کیونکہ ان کے خیالات بالکل اپنے مفاد پر مرکوز تھے کہ کس طرح اپنے دشمنوں کی چوٹوں سے بچا جائے اور اپنی باری آنے پر کیسے ان پر چوٹ کی جائے۔ اس طرح ان کے سخت اور مرجھائے ہوئے دلوں میں اس کے سوا اور کسی بات کے لئے جگہ ہی نہ تھی۔ اگر اچانک دنیا کے تمام پھول مرجھا جاتے اور ساری چڑیاں چہچہانا بند کر دیتیں تب بھی وہ توجہ نہ کرتے کیونکہ وہ اپنی ذاری خواہشات اور حریصانہ چالوں میں مبتلا تھے۔

ان کی آنکھوں میں افسردگی تھی اور خون سے عاری ہونٹ بھنچے تھے وہ ریتلے راستوں پر اپنی جوتیاں

گھسیٹتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ایک کنج میں داخل ہوئے جو سرسبز، گھنی اور مہک دار بیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ یہاں وہ اپنی مرصع عصائیں دیوار کے سہارے کھڑی کر کے ریشمی گدوں پر بیٹھ گئے۔ بڑے عمائدین کے بوجھ سے سر جھکائے وہ خاموشی سے اپنے آقا کا انتظار کرنے لگے۔

وہ بھاری قدموں سے اندر داخل ہوا، غمگین خیالات سے اس کی تیوریوں پر بل تھا۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور تقریباً زمین تک جھک گئے اور اس وقت تک جھکے رہے جب تک اس نے ہلکا سا اشارہ نہ کیا۔ اب آداب کے مطابق وہ گھٹنوں کے بل ہو گئے اور اپنے جسم کا سارا وزن ایڑیوں پر ڈال دیا۔ ان کی انگلیاں قالین پر تھیں۔ ہر ایک اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ آج امیر کا قہر کس پر نازل ہوگا اور اس سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

درباری شاعروں نے حسبِ معمول آداب کے مطابق امیر کے پیچھے نصف حلقہ بنا لیا اور ہلکے ہلکے کھنکھار کر اپنے گلے صاف کرنے لگے۔

ان میں سب سے لائق شاعر جس کو ''ملک الشعراء'' کا خطاب مل چکا تھا دل ہی دل میں وہ قصیدہ دہرا رہا تھا جو اس نے آج ہی صبح تیار کیا تھا اور امیر کو اس طرح سنانا چاہتا تھا جیسے اس نے مافوق الفطرت جوش کے ماتحت اس کو فی البدیہہ کہا ہے۔

شاہی مورچھل اور حقہ برداروں نے بھی اپنی اپنی مقررہ جگہیں سنبھال لیں۔

''بخارا میں کس کی حکومت ہے؟'' امیر نے دھیمی آواز میں ابتدا کی جس سے سامعین کو جھرجھری آ ئی۔ ''بخارا میں کس کی حکومت ہے، ہم پوچھتے ہیں۔ ہماری یا اس ملعون، ناپاک خواجہ نصرالدین کی'' یہاں تقریباً اس کی آواز گھٹ گئی۔ پھر اپنے غصے پر قابو حاصل کر کے دھمکی آمیز آواز میں اس نے کہا ''امیر تمہاری بات سن رہا ہے! بولو!''

مورچھل اس کے سر پر ہلتی رہی۔ درباری خاموش اور خوف زدہ تھے۔ وزراء گھبرا گھبرا کر ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے۔

''اُس نے ساری ریاست میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے'' امیر نے اپنی بات جاری رکھی ''تین بار اس نے ہمارے دارالحکومت کے امن و امان میں رخنہ ڈالا ہے۔ اس نے ہمارا خواب و آرام لوٹ لیا اور ہمارے خزانے کو جائز آمدنی سے محروم کر دیا۔ وہ علانیہ عوام کو سرکشی اور بغاوت کے لئے اکساتا ہے۔ اس

پانی سے کس طرح نپٹیں، ہم تم سے پوچھتے ہیں۔''

وزراء، عمائدین اور حکما سبھی نے یک آواز ہو کر جواب دیا:

''اے مرکزِ کائنات، محافظ امن، وہ بلاشبہ سخت سے سخت سزا کا مستحق ہے!''

''تو پھر وہ ابھی تک کیوں زندہ ہے؟'' امیر نے دریافت کیا۔ ''یا یہ کام پھر ہمارے لئے، تمہارے حکمراے کے لئے ہے جس کا نام تمہیں خوف اور ادب سے اور وہ بھی بلا سر بسجود ہوئے نہیں لینا چاہئے جس ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ تم کاہلی، گستاخی اور لاپروائی کی سجہ سے نہیں کرتے ہو۔ ہاں تو دہراتا ہوں کہ کیا یہ ہمارے لئے ہے کہ ہم بذاتِ خود اس کو گرفتار کرنے بازار جائیں جب کہ تم اپنے حرموں میں خوب عیاشی کرو گل چھرے اڑاؤ اور صرف تنخواہ وصول کرنے کے دن اپنے فرائض کو یاد کرو؟ تیرا کیا جواب ہے، اے بختیار؟''

بختیار کا نام سن کر دوسروں نے چین کا سانس لیا اور ارسلان بیگ کے ہونٹوں پر کہنہ پرور مسکراہٹ کھیلنے لگی جس سے بختیار کا بہت زمانے سے جھگڑا چلا آ رہا تھا۔ بختیار نے اپنی توند پر ہاتھ باندھے اور امیر کے سامنے زمین تک جھک گیا۔

''خدا ہمارے امیر کو آزمائشوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے!'' بختیار نے شروع کیا۔ ''اس غلام کی وفاداری اور خدمات کو، جو امیر کی نورانی کرنوں کا ایک حقیر ذرہ ہے، امیر اچھی طرح جانتے ہیں۔ میرے وزیرِ اعظم کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے شاہی خزانہ بالکل خالی تھا لیکن میں نے کئی ٹیکس لگائے۔ میں نے ملازمت پانے پر بھی ٹیکس لگا دیا۔ میں نے ہر ممکن چیز پر ٹیکس لگا دیا اور اب کسی کی یہ مجال نہیں کہ وہ خزانے کو بلا کچھ ادا کئے چھینک بھی دے۔

''مزید برآں میں نے نچلے درجے کے سرکاری ملازمین اور پہرے داروں کی تنخواہیں آدھی کر دیں، بخارا کے باشندوں کو پہرے داروں کی دیکھ بھال کا ذمہ دار بنایا اور اس طرح میرے آقا، میں نے خزانے میں کافی بڑی رقم جمع کی۔ لیکن ابھی میں نے اپنی تمام خدمات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میری کوششوں سے ہی حضور بہاؤالدین کے مقبرے پر پھر معجزے ہونے لگے اور ہزاروں زائرین مقبرے کو آنے لگے۔ اس طرح ہمارے بادشاہ کا خزانہ، جن کے سامنے دنیا کے دوسرے حکمران ایک ذرے کے برابر ہیں، ہر سال عطیوں سے بھرنے لگا ہے اور آمدنی کئی گنی بڑھ گئی ہے....''

''یہ آمدنی کہاں ہے؟'' امیر نے بیچ میں لقمہ دیا۔''اس کو تو خواجہ نصرالدین نے ہم سے لے لیا۔ہم تمہاری خدمات کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہیں۔ یہ تم ہم متعدد بار سن چکے ہیں۔ہمیں یہ بتاؤ کہ خواجہ نصرالدین کس طرح ہاتھ آئے؟''

''آقا'' بختیار نے جواب دیا''وزیرِ اعظم کے فرائض میں مجرموں کی تلاش نہیں شامل ہے۔ ہمارے ریاست میں یہ کام شاہی گارد اور فوج کے سپہ سالار کا ،معزز ارسلان بیگ کا ہے۔''

یہ کہہ کر بختیار پھر ایک بار زمین تک امیر کے سامنے جھکا اور فاتحانہ اور کینہ توز نگاہوں سے ارسلان بیگ کو دیکھا۔

''بولو!'' امیر نے حکم دیا۔

ارسلان بیگ بختیار کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتا ہوا اٹھا۔لمبی سانس لی اور اس کی سیاہ داڑھی اوپر اٹھی اور پھر اس کی توند پر گر گئی۔

''خدا ہمارے مہرتاباں، بادشاہ کو ہر آفت و مصیبت، بیماری اور رنج سے محفوظ رکھے! امیر میرے خدمات سے بخوبی واقف ہیں۔ جب خیوا کے خان نے بخارا پر چڑھائی کی تو مرکز کائنات ،ظلِ سبحانی نے عنایت فرما کر مجھے بخارا کی فوج کی کمان سپرد کی اور میں نے بلاخون خرانے کے دشمن کو پیچھے ڈھکیل دیا اور لڑائی کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔

''میں نے یہ حکم دے دیا کہ خیوا کی سرحد سے لے کر ہمارے علاقے کے اندر، کئی دنوں کے کوچ کے فاصلے تک تمام شہر اور گاؤں تباہ کر دئے جائیں، تمام فصلیں، باغیں، سڑکیں اور پل برباد کر دئے جائیں۔ جب خیوا کے لوگ ہمارے علاقے میں داخل ہوئے اور انہوں نے ایک ریگستان دیکھا جہاں نہ تو باغیں تھیں اور نہ کوئی جاندار، تو انہوں نے اپنے آپ سے کہا، ہم بخارا نہ جائیں گے کیونکہ وہاں نہ تو کچھ کھانے پینے کو ہوگا اور نہ لوٹ مار کے لئے۔، وہ واپس لوٹ گئے، دھوکہ کھا کر اور ذلیل ہو کر۔ ہمارے بادشاہ، امیر نے مہربانی کر کے اپنی فوج کے ہاتھوں خود اپنے ملک کی تباہی کو اتنا دانش مندانہ اور کارآمد حربہ تسلیم کیا کہ انہوں نے حکم نافذ کر دیا کہ کسی بھی چیز کو بحال نہ کیا جائے اور تمام شہر، گاؤں، کھیت اور سڑکیں تباہ شدہ حالت میں رکھی جائیں تا کہ آئندہ دشمن قبائل ہمارے علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کریں۔ اس طرح میں نے خیوا کے لوگوں کو شکست دی۔ اس کے علاوہ بخارا میں ہزاروں جاسوسوں کو میں نے

تربیت دی...''

بند کر اپنی زبان، یخنی خور!'' امیر نے چلا کر کہا۔''تو تیرے جاسوس خواجہ نصر الدین کو کیوں نہیں پکڑ سکے؟''

ارسلان بیگ بدحواس ہوکر کافی دیر تک خاموش رہا۔آخر کار اسے ماننا ہی پڑا:

''آقا، میں نے ہر تدبیر کر ڈالی لیکن میرا دماغ اس بدمعاش اور مرتد کے خلاف کام نہیں کرتا۔ میرے خیال میں حکماو عقلا سے اس بارے میں رائے لینی چاہئے۔''

''قسم ہے اپنے آباواجداد کی! تم سے اس قابل ہو کہ شہر کی فصیل پر تمہیں سولی دے دی جائے!'' امیر برس پڑا، اپنے غصے میں اس نے حقے بردار کو ایک زور کا ہاتھ رسید کیا جو اس غلط موقع پر شاہ کے دست دراز کے قریب آگیا تھا۔

''بولو'' اس نے سب سے معمر دانا کو حکم دیا جو درازئ ریش کے لئے مشہور تھا۔اس کی داڑھی اتنی لمبی تھی کہ اس کو اپنی کمر کے گرد دوہری لپیٹ سکتا تھا۔

دانا اٹھا، ایک دعا پڑھی اور اپنی مشہور داڑھی کو تھپ تھپایا اور داہنے ہاتھ سے اس کو کھینچ کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اس میں شانہ کرنے لگا۔

''خدا بادشاہ کو بعایا کی خوش حالی اور مسرت کے لئے شاندار اور طویل زندگی عطا فرمائے'' اس نے کہا۔''چونکہ مذکورہ بالا بدمعاش اور باغی خواجہ نصر الدین بھی تو آدمی ہی ہے، اس لئے یہ نتیجہ اخذ کی جاسکتا ہے کہ اس کا جسم بھی دوسرے آدمیوں جیسا ہے یعنی اس میں دوسو چالیس ہڈیاں اور تین سوساٹھ رگیں ہیں جو پھیپھڑے، جگر، دل، تلی، اور پتے کو چلاتی ہیں۔داناؤں نے ہمیں سکھایا ہے کہ شہ رگ دل کی رگ ہوتی ہے جو تمام دوسری رگوں کو چلاتی ہے اور یہ ایک ناقابلِ تردید اور مقدس حقیقت ہے جو بے ایمان ابواسحاق کی کافرانہ تعلیم کے خلاف ہے جو یہ جھوٹا دعویٰ کرنے کی ہمت کرتا ہے کہ انسان کی زندگی کی بنیاد پھیپھڑے کی رگ ہے۔

''دانائے روزگار بوعلی سینا، یونانی حکیم ہپوکریٹس اور کارڈوبا کے اویرؤس نے بھی لکھا ہے جس کے محنت کے پھل اب ہم اٹھا رہے ہیں اور الکندی، الفارابی اور ابوبصرہ ابنِ طفیل کی تعلیمات کے مطابق بھی میں کہتا ہوں اور تصدیق کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اللہ نے آدم کو چہار عناصر ___ آب، خاک،

آتش، اور باد ___ کے خمیر سے اس طرح بنایا کہ زرد پتے میں آگ کی خصوصیت ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ گرم اور خشک ہے۔ سیاہ پتے میں خاک کی خصوصیت ہے کیونکہ وہ ٹھنڈا اور خشک ہوتا ہے۔ لعاب دھن پانی کی خصوصیات رکھتا ہے کیونکہ وہ گرم اور تر ہوتا ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے جسم کی ان رقیق اشیا سے محروم کر دیا جائے تو وہ لازمی طور پر مر جاتا ہے اور اس سے میں نتیجہ اخذ کرتا ہوں، اے ممتاز آقا، کہ یہ مرتد، دشمن امن و امان، خواجہ نصر الدین خون سے محروم کر دیا جائے جس کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس کا سر دھڑ سے جدا کر دیا جائے کیونکہ جو خون بہتا ہے اس کے ساتھ آدمی کے جسم سے زندگی بھی بخارات میں تبدیل ہو کر اڑ جاتی ہے اور کبھی واپس نہیں آتی۔ یہ ہے میرا مشورہ اے شاہِ زماں،، جہاں پناہ!''

امیر نے اس کی باتیں توجہ سے سنیں اور کچھ کہے بغیر دوسرے دانا کی طرف ابرو سے بہت ہلکا سا اشارہ کیا۔ اس دانا کی داڑھی کا مقابلہ تو پہلے دانا سے نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کا عمامہ اس سے کہیں بڑا اور شاندار تھا۔ سالہا سال میں عمامہ کے بوجھ نے اس کی گردن کو ایک طرف سے نیچے جھکا دیا جس سے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی آدمی تنگ دراڑ سے اوپر جھانک رہا ہو۔ امیر کے سامنے جھکتے ہوئے یہ دانا بولا:

''اے شہنشاہِ اکبر، آفتابِ نیم روز، میں خواجہ نصر الدین کے اس طرح خاتمے سے متفق نہیں ہوں کیونکہ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ انسان کی زندگی کے لئے صرف خون ہی نہیں بلکہ ہوا بھی ضروری ہے اور اگر کسی آدمی کی گردن رسی سے دبا دی جائے اور اس طرح ہوا اس کے پھیپھڑوں تک پہنچنے سے روکی جا سکے تو وہ آدمی لازمی طور پر مر جاتا ہے اور کبھی پھر بحال نہیں ہو سکتا....''

''اچھا'' امیر نے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، اے داناؤں کے دانا، اور آپ کے مشورے ہمارے لئے بلا شبہ قیمتی ہیں، واقعی، اگر آپ ایسے مشورے نہ دیتے تو ہم خواجہ نصر الدین سے کیسے پیچھا چھڑا سکتے تھے؟''

وہ رک گیا کیونکہ وہ غصے سے بری طرح بھرا ہوا تھا اور اس پر قابو رکھنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے گال تھرتھرا رہے تھے، نتھنے جل رہے تھے اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ لیکن درباری خوشامدی ___ فلسفی اور شاعر، جو امیر کی پشت پر نیم حلقہ بنائے کھڑے تھے اپنے مالک کا غضبناک چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے اس لئے انہوں نے اس کے غضب آلود طعن کو نہیں سمجھا جس سے اس نے داناؤں کو مخاطب کیا تھا۔ اس کی بات کے ظاہری مطلب کو لے کر انہوں نے سوچا کہ داناؤں نے واقعی امیر کی

نگاہوں میں عزت حاصل کر لی ہے اس لئے وہ امیر کی داد و دھش سے محظوظ ہوں گے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے داناؤں کی عنایات فوراً حاصل کرنی چاہئیں۔

''آپ دانائے روزگار ہیں! آپ ہمارے شہنشاہ عالی مرتبت کے تاج کے گہر ہائے بے بہا ہیں، آپ کا عقل و دانش میں کوئی جواب نہیں، آپ مجسم عقل و دانش ہیں جن کو خدا نے سب سے زیادہ عقل عطا فرمائی ہے!''

اس طرح انہوں نے قصیدہ خوانی شروع کر دی اور حسنِ بیان و جوش و خروش میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ انہیں اس کا پتا نہیں چلا کہ امیر غصے میں بل کھایا ہوا ان کو دیکھ رہا ہے اور ڈراؤنی خاموشی چھا گئی ہے۔

''اے علم کے آفتاب و ماہتاب ارصاحبانِ عقل و دانش!'' انہوں نے اپنی قصیدہ خوانی جاری رکھی اور غلامانہ جذبے کے جوش میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک ملک الشعرا کی نظر امیر پر پڑی اور ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی چکنی چپڑی زبان تالو سے چپک گئی ہے۔ اس کے بعد اس سب بھی چپ ہو گئے اور یہ سمجھ کر کانپنے لگے کہ انہوں نے اپنے جوش میں کتنی زبردست غلطی کی ہے۔

''ناکارہ بدمعاشو!'' غصے سے بپھرے ہوئے امیر نے کہا۔ ''کیا تمہارے خیال میں ہم یہ نہیں جانتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کا سر قلم کر دیا جائے یا اس کو پھانسی دے دی جائے تو وہ پھر زندہ نہیں ہو سکتا؟ لیکن اس کے لئے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ آدمی کو گرفتار کیا جائے اور تم نے، بدمعاش، ناکارہ، پاجی اور احمقوں نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ تمام وزراء۔ عمائدین، دانا اور شعرا اس وقت تک تنخواہ نہیں پائیں گے جب تک خواجہ نصر الدین گرفتار نہ کیا جائے گا۔ اور یہ اعلان کر دیا جائے کہ جو بھی اس کو گرفتار کرے گا اس کو تین ہزار تانگے انعام دیا جائے گا! ہم تم کو اس بات سے بھی آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ تمہاری کاہلی، بے وقوفی اور لاپروائی کو دیکھ کر ہم نے ایک نئے دانا کو اپنی خدمت میں بغداد سے طلب کیا ہے جن کا نام مولانا حسین ہے اور جو ابھی تک امیر المومنین خلیفہ بغداد کی ملازمت میں تھے۔ وہ راستے میں ہیں اور جلد ہی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ لعنت ہو تم پر نرم گدوں پر اینڈنے والے، پیٹ کے غلامو، اور حرص کے بندو! نکال دو ان کو یہاں سے!'' اس نے غصے کے بڑھتے ہوئے طوفان میں پہرے داروں کو حکم دیا۔

''ان سب کو یہاں سے نکال دو، نکال دو!''

گم صم درباریوں پر پہرے دار جھپٹے اور بلا پاس ولحاظ اس کو دروازے تک کھینچتے ہوئے لے گئے اور پھر سیڑھیوں سے نیچے ڈھکیل دیا۔ سیڑھیوں کے نیچے دوسرے پہرے داروں نے ان کی گردن ناپی اور راستے میں ان کی لات گھونسوں اور تھپڑوں سے خاطر تواضع کی۔ درباری ایک دوسرے سے آگے نکل کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سفید بالوں والا دانا تو خود اپنی داڑھی میں الجھ کر گرا، دوسرے دانا نے اس سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اس کا سر ایک گلاب کی جھاڑی میں چلا گیا۔ یہاں وہ بڑی دیر تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ اپنی ٹیڑھی گردن کی وجہ سے وہ اس وقت بھی کسی تنگ دراڑ سے جھانکتا معلوم ہوتا تھا۔

19

امیر سارے دن غصے میں بھرا بیٹھا رہا۔ دوسرے دن صبح کو بھی درباریوں نے اس کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھے۔ اس کو بہلانے اور خوش کرنے کی تمام کوششیں بے سود رہیں۔ رقاصائیں اپنے طنبورے بجا بجا کر عود و عنبر کے مہکتے ہوئے بادلوں کے درمیان تھرک رہی تھیں، اپنے گداز کولھے مٹکا رہی تھیں، موتی جیسے دانت چمکا رہی تھیں اور اپنے مرمریں سینے اس طرح عریاں کر رہی تھیں جیسے اتفاقاً یہ بات ہوگئی ہو۔ لیکن یہ سب بیگار تھا۔ امیر نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اس کے چہرے پر غصے کے گہرے آثار درباریوں کے دلوں کو دہلاتے رہے۔ درباری مسخروں، کرتب دکھانے والوں، شعبدہ بازوں اور ان ہندستانی مداریوں کی سب حرکتیں اور کرتب بھی بے کار رہے جو بین بجا کر سانپوں کو لبھاتے ہیں۔

درباری آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے:

''لعنت ہو اس خواجہ نصر الدین پر! ولد الزنا! کیا آفت اس نے ہم پر نازل کر دی ہے!''

وہ ارسلان بیگ پر امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

ارسلان بیگ نے داروغہ خانے میں اپنے انتہائی چالاک جاسوسوں کو طلب کیا جن میں وہ چیچک رو بھی تھا جس کو خواجہ نصر الدین نے انتہائی معجزانہ طریقے سے شفا بخشی تھی۔

''تم سب سنو'' ارسلان بیگ نے کہا ''اعلیٰ حضرت امیر کے حکم سے تمہاری تنخواہیں اس وقت تک

کے لئے روک دی گئی ہیں جب تک کہ خواجہ نصرالدین گرفتار نہ ہو جائے۔ میں یہ قول دیتا ہوں کہ اگر تم اس کا پتا نہ لگا سکے تو نہ صرف تم اپنی تنخواہوں سے ہاتھ دھوؤ گے بلکہ اپنے سروں سے بھی۔ اس کے برخلاف جو بھی سب سے زیادہ جوش کے ساتھ کام کر کے خواجہ نصرالدین کو گرفتار کرے گا اسے تین ہزار تانگے کا انعام ملے گا اور ترقی بھی۔ اس کو تمام جاسوسوں کا افسر مقرر کیا جائے گا۔''

جاسوس دم کے دم درویشوں، بھک منگوں، سقوں اور سوداگروں کے بھیس بدل بدل کر روانہ ہو گئے۔ اس دوران میں چیچک رو جاسوس نے جو دوسروں سے زیادہ چالاک تھا ایک غالیچہ، کچھ مٹر کے دانے، ایک تسبیح اور پرانی کتابیں لیں اور بازار کی طرف چل دیا۔ وہاں وہ جوہریوں اور گندھیوں کے بازاروں کی نکڑ پر بیٹھ گیا۔ یہاں اس نے رمال کے بھیس میں عورتوں کے ذریعے سن گن لینے کا منصوبہ گانٹھا۔

ایک گھنٹے کے بعد سیکڑوں نقیبوں نے بازار کے چوراہے پر تمام مسلمانوں سے مخاطب ہو کر اپنی بات توجہ سے سننے کے لئے کہا۔ انہوں نے امیر کا فرمان سنایا کہ خواجہ نصرالدین کو امیر کا دشمن اور مرتد قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے کسی قسم کا تعلق ممنوع ہے خصوصاً اس کو پناہ دینا جس کی سزا موت ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی اسے پکڑ کر امیر کے پہرے داروں کے حوالے کرے گا تو اس کو تین ہزار تانگوں کے انعام اور دوسری عنایات سے سرفراز کیا جائے گا۔

چائے خانے کے مالک، ٹھٹھیرے، آہن گر، بنکر، سقے اور ساربان سبھی آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے:

''اس کے لئے امیر کو بہت دن انتظار کرنا ہوگا۔''

''خواجہ نصرالدین کو ایسے دھر لینا آسان نہیں ہے!''

''کوئی رقم بھی بخارا کے لوگوں کو خواجہ نصرالدین کے ساتھ دغا کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔''

لیکن سود خور جعفر جو اپنے قرض داروں پر ظلم ستم ڈھانے کے لئے بازار میں روزمرہ کی پھیری لگا رہا تھا کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ''تین ہزار تانگے'' اس نے افسوس کے ساتھ سوچا۔ ''کل تو یہ رقم تقریباً میرے جیب میں پہنچتے پہنچتے رہ گئی! خواجہ نصرالدین اس لڑکی کے پاس پھر آئے گا لیکن میں اس کو تن تنہا تو نہیں گرفتار کر سکتا اور اگر میں کسی اور کو یہ خبر بتاتا ہوں تو وہ مجھ سے انعام جھپٹ لے گا۔ نہیں، مجھے کچھ اور کرنا

چاہئے۔''

وہ محل کی طرف چل پڑا۔

وہ بڑی دیر تک کھٹ کھٹا تا رہا لیکن دوراز ے بندر ہے۔ پہرے داروں نے نہیں سنا کیونکہ وہ خواجہ نصر الدین کو پکڑنے کے منصوطوں پر گرما گرم بحث کرر ہے تھے۔

''اے بہادر سپاہیو! کیا تم سور ہے ہو؟'' سودخور پریشان ہر کر چیخا۔ اس نے آہنی کنڈا ابھی بجایا لیکن قدموں کی چاپ دیر میں سنائی دی اور زنجیروں کے کھلنے کی جھنکار ہوئی۔ پھاٹک کا دروازہ کھلا۔

سودخور کی بات سننے کے لئے ارسلان بیگ نے سر ہلایا:

''معزز جعفر، میں آپ کو یہ مشورہ نہ دوں گا کہ آپ امیر سے آج ملیں۔ وہ آج بہت غصے میں ہیں اور اداس بھی۔''

''لیکن میرے پاس ان کی افسردگی دور کرنے کا ایک لا جواب علاج ہے'' سودخور نے فوراً جواب دیا۔ ''معزز ارسلان بیگ، معاونِ تخت وتاج، فاتح دشمنان! میرے کام میں دیر نہ ہونا چاہئے۔ جا کر امیر سے کہئے کہ میں ان کا رنج وغم دور کرنے آیا ہوں۔''

امیر اس سے بڑے روکھے پن سے ملا۔ وہ بولا:

''بتا جعفر! لیکن اگر تیری بات نے ہمارا دل نہ خوش کیا تو تجھ کو دوسودرے لگائے جائیں گے۔''

''اے شہنشاہ اعظم جس کی شان وشوکت کو نہ تو کوئی بادشاہ ماضی میں پہنچا ہے اور نہ مستقبل میں پہنچے گا!'' سودخور نے کہا ''آپ کے ناچیز خادم کو یہ پتا ہے کہ ہمارے شہر میں ایک ایسی دوشیزہ رہتی ہے جس کو میں حقیقت میں لاکھوں حسیناؤں کی ایک حسینہ کہہ سکتا ہوں۔''

امیر کو فوراً دلچسپی پیدا ہوگئی اور اس نے سر اٹھایا۔

''آقا!'' سودخور کی ہمت بندھی اور اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میرے پاس اس کے حسن کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ وہ سروقد، دلربا، نازک اندام ہے۔ اس کے جسم کا ہر عضو سانچے میں ڈھلا ہے۔ اس کی پیشانی روشن، چہرہ شہابی، آنکھیں غزالی اور بھوئیں ہلالی ہیں! اُس کے گال گلابی اور دھانہ مہرِ سلیمانی کی مانند ہے، اس کے ہونٹ مونگے جیسے اور دانت موتیوں کی لڑی ہیں۔ اس کے پستان مرمریں ہیں جن پر چیری کے دوسرخ پھل رکھے ہیں اور اس کے شانے...''

امیر نے اس کے زورِ بیان کو روکا:

''اگر واقعی وہ ایسی ہی ہے جیسا کہ تم کہتے ہو تو وہ میرے حرم کے لائق ہے۔ وہ ہے کون؟''

''وہ حسب نسب سے تو غریب ہے، آقا۔ وہ ایک غریب کسگر کی لڑکی ہے جس کے نام سے میں اعلیٰ حضرت کے کانوں کی توہین کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں رہتی ہے لیکن کیا امیر کے غلام کو اس کے لئے انعام ملے گا؟''

امیر نے بختیار کی طرف اشارہ کیا اور ایک تھیلی سودخور کے قدموں پر آن گری۔ جعفر نے اس کو حریصانہ عجلت کے ساتھ اٹھالیا۔

''اگر وہ تمہاری تعریف کے مطابق ثابت ہوئی تو تم کو اتنا ہی اور انعام ملے گا'' امیر نے کہا۔

''ہمارے لائق آقا کی فیاضی کا بول بالا رہے!'' سودخور نے ہانک لگائی۔ ''لیکن جلدی کرنی چاہئے کیونکہ اس غزال رعنا کے پیچھے صیاد لگا ہے۔''

امیر کی تیوریوں پر بل آ گئے اور ناک کے بانسے پر ایک موٹی جھری نمودار ہوگئی۔

''خواجہ نصرالدین!'' سودخور نے جواب دیا۔

''پھر وہی خواجہ نصرالدین! اس میں بھی خواجہ نصرالدین! وہ ہر جگہ ہے... اور تم ہو کہ...'' یہ کہتے ہوئے امیر اپنے وزیروں کی طرف مخاطب ہوگیا اور تخت ہلنے لگا۔ ''سوائے اس کے اور کچھ نہیں کرتے کہ ہماری شاہانہ شخصیت کے لئے باعث شرم بنو۔ اے ارسلان بیگ! اس کا انتظام کر، یہ لڑکی ہمارے محل میں آنا ہے۔ اگر تو اس میں ناکام رہا تو واپسی پر جلاد تیرا منتظر ہوگا!''

20

خواجہ نصرالدین نے ابھی اپنی نویں صراحی ختم کی تھی اور تسلے سے ڈھیر سی مٹی دسویں صراحی بنانے کے لئے نکالی ہی تھی کہ اچانک دور ازے پر زور کی حاکمانہ دستک ہوئی۔ پڑوسی جو اکثر نیاز کے یہاں پیاز یا چٹکی بھر مرچ مانگنے آتے تھے اس طرح نہیں کھٹکھٹاتے تھے۔ خواجہ نصرالدین اور نیاز نے ایک دوسرے کی طرف گھبرا کر دیکھا جب بھاری ضربوں کی بارش سے دروازے پھر کھڑکھڑایا۔ اس مرتبہ خواجہ نصرالدین کے تیز کانوں نے ہتھیاروں کی چھنکار سن لی۔

''پہرے دار'' انہوں نے نیاز سے چپکے سے کہا۔

''بھاگو!'' نیاز بولا۔

خواجہ نصرالدین باغ کی دیوار پھلانگ گئے اور نیاز نے دورازہ کھولنے میں اتنا وقت لیا کہ وہ دور نکل جائیں۔ جیسے ہی بڈھے نے کنڈی کھولی انگور کی باغیچے سے مینائیں بھر بھرا کر اڑیں لیکن بے چارے نیاز کے پر تو تھے نہیں وہ اڑ کر کہاں جاتا۔ وہ زرد پڑ گیا اور کانپ کر ارسلان بیگ کے سامنے جھک گیا۔

''کسگر، تیرے گھر کو بڑی عزت نصیب ہوئی ہے'' ارسلان بیگ نے کہا ''مرکز جہاں، ظلِ سبحانی، ہمارے مالک و آقا، خدا اُن کو برس ہا برس سلامت رکھے، امیر اعظم نے نہ نفس نفیس عنایت کر کے تیرا حقیر نام لیا۔ ان کو معلوم ہوا ہے کہ تیرے باغ میں ایک حسین گلاب کھلا ہے اور وہ اس پھول کو اپنے محل کی زیبائش بنانا چاہتے ہیں۔ تیری بیٹی کہاں ہے؟''

کسگر کا سفید سر ہلنے لگا اور اس کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ جب پہرے دار اس کی بیٹی کو گھر کے باہر گھسیٹ کر صحن میں لائے تو اس نے اس کی ایک مختصر سی مدھم چیخ سنی۔ وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا اور پھر نہ تو اس نے کچھ دیکھا اور نہ سنا۔

''وہ فرطِ مسرت سے غش کھا گیا ہے'' ارسلان بیگ نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔ ''اس کو چھوڑو۔ جب وہ ہوش میں آئے گا تو محل میں آ کر امیر سے اپنے بے پناہ شکرئے کا اظہار کر سکتا ہے۔ چل پڑو!''

اس دوران میں خواجہ نصرالدین پچھلی گلیوں میں منڈلا رہے تھے۔ وہ دوسرے سرے سے سڑک پر واپس آئے۔ جھاڑیوں کے پیچھے سے انہیں نیاز کا پھاٹک دکھائی دے رہا تھا جہاں انہیں دو سپاہی اور تیسرا آدمی دکھائی دیا جو جعفر سود خور تھا۔

''اچھا، لنگڑے کتے! تو سپاہیوں کو میری گرفتاری کے لئے لایا تھا!'' خواجہ نصرالدین نے صحیح حالات سے لاعلم ہونے کی وجہ سے اس طرح سوچا۔ ''بہت اچھا، اچھی طرح ڈھونڈ لے! لیکن تو خالی ہاتھ لوٹے گا۔''

لیکن وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹے۔ خواجہ نصرالدین دہشت سے بالکل پتھر ہو گئے جب انہوں نے دیکھا کہ سپاہی ان کی محبوبہ کو پھاٹک سے باہر لئے جا رہے ہیں۔ وہ ہاتھ پیر مار رہی تھی اور دل کش آواز میں چیخ رہی تھی لیکن سپاہیوں نے اس کو مضبوط پکڑ کر سپروں کے دھرے حلقے سے گھیر رکھا تھا۔

یہ جون کی گرم دوپہر تھی لیکن خواجہ نصرالدین کے جسم میں ایک سرد کپکپی دوڑ گئی۔ پہرے دار قریب آ رہے تھے کیونکہ ان کا راستہ اس جگہ سے ہو کر گذرتا تھا جہاں خواجہ نصرالدین چھپے ہوئے تھے۔ وہ پاگل ہو گئے۔ انہوں نے اپنا خنجر نیام سے کھینچ لیا اور زمین سے چمٹ کر لیٹ گئے۔ ارسلان بیگ اپنا چمکا ہو بلا لگائے دستے کے آگے آگے تھا۔ خنجر اس کی داڑھی کے نیچے چربی دار گردن میں گہرا اتر گیا ہوتا اگر اچانک ایک بھاری ہاتھ خواجہ نصرالدین کو تھام نہ لیتا اور ان کو زمین پر دبائے نہ رکھتا۔ انہوں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنا ہاتھ چوٹ کرنے کے لئے بلند کیا لیکن یوسف لوہار کا کالک سے لپا ہوا چہرہ پہچان کر ان کا ہاتھ نیچے گر گیا۔

''چپکے پڑے رہو'' لوہار نے آہستہ سے کہا ''چپکے پڑے رہو! کیا پاگل ہو گئے ہو وہ بیس سے پیر تک مسلح آدمی ہیں اور تم اکیلے ہو اور پھر تمہارے پاس کوئی ٹھکانے کا ہتھیار بھی تو نہیں ہے۔ تم ختم ہو جاؤ گے اور لڑکی مدد بھی نہ کر سکو گے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ چپکے پڑے رہو!''

لوہار نے انہیں اس وقت تک دبائے رکھا جب تک کہ دستہ سڑک کی موڑ پر غائب نہیں ہو گیا۔

''ارے، تم نے مجھے کیوں روک لیا؟'' خواجہ نصرالدین چلائے۔ ''اچھا ہی ہوتا اگر میں مر جاتا۔''

''کسی شیر پر ہاتھ ڈالنا یا تلوار پر مکا تاننا دانش مندوں کا کام نہیں ہے'' لوہار نے درشتی سے کہا۔ ''میں پہرے داروں کے پیچھے بازار سے لگا تھا اور میں تمہاری غیر دانشمندانہ حرکت روکنے کے لئے بروقت پہنچ گیا۔ تمہیں لڑکی کے لئے مرنا نہیں چاہئے بلکہ کوشش کر کے اس کو بچانا چاہئے۔ یہ مشکل تو ہے لیکن زیادہ اچھا ہو گا۔ غمگین خیالوں میں ڈوب کر وقت نہ گنواؤ، جاؤ اور کچھ کرو۔ ان کے پاس تلواریں، ڈھالیں اور نیزے ہیں، لیکن اللہ نے تم کو طاقت ور اسلحہ عطا کئے ہیں۔ وہ ہیں تیز دماغ اور ہوشیاری جب میں تم اپنا ثانی نہیں رکھتے'' اس نے کہا۔ اس کے الفاظ مردانہ اور اُس لوہے کی طرح مضبوط تھے جس کو وہ اپنی تمام زندگی ڈھالتا رہا تھا۔ ان کو سن کر خواجہ نصرالدین کا ڈانواں ڈول دل بھی لوہے کی طرح سخت ہو گیا۔

''لوہار، تمہارا شکریہ، زندگی میں اس سے زیادہ تلخ لمحے مجھے کبھی نہیں پیش آئے لیکن ناامین ہو کر ہار نہ ماننا چاہئے۔ تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے ہتھیاروں کا کارآمد استعمال کروں گا۔''

وہ جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ اس وقت سود خور بھی ایک زریب کے گھر سے نکلا۔ وہ کسی

کمہار سے قرض کے تقاضے کے لئے رک گیا تھا جو واجب الادا ہو چکا تھا۔ خواجہ نصر الدین اور اس کا دوبدو سامنا ہو گیا۔ سود خور سفید پڑ گیا اور الٹے پیروں بھاگ کر دورازہ بند کر لیا اور کنڈی چڑھالی۔

''جعفر، او کینہ پرور، یاد رکھ، تیرے لئے مصیبت ہے!'' خواجہ نصر الدین نے چلا کر کہا۔ ''میں نے سب کچھ دیکھا اور سنا ہے میں سب جانتا ہوں۔''

ذرا خاموش رہ کر سود خور اندر سے بولا'' گیدڑ کی بیری نہیں ملی اور نہ عقاب کو۔ بیری شیر نے ہڑپ کر لی۔''

''یہ تو دیکھنا ہے'' خواجہ نصر الدین نے جواب دیا۔ ''جعفر، میرے الفاظ یاد رکھ! میں نے تجھ کو پانی سے کھینچ کر نکالا تھا۔ لیکن قسم کھاتا ہوں کہ میں تجھ کو اسی تالاب میں دبوؤں گا۔ کائی تیرے جسم سے لپٹ جائے گی اور گھاس پھوس تیرا گلا گھونٹ دیں گے۔''

جواب کا انتظار کئے بغیر خواجہ نصر الدین وہاں سے چل دئے۔ وہ نیاز کے گھر کے پاس سے بلا رکے گزر گئے۔ ان کو ڈر تھا کہ کہیں سود خور دیکھ نہ لے اور بعد کو بوڑھے کو موردِ الزام کرے۔ سڑک کے سرے پر اس کا بالکل یقین کرنے کے بعد کہ ان کا پیچھا نہیں کیا جا رہا ہے وہ تیزی سے ایک ویران جگہ کی طرف دوڑے جہاں گھاس پھوس اگی تھی اور دیوار کے اوپر سے پھاند کر کمہار کے گھر پہنچ گئے۔

بڈھا اب بھی منہ کے بل زمین پر پڑا تھا۔ اس کے قریب چند چاندی کے سکے جو ارسلان بیگ ڈال گیا تھا ہلکے سے چمک رہے تھے۔ بڈھے نے اپنا آنسوؤں اور مٹی سے لتھڑا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ پھر اس کی نظر ایک رومال پر پڑی جو اس کی بیٹی وہاں ڈال گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس نے سفید سرزمین سے ٹکرا دیا اور اپنی داڑھی نوچنے لگا۔

خواجہ نصر الدین کو اسے دلاسا دینے میں کافی وقت لگا۔ آخر کار اس کو اٹھا کر ایک بنچ تک لے گئے اور بٹھا دیا۔

''سنو، بڑے میاں! تمہیں کو تنہا رنج نہیں پہنچا ہے'' انہوں نے کہا ''شاید تم جانتے ہو کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے؟ تم جانتے ہو کہ ہم میں شادی کا عہد ہو چکا تھا؟ میں صرف اس بات کا منتظر تھا کہ تمہیں دینے کے لئے جہیز کی کافی رقم جمع کر لوں۔''

''مجھے جہیز کی کیا پرواہ؟'' بڈھے نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا ''کیا میں اپنی پیاری بیٹی کو اس کی

مرضی کے خلاف ناراض کرتا؟ بہرحال افسوس، ان باتوں کے لئے بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ اب تو وہ حرم میں پہنچ گئی ہو گی... ہائے توبہ کیسی بے عزتی ہوئی!'' وہ رونے پیٹنے لگا ''مجھے محل جانا چاہئے۔ میں امیر کے قدموں پر گر کر التجا کروں گا، روؤں گا اور گڑگڑاؤں گا اور اگر ان کے سینے میں پتھر کا دل نہیں ہے تو...''

وہ کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف چلا۔

''ٹھہرو!'' خواجہ نصرالدین نے کہا ''تم یہ بھولتے ہو کہ امیروں کا خمیر دوسرے انسانوں جیسا نہیں ہوتا ہے۔ ان کے دل ہی نہیں ہوتا۔ ان سے التا کرنا بیگار ہوتا ہے۔ بس یہی ممکن ہے کہ ان سے چیز چھین لی جائے اور میں، خواجہ نصرالدین گل جان کو امیر سے چھین لوں گا!''

''وہ بہت طاقت ور ہیں۔ ان کے پاس ہزاروں سپاہی، ہزاروں پہرے دار اور ہزاروں جاسوس ہیں! تم ان کے خلاف کیا کر سکتے ہو؟''

''ابھی تو نہیں جانتا کہ میں کیا کروں گا۔ لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ وہ گل جان کے پاس نہ تو آج اور نہ کل جائے گا! اور پرسوں بھی نہیں! اور نہ وہ اس کو کبھی رکھ سکے گا یا اس کا مالک بن سکے گا۔ یہ بات اسی طرح سچ ہے جیسے بخارا سے بغداد تک پھیلا ہوا میرا نام خواجہ نصرالدین! اس لئے اپنے آنسو پونچھ ڈالو، بڑے میاں۔ رو پیٹ کر میرے کان نہ کھاؤ۔ میرے خیال کو منتشر نہ کرو۔''

خواجہ نصرالدین تھوڑی دیر تک سوچتے رہے:

''بڑے میاں، یہ بتاؤ کہ تمہاری مرحومہ بیوی کے کپڑے کہاں رکھے ہیں؟''

''وہاں صندوق میں۔''

خواجہ نصرالدین کنجی لے کر گھر کے اندر غائب ہو گئے اور چند منٹ بعد عورت کے بھیس میں نکلے۔ ان کا چہرہ گھوڑے کے بالوں کی نقاب میں اچھی طرح چھپا ہوا تھا۔

''بڑے میاں، میرا انتظار کرو اور خود کچھ نہ کرنا۔''

انہوں نے اپنا گدھا باڑے سے نکالا، اس پر کاٹھی کسی اور نیاز کے گھر سے روانہ ہو گئے۔

21

گل جان کو محل کے باغ میں لے جا کر امیر کے سامنے پیش کرنے سے پہلے ارسلان بیگ نے حرم کے مشاطاؤں کو بلایا اور ان کو حکم دیا کہ وہ گل جان کو خوب اچھی طرح آراستہ و پیراستہ کریں تا کہ اس کے حسنِ کامل کو دیکھ کر امیر باغ باغ ہو جائے۔ مشاطائیں جو اس کام میں طاق تھیں فوراً حکم بجالائیں۔ انہوں نے گل جان کا اشک آلود چہرہ گرم پانی سے دھویا، نفیس ریشمی کپڑے پہنائے، آنکھوں میں سرمے کا دنبالہ دیا، گالوں پر غازہ ملا، بالوں کو گلاب کے تیل سے معطر کیا اور ناخون سرخ رنگے۔ پھر انہوں نے حرم سے خواجہ سراؤں کے عصمت مآب داروغہ کو بلایا۔ کسی زمانے میں یہ آدمی اپنی عیاشی کے لئے بخارا بھر میں مشہور تھا۔ ان معاملات میں اپنی معلومات اور تجربے ہی کی وجہ سے وہ اس اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا جس کے لئے دربار کے جراح نے اس کو خاص طور پر تیار کیا تھا۔ یہ اس کا فرض تھا کہ وہ امیر کی ایک سو ساٹھ داشتاؤں پر برابر نگاہ رکھے اور ہمیشہ اس کا خیال رکھے کہ وہ امیر کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے کافی دلکش ہوں۔

سال بسال اس کا فرض اور بھی بھاری ہوتا جا رہا تھا کیونکہ امیر دن بدن سرد پڑتا جا رہا تھا اور اس کی قوت کم ہوتی جاتی تھی۔ متعدد بار یہ ہو چکا تھا کہ خواجہ سراؤں کے داروغہ کو صبح صبح درجن بھر کوڑوں کا انعام ملا تھا۔ یہ تو اس کے لئے معمولی سزا تھی کہ جب وہ ماہ رو داشتاؤں کو امیر کے پاس جانے کے لئے تیار کرتا تو شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا، بالکل اسی طرح کے قرب میں جس کا سامنا جہنم میں رندمشربوں کو کرنا پڑے گا۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ رندمشربوں کو جہنم میں ستونوں سے زنجیروں میں کس دیا جائے گا اور ان کو لباس سے بے نیاز حوروں کے جھرمٹ میں کھڑا رہنا پڑے گا۔

خواجہ سراؤں کا داروغہ گل جان کا حسن دیکھ کر متحیر رہ گیا۔

''واقعی حسین ہے!'' اس نے اپنی باریک اور متحیر آواز میں کہا ''اس کو امیر کے پاس لے جاؤ۔ لے جاؤ! میری نگاہ سے ہٹاؤ!''

اور وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ اس نے اپنا سر دیواروں سے ٹکرایا۔ دانت پیسے اور رونے پیٹنے لگا ''ہائے قسمت، اب تو برداشت نہیں ہوتا!''

''یہ اچھی علامت ہے۔ اس کا مطلب ہے ہوا کہ ہمارا آقا نہال ہو جائے گا۔''

بے چاری خاموش گل جان کو محل کے باغ پہنچایا گیا۔

امیر اٹھا، اُس کے قریب آیا اور اس کی نقاب الٹ دی۔

تمام وزرا، عمائدین اور حکما نے اپنی آنکھیں قباؤں کی آستینوں سے ڈھک لیں۔

بڑی دیر تک امیر اس حسین چہرے سے اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکا۔

''سودخور نے ہم سے جھوٹ نہیں کہا تھا'' اس نے زور سے کہا ''جس رقم کا ہم نے وعدہ کیا تھا اس سے تگنی رقم اس کو دی جائے۔''

گل جان کو وہاں سے لے جایا گیا۔ امیر کافی خوش نظر آ رہا تھا۔

''اُس کو مشغلہ مل گیا۔ وہ اب خوش ہے۔ اس کے دل کا بلبل لڑکی کے گالوں کے گلاب پر فریفتہ ہو گیا ہے'' درباری آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے ''صبح کو وہ اور بھی خوش مزاج ہو جائے گا۔ خدا کی مہربانی سے طوفان بخیر و خوبی گذر گیا۔ ہم میں سے کسی پر بجلی نہ گری۔''

درباری شاعروں کی بھی ہمت بندھی، وہ آگے بڑھے اور باری باری امیر کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے۔ اس کے چہرے کا ماہِ کامل سے، قد کا نازک سرو سے اور اس کی حکومت کا دونوں جہان کے قران السعدین سے مقابلہ کرنے لگے۔

آخر میں، ملک الشعرا اس طرح اپنا قصیدہ پڑھنے آیا جیسے اچانک جوش میں آ کر اس نے اس کو کہہ ڈالا ہو حالانکہ اگلے دن کی صبح سے یہ قصیدہ اس کو نوکِ زبان تھا۔

امیر نے اس کو مٹھی بھر چھوٹے سکے پھینک دئے اور وہ فرش پر رینگ رینگ کر ان کو جمع کرنے لگا، ساتھ ہی وہ امیر کی جوتیوں کو بوسہ دینا نہیں بھولا۔

پھر امیر نے مربیانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا ''ہم نے بھی ایک نظم کہی ہے:

شام کو ہوا جو باغ میں گزر ہمارا
چاند چھپ گیا بادلوں میں شرم کا مارا
پرند ہوئے خاموش، ہوا بھی چال اپنی بھولی
اور ہم تھے وہاں استادہ ــــــ عظیم
عالی مرتبت، اٹل، مانندِ آفتاب، عظیم الشان

سب شاعر گھٹنوں کے بل گر کر داد و تحسین دینے لگے:

''کیا عظمت ہے! رودکی کو بھی مات کر دیا!''

کچھ تو فرش پر منہ کے بل گر گئے جیسے تعریف کے جوش میں ان پر غشی طاری ہوگئی ہو۔

رقاصائیں آ گئیں، ان کے پیچھے بھانڈ، مداری اور شعبدہ گر آئے اور امیر نے ان سب کو بڑی فیاضی سے انعامات دئے۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں سورج پر حکم نہیں چلا سکتا'' اس نے کہا ''نہیں تو میں اس کو جلد غروب ہونے کا حکم دیتا۔''

اور دربارہ اس پر خوشامدانہ قہقہے لگا رہے تھے۔

22

بازار میں بڑی چہل پہل تھی۔ یہ زوروں کے کاروبار کا وقت تھا، خرید و فروخت اولین دین میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سورج بلند ہوتا جا رہا تھا اور لوگ دھکی ہوئی اور طرح طرح کی مہک سے بھری دکانوں کے گھنے سائے میں پناہ لینے کے لئے بھاگ رہے تھے۔ دوپہر کی تیز دھوپ کی کرنیں نرکل کی چھتوں کے روشن دانوں میں عمودی گر رہی تھیں اور دوئیں کے ستونوں کی طرح استادہ معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی روشنی میں زربفت کے کپڑے جگمگا رہے تھے، نرم ریشم چمک رہا تھا اور مخمل ایک ہلکے دبے دبے شعلے کی طرح دھکتا معلوم ہوتا تھا۔ چاروں طرف عمامے، قبائیں اور رنگی ہوئی داڑھیاں روشنی میں چمک رہی تھیں۔ صاف شفاف تانبا آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر رہا تھا لیکن صرافوں کے نمدوں پر پھیلا ہوا کھرا سونا اس کو منہ چڑھا کر اپنی خالص چمک سے نیچا دکھا رہا تھا۔

خواجہ نصرالدین نے اپنے گدھے کی لگام اس چائے خانے کے سامنے کھینچی جس کے برآمدے سے ایک مہینہ پہلے انہوں نے بخارا کے شہریوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ کمہار نیاز کی مدد کریں اور اس کو امیر کی مہربانی سے بچائیں۔ اس تھوڑی سے مدت میں زندہ دل اور توندیل چائے خانے کے مالک علی سے جو سیدھا سادا ایماندار اور معتبر آدمی تھا خواجہ نصرالدین کی گہری دوستی ہوگئی تھی۔

موقع دیکھ کر خواجہ نصرالدین نے اسے پکارا:

''علی!''

چائے خانے کے مالک نے چاروں طرف دیکھا اور بھونچکا سا ہو گیا کیونکہ اس نے مردانی آواز سنی تھی اور دیکھ رہا تھا عورت۔

''یہ میں ہوں۔علی!'' خواجہ نصرالدین نے اپنی نقاب اٹھاتے بغیر کہا'' مجھے پہچانتے ہو نہ؟ خدا کے لئے اس طرح تو مت گھورو۔کیا تم جاسوسوں کو بھول گئے ہو؟''

احتیاط سے چاروں طرف دیکھ کر علی ان کو پچھلی کوٹھری میں لے گیا جہاں وہ ایندھن اور فاضل کیتلیاں رکھتا تھا۔ یہاں نمی اور ٹھنڈ تھی اور بازار کا شور بھی بہت مدہم سنائی دے رہا تھا۔

''علی، میرا گدھا لو'' خواجہ نصرالدین نے کہا''اس کو اچھی طرح کھلانا پلانا کیونکہ مجھے اس کی کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔اور میرے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی نہ کہنا۔''

''لیکن خواجہ نصرالدین تم نے عورتوں کے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں؟'' علی نے احتیاط سے دورازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں محل جا رہا ہوں۔''

''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا!'' چائے خانے کے مالک نے زور سے کہا''تم اپنا سر شیر کے منہ میں دینے جا رہے ہو۔''

''یہ کرنا ہی پڑے گا،علی۔تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کیوں۔آؤ ایک دوسرے سے رخصت ہو لیں کیونکہ اگر....میں خطرناک مہم پر جا رہا ہوں۔''

وہ ایک دوسرے سے بڑے خلوص سے گلے ملے۔چائے خانے کے نیک دل مالک کی آنکھوں میں آنسو آئے اور اس کے گول،سرخ رخساروں پر بہہ چلے۔اس نے خواجہ نصرالدین کو رخصت کیا اور پھر اپنی گہری آہوں کو روک کر جو اس کے توند کو دھونک رہی تھیں اپنے گاہکوں میں لگ گیا۔

اس کا دل بھاری تھا اور اس میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔وہ غمگین اور کھویا کھویا سا تھا___اس کے گاھکوں کو چاء دانیوں کے ڈھکن دو تین بار یہ یاد دلانے کے لئے بجانا پڑ رہے تھے کہ ان کو مزید چاء کی ضرورت ہے۔اپنے خیالوں میں وہ اپنے دبنگ دوست کے ساتھ محل میں تھا۔

پہرے داروں نے خواجہ نصرالدین کو روک دیا۔

''میں لاجواب مشک، عنبر اور عطر گلاب لائی ہوں'' خواجہ نصرالدین بڑی چالاکی کے ساتھ زنانی آواز بنا کر برابر کہہ رہے تھے ''اے سورماؤ مجھے حرم میں جانے دو۔ میں اپنا سامان بیچ کر تمہیں اس میں حصہ دوں گی___''

اپنے مقصد میں ناکام ہو کر خواجہ نصرالدین افسردہ ہو گئے اور سوچنے لگے۔ ان کے پاس وقت کم تھا کیونکہ آفتاب مائل بزوال ہو چلا تھا۔ انہوں نے فصیل کا چکر لگایا لیکن چینی مسالے نے پتھروں کو اس طرح آپس میں پیوست کر دیا تھا کہ ان کو ایک دراڑ، ایک سوارخ نہیں ملا۔ جہاں تک نہروں کے دھانوں کا سوال تھا ان میں ڈھلے ہوئے مضبوط لوہے کے سلاخ لگے تھے۔

''مجھے محل تو پہنچنا ہی ہے'' خواجہ نصرالدین نے اپنے آپ سے کہا ''میں چاہتا ہوں اور پہنچونگا۔ اگر نوشتہ تقدیر کے مطابق امیر نے میری منگیتر پر قبضہ کر لیا ہے تو تقدید کے مطابق مجھے وہ واپس کیوں نہ ملنا چاہئے؟ میرا دل کہتا ہے کہ یہی ہوگا۔''

وہ بازار واپس آ گئے۔ ان کو یقین تھا کہ اگر کوئی آدمی اٹل ہمت کے ساتھ کوئی ارادہ کر لے تو قسمت بھی اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ہزاروں ملاقاتوں، بات چیت اور جھگڑوں میں کوئی ایسی بات ضرور نکال آئے گی جو مناسب موقع فراہم کر دیگی اور آدمی اس کو ہوشیاری سے استعمال کر کے ان تمام رکاوٹوں کو دور کر سکتا ہے جو اس کی منزل اور اس کے درمیان حائل ہیں اور اس طرح اپنی قسمت کا لکھا پورا کر سکتا ہے۔ بازار میں ایسا ہی موقع کہیں ان کا منتظر تھا۔ ان کو اس میں قطعی یقین تھا اور وہ اس کی تلاش میں روانہ ہوئے۔

خواجہ نصرالدین سے کوئی چیز بچتی نہ تھی۔ ہزاروں آدمیوں کے شور وغل میں ایک لفظ، ایک چہرہ بھی نہیں۔ ان کا دماغ، کان اور نظریں اس غیر معمولی معیار کو پہنچ چکی تھیں جب انسان ان حدود کو آسانی سے پار کر جاتا ہے جو قدرت نے اس پر عائد کی ہیں۔ اس صورت میں جیت ان ہی کی ہوتی تھی کیونکہ اس دوران میں ان کے مخالفین تو عام انسانی حدود ہی میں رہتے تھے۔

اس جگہ جہاں جوہریوں اور گندھیوں کے بازار ایک دوسرے سے ملتے تھے خواجہ نصرالدین نے مجمع کے شور و ہنگامے کے درمیان ایک پھسلانے والی آواز سنی:

''تم کہتی ہو کہ تمہارا شوہر تم سے محبت نہیں کرتا اور ہم بستر نہیں ہوتا۔ اس کا ایک علاج ہے لیکن مجھے اس کے بارے میں خواجہ نصرالدین سے مشورہ کی ضرورت ہے۔ تم نے تو سنا ہی ہوگا کہ وہ یہاں ہیں؟

معلوم کر کے مجھے بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں۔ہم دونوں تمہیں تمہارے شوہر سے ملادیں گے۔''

خواجہ نصرالدین نے قریب جا کر دیکھا تو یہ چیچک رو رمال جاسوس تھا۔ایک عورت چاندی کا سکہ لئے اس کے سامنے کھڑی تھی۔رمال نے مٹر کے دانے قالین پر پھیلا رکھے تھے اور کسی پرانی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

''لیکن اگر تم خواجہ نصرالدین کو نہ ڈھونڈ سکیں'' وہ بولا''تو تمہارے اوپر مصیبت آ جائے گی۔تمہارا شوہر تمہیں سدا کے لئے چھوڑ دے گا!''

خواجہ نصرالدین نے طے کیا کہ اس رمال کو ذرا سبق سکھایا جائے۔وہ قالین کے پاس بیٹھ گئے:

''ذرا میری قسمت کا حال تو بتانا، دوسروں کی قسمتوں کے دانش مند پارکھ۔''

آدمی نے اپن دانے پھیلا دئے۔

''اے عورت!'' وہ اچانک چلایا جیسے اس پر بجلی گر پڑی ہو''عورت، تیرے اوپر مصیبت آ گئی، موت کا سیاہ ہاتھ تیرے سر پر سایہ کر چکا ہے!''

کئی لوگ جو ادھر ادھر کھڑے تھے اشتیاق سے قریب آ گئے۔

''میں موت کی چوٹ سے تجھے بچانے میں مدد تو کر سکتا ہوں لیکن اکیلا نہیں'' رمال نے اپنی بات جاری رکھی___ ''مجھے خواجہ نصرالدین سے مشورہ کرنا چاہئے۔اگر تو اس کو ڈھونڈ نکالے اور مجھے بتائے کہ وہ کہاں ہیں تو تیری جان بچ سکتی ہے۔''

''بہت اچھا، میں خواجہ نصرالدین کو تیرے پاس لاؤنگی۔''

''تو ان کو لائے گی؟'' رمال نے خوشی سے چونک کر کہا۔''کب؟''

''میں ان کو ابھی ابھی لا سکتی ہوں۔وہ بہت قریب ہی ہیں۔''

''کہاں ہیں وہ؟''

''یہیں، بہت قریب۔،،

رمال کی آنکھوں میں حریصانہ چمک پیدا ہوگئی۔

''لیکن کہاں ہیں وہ؟ میں ان کو نہیں دیکھتا۔''

''اور تم رمال بنے ہو! اتنا بھی نہیں جان سکتے؟ یہ رہے وہ!''

تیزی کے ساتھ عورت نے اپنا نقاب اٹھا دیا۔ خواجہ نصر الدین کا چہرہ دیکھ کر رمال پیچھے ہٹ گیا۔

''یہ رہے وہ!'' خواجہ نصر الدین نے دھرایا۔ ''تم مجھے سے کیا مشورہ کرنا چاہتے تھے؟ تم جھوٹے ہو، تم رمال نہیں بلکہ امیر کے جاسوس ہو! مسلمانو، اس پر مت اعتبار کرو! یہ تم کو دھوکہ دے رہا ہے! وہ یہاں بیٹھا خواجہ نصر الدین کا پتہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے!''

جاسوس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کوئی سپاہی نہ تھا۔ نا امیدی سے تقریباً روتے ہوئے اس نے خواجہ نصر الدین کو جاتے دیکھا۔ غصے سے بھرے مجمع نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

''امیر کا جاسوس، پاجی کتا!'' چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

قالین لپیٹتے ہوئے رمال کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پھر وہ محل کی طرف بگٹٹ بھاگا۔

23

گندے، میلے، بدبودار اور دھوئیں سے بھرے ہوئے پہرے داروں کے کمرے میں سپاہی ایک پرانے نمدے پر جو چیلڑوں سے بھرا تھا بیٹھے اپنا بدن کھجا رہے تھے اور خواجہ نصر الدین کو پکڑنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

''تین ہزار تانگے'' وہ بولے ''سوچو تو، تین ہزار تانگے اور جاسوسوں کے داروغہ منصب!''

''کوئی نہ کوئی تو خوش قسمت ہوگا ہی!''

''کاشکہ میں وہ خوش قسمت ہوتا!'' ایک موٹے کاہل سپاہی نے جو سب سے احمق تھا آہ بھر کر کہا۔ وہ ابھی تک اس لئے برخاست نہیں کیا گیا تھا کہ وہ کچا انڈا بلا چھلکا توڑے مسلم نگل جانے کا آرٹ جانتا تھا۔ وہ کبھی کبھی امیر کا دل اس کرتب سے بہلاتا تھا اور اس سے کچھ انعام حاصل کر لیتا تھا حالانکہ بعد کو اسے سخت درد کی اذیت برداشت کرنی پڑتی تھی۔

چیچک رو جاسوس پہرے داروں کے کمرے میں بالکل بگولے کی طرح داخل ہوا:

''وہ یہاں ہے! خواجہ نصر الدین بازار میں ہے! وہ عورت کے بھیس میں ہے!''

سپاہی اپنے اسلحہ اٹھا کر پھاٹک کی طرف بھاگے۔

چیچک رو جاسوس بھی ان کے پیچھے پیچھے چیختا ہوا بھاگا:

''انعام میرا ہے! سنتے ہونا! میں نے اس کو پہلے دیکھا! انعام میرا ہے!''

پہرے داروں کو دیکھ کر لوگ جلدی ادھر ادھر بھاگنے لگے اور بھگدڑ کی وجہ سے بازار میں ہلچل مچ گئی۔ سپاہی مجمع کے اندر گھس گئے۔ ان میں سے ایک بید ہڑک سپاہی نے ایک عورت کو پکڑ کر اس کا نقاب چاک کر دیا۔ وہ سارے مجمع کے سامنے بے نقاب ہوگئی۔

عورت نے زور کی چیخ ماری۔ دوسری سمت سے ایک اور چیخ گونجی۔ پھر تیسری عورت سپاہیوں کے پنجے سے نکلنے کی کشمکش کرتی ہوئی چیخی۔ اب چوتھی اور پانچویں... سارا بازار عورتوں کی چیخوں، آہ بکا اور سسکیوں سے گونج اٹھا۔

متحیر مجمع پر جمود طاری تھا۔ بخارا میں تو ایسا نراج کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ بعض کے چہرے زرد اور بعض کے سرخ پڑ گئے۔ ہر دل بے چین ہو گیا۔ سپاہی اپنا کام کرتے رہے۔ وہ عورتوں کو پکڑتے تھے، ان کو ادھر ادھر کھینچتے تھے، ان کو مارتے پیٹتے تھے اور ان کے کپڑے پھاڑ رہے تھے۔

''مدد! مدد!'' عورتیں چلا رہی تھیں۔

یوسف لوہار کی آواز مجمع کے اوپر زور سے گونجی اور چھا گئی:

''مسلمانو! تم کیوں ہچکتے ہو؟ کیا یہ کم ہے کہ سپاہی ہم کو لوٹتے ہیں؟ اس پر وہ دن دوپہر ہماری عورتوں کی بے عزتی کرتے ہیں!''

''مدد! مدد!'' عورتیں چلا رہی تھیں۔

مجمع غصے سے گرجکر آگے بڑھا۔ ایک سقے نے اپنی بیوی کی آواز پہچان لی اور اس کو چھڑانے کے لئے لپکا۔ سپاہیوں نے اسے الگ ڈھکیل دیا لیکن دو جولاہوں اور تین ٹھٹیروں نے اس کی مدد کی اور سپاہیوں کو پیچھے ڈھکیلا۔ اب لڑائی شروع ہوگئی۔

رفتہ رفتہ ہر ایک اس لڑائی میں شامل ہوا گیا۔ سپاہیوں نے اپنی تلواریں کھینچ لیں۔ ہر طرف سے ان پر برتن، کشتیاں، صراحیاں، کیتلیاں، نعلیں اور لکڑی کے تختے برسنے لگے۔ ان کو بچنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ سارے بازار میں لڑائی پھیل گئی۔

اس دوران میں امیر اپنے محل میں آرام سے اونگھ رہا تھا۔ اچانک وہ اچھلا اور بھاگ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ اس کو کھولا اور پھر دہشت کی حالت میں یک دم بند کر دیا۔

بختیار دوڑتا ہوا آیا۔ وہ زرد تھا اور کانپ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' امیر نے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟ تو پیں کہاں ہیں؟ ارسلان بیگ کہاں ہے؟''

ارسلان بیگ دوڑتا ہوا آیا اور منہ کے بل گر پڑا:

''آقا میرا سر قلم کرنے کا حکم دیجئے!''

''یہ کیا ہے؟ کیا معاملہ ہے؟''

ارسلان بیگ نے پڑے پڑے جواب دیا:

''آقا آفتاب جہاں اور...''

''بند کر!'' امیر نے بے تاب ہو کر غصے میں پیر پٹکے۔ ''یہ سب بعد کو کہہ لینا! کیا ہو رہا ہے؟''

''خواجہ نصر الدین...اس نے عورت کا بھیس بدلا۔ یہ سب اسی کا قصور ہے، یہ سب خواجہ نصر الدین کا کیا دھرا ہے! میرا سر قلم کرنے کا حکم دیجئے!''

لیکن امیر کو دوسری فکر پڑی تھی۔

24

آج کی ہر گھڑی خواجہ نصر الدین کے لئے بیش قیمت تھی۔ اس لئے انہوں نے بازار میں آوارہ گردی نہیں کی۔ لیکن ایک سپاہی کا جبڑا اور دوسرے کے دانت توڑ کر اور تیسرے کی ناک چپٹی کر کے وہ صحیح سلامت اپنے دوست علی کے چاء خانے لوٹ آئے۔ یہاں انہوں نے زنانی پوشاک اتار دی اور رنگین عمامہ اور مصنوعی داڑھی لگا لی۔ اس طرح بھیس بدل کر وہ ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں سے وہ ساری لڑائی کا مشاہدہ کر سکیں۔

مجمع میں گھرے ہوئے سپاہی اپنے کو پوری طاقت کے ساتھ بچا رہے تھے۔ خواجہ نصر الدین کے بالکل پاس چائے خانے کے برابر ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ ان سے کسی طرح ضبط نہیں ہوا اور انہوں نے اپنی چاء دانی سپاہیوں پر خالی کر دی اور یہ اس مہارت سے کیا کہ انڈے گٹ کر جانے والے موٹے اور کاہل سپاہی کی گردن پر گرم پانی دوڑ گیا۔ وہ چلا کر زمین پر چت گر پڑا اور اپنے ہاتھ پیر ہوا میں پھینکنے لگا۔ اس پر نگاہ ڈالے بغیر خواجہ نصر الدین پھر اپنے خیالات میں ڈوب گئے۔ اچانک انہوں نے کسی بڈھے

کی کانپتی ہوئی چیخ کی آواز سنی:

''مجھے راستہ دو، راستہ دو، خدا کے واسطے! یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

چائے خانے سے ذرا دور پر جہاں زوروں کی گتھم گتھا ہو رہی تھی بیچوں بیچ میں ایک سفید ریش، عقاب جیسی ناک والا بڈھا اونٹ پر بیٹھا تھا۔ دیکھنے میں وہ عرب معلوم ہوتا تھا۔ اپنے عمامے کے سرے کے پیچ کی وجہ سے وہ صاحب علم و فضل معلوم ہوتا تھا۔ وہ انتہائی خوف کی حالت میں اونٹ کے کوہان سے لپٹا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف لڑائی ہو رہی تھی۔ کوئی اس کا پیر پکڑ کر اونٹ سے کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا اور بڈھا بچنے کے لئے بے تحاشا جدوجہد کر رہا تھا۔ غل غپاڑے اور چیخوں کی گونج کانوں کو بہرہ کئے دے رہی تھی۔

پناہ پانے کی انتہائی کوشش میں بڈھا کسی نہ کسی طرح چائے خانے تک پہنچ گیا۔ بار بار چونک کر اور گھوم گھوم کر دیکھتے ہوئے اس نے خواجہ نصرالدین کے گدھے کے برابر اپنا اونٹ باندھا اور برآمدے پر چڑھ آیا۔

''خدا کی قسم! تمہارے شہر میں کیا ہو رہا ہے؟''

''بازار ہے'' خواجہ نصرالدین نے مختصر سا جواب دے دیا۔

''کیا بخارا میں ہمیشہ ایسے ہی بازار ہوتے ہیں؟ بھلا میں ایسے مجمع میں کبھی محل تک پہنچ سکوں گا؟''

''محل'' کا لفظ سنتے ہی خواجہ نصرالدین تاڑ گئے کہ بڈھے سے یہ ملاقات وہ موقع فراہم کرتی ہے جس کے وہ منتظر تھے اور وہ اب امیر کے حرم تک پہنچ کر گل جان کو رہا کر سکیں گے۔

لیکن سبھی جانتے ہیں کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ دانائے روزگار شیخ سعدی شیرازی کہہ گئے ہیں ''دیر آید درست آید'' اس لئے خواجہ نصرالدین نے بے صبری سے کام نہیں لیا۔

بڈھا کراہ کراہ کر آہیں بھر رہا تھا:

''اللہ اکبر! اے مومنوں کے محافظ! میں محل تک کیسے پہنچوں؟

''یہاں کل تک انتظار کیجئے'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔

''میں انتظار نہیں کر سکتا'' بڈھے نے زور سے کہا۔ ''محل میں میرا انتظار ہو رہا ہے۔''

خواجہ نصرالدین نے قہقہہ لگایا:

''محترم، سفید ریش بزرگ! میں آپ کا پیشہ اور کام تو نہیں جانتا ہوں لیکن کیا آپ کو قطعی یقین ہے کہ محل میں لوگ آپ کے بغیر کل تک کام نہیں چلا سکتے؟ بخارا میں بڑے بڑے حکما و عقلا ہفتوں تک محل میں باریابی کا انتظار کرتے ہیں۔ آپ کو آخر اس سے مستثنیٰ کیوں کیا جائے گا؟''

''اچھا تو سن لو'' بڈھے نے خواجہ نصرالدین کی بات کا نابرا مان کر غرور سے کہا ''میں مشہور عاقل نجومی اور حکیم ہوں۔ میں امیر کی دعوت پر بغداد سے آیا ہوں تا کہ ان کی ملازمت میں رہ کر امور ریاست میں ان کی مدد کروں۔''

''اوہ!'' خواجہ نصرالدین نے ادب سے جھک کر کہا۔ ''خوش آمدید، شیخ دانا! میں بغداد جا چکا ہوں اور میں اس شہر کے عقلا سے واقف ہوں۔ اپنا نام بتایئے!''

''اگر تم بغداد جا چکے ہو تو تم نے ان خدمات کا ذکر ضرور سنا ہوگا جو میں نے خلیفہ کے لئے کی ہیں۔ میں نے ان کے پیارے بیٹے کی جان بچائی جس کا اعلان سارے ملک میں کیا گیا۔ میرا نام مولانا حسین ہے۔''

''مولانا حسین!'' خواجہ نصرالدین نے حیرت سے کہا ''کیا یہ ممکن ہے کہ آپ بذات خود مولانا حسین ہوں؟''

بوڑھا یہ دیکھ کر اطمینان سے مسکرایا کہ اس کی شہرت اپنے شہر بغداد سے باہر نکل کر اتنی پھیل چکی ہے۔

''تمہیں حیرت کیوں ہوئی؟'' اس نے کہا۔ ''ہاں، میں بذات خود مولانا حسین ہوں، وہ دانا جس کا عقل و دانش میں، ستارہ شناسی میں اور مسیحائی میں کوئی جواب نہیں۔ لیکن مجھ میں غرور فخر نہیں ہے۔ دیکھو نا میں تم جیسے معمولی آدمی سے کس سادگی کے ساتھ باتیں کر رہا ہوں۔''

بڈھے نے ایک تکیہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کی ٹیک لے لی۔ وہ اپنی عقل و دانش کا تفصیلی حال بتا کر اپنے ہم نشین کو نوازنا چاہتا تھا۔ اس کو امید تھی کہ وہ بڑے فخر کے ساتھ دوسرے لوگوں سے مشہور دانا مولانا حسین سے ملاقات کے بارے میں تفصیل سے بتائے گا، اس کی دانائی کے گن گائے گا اور سننے والوں کے دل میں دانا کا احترام بڑھانے کے لئے اس میں مبالغہ بھی کرے گا اور اس طرح اپنے لئے بھی عزت کمائے گا۔ کیونکہ وہ لوگ یہی رویہ اختیار کرتے ہیں جن پر بڑے لوگ عنایات کرتے ہیں۔

''اس طرح یہ عام لوگوں میں میری شہرت کو بڑھائے گا جن کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے'' مولانا حسین نے سوچا ''عوام کی باتیں جاسوسوں اور خبر رسانوں کے ذریعہ امیر کے کانوں تک پہنچیں گی اور میری دانائی کی تصدیق کرینگی۔ کسی بات کی باہر سے تصدیق بلاشبہ بہترین تصدیق ہے۔ اس طرح آخر میں مجھے ہی فائدہ ہوگا۔''

اپنے ہم نشین پر رعب جمانے کے لئے دانا نے اس کو تاروں کے جھرمٹوں اور ان کے درمیان روابط کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور بہت سے پرانے داناؤں کے حوالے بھی دئے۔

خواجہ نصرالدین اس کی باتیں بڑے غور سے سنتے رہے اور یہ کوشش کی کہ ان کے ذہن میں سب محفوظ ہو جائیں۔

''نہیں!'' آخر میں انہوں نے کہا۔ ''ابھی تک مجھے یقین نہیں آتا! کیا آپ واقعی مولانا حسین ہیں؟''

''واقعی!'' بڈھے نے چلا کر کہا۔ ''اس میں کیا عجیب بات ہے؟''

خواجہ نصرالدین پیچھے ہٹ گئے جیسے وہ ڈر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے خوف و ہراس کی آواز میں کہا ''بدقسمت انسان! آپ تباہ ہو گئے!''

بوڑھے کا گلا رندھ گیا اور اس کے ہاتھ سے چاء کا گلاس چھٹ پڑا اس کا سارا گھمنڈ اور اہمیت غائب ہوگئی۔

''کیسے؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''آپ نہیں جانتے کہ سب ہنگامہ آپ کی وجہ سے ہے؟'' خواجہ نصرالدین نے بازار کی طرف اشارہ کر کے کہا جہاں ابھی لڑائی بالکل ختم نہیں ہوئی تھی۔ ''امیر کے کانوں تک یہ بات پہنچی ہے کہ بغداد چھوڑتے وقت آپ نے علانیہ فرمایا کہ آپ امیر کے حرم میں دخل حاصل کریں گے اور ان کے بیویوں کو ورغلائیں گے۔ ہائے افسوس، مولانا حسین۔''

بڈھے کا منہ کھلا رہ گیا، اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور خوف سے ہچکیاں لینے لگا۔ ''میں؟'' وہ ہکلا رہا تھا ''میں... حرم میں؟..،،

''آپ نے تخت خداوندی کی قسم کھا کر کہا کہ آپ یہی کریں گے۔ نقیبوں نے آج اسی طرح اعلان

کیااورامیر نے حکم دیا ہے کہ شہر میں قدم رکھتے ہی آپ کو پکڑ لیا جائے اور اسی جگہ گردن ماردی جائے۔''

دانا نے ہراساں ہوکر ایک آہ سرد بھری۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے کس دشمن نے اس پر یہ بلا نازل کی ہے اس کو اس بات کی سچائی پر ذرا بھی شبہ نہیں ہوا۔درباری سازشوں کے دوران اس نے خود متعدد بار اپنے دشمنوں کو اسی طرح تباہ کیا تھا اور ان کے سر بانسوں پر چڑھے دیکھ کر اس کا دل ٹھنڈا ہوا تھا۔

''تو آج'' خواجہ نصرالدین نے اپنے بات جاری رکھی ''جاسوسوں نے امیر کو خبر پہنچائی کہ آپ آ گئے ہیں۔انہوں نے آپ کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور سپاہی آپ کو جلدی جلدی تلاش کرنے لگے۔ انہوں نے سب دوکانوں کو چھان مارا۔کاروبار رک گیا اور امن وامان نہیں رہا۔غلطی سے سپاہیوں نے ایک آدمی کو پکڑ لیا جو آپ کا ہم شبیہ تھا اور عجلت میں انہوں نے اس کا سر قلم کر دیا۔اتفاق سے وہ ایک ملا تھا جو اپنے زھد واتقا کے لئے مشہور تھا۔اس کی مسجد کے لوگ بگڑ کھڑے ہوئے۔دیکھئے یہ سب کیا ہو رہا ہے اور محض آپ کی وجہ سے۔''

''ہائے کیسا بدقسمت ہوں میں'' دانا نے خوف وہراس سے کہا۔وہ پریشان ہوکر بربڑاتا، کراہتا اور فریاد کرتا رہا۔اس طرح خواجہ نصرالدین ویقین ہوگیا کہ ان کی چال کامیاب ہوگئی۔

اس دوران میں لڑائی محل کے پھاٹکوں کی طرف منتقل ہوگئی تھی جدھر بری طرح پٹے ہوئے سپاہی بھاگ رہے تھے۔اس دوران میں وہ اپنے ہتھیار بھی کھو بیٹھے تھے۔بازار میں اب بھی ہل چل اور ہنگامہ تھا لیکن سکون ہوتا جارہا تھا۔

''مجھے بغداد واپس جانا چاہئے!'' بڈھے نے گریہ وزاری کرتے ہوئے کہا۔''مجھے بغداد واپس جانا چاہئے!''

''آپ کو شہر کے پھاٹک پر پکڑ لیا جائے گا'' خواجہ نصرالدین نے جھٹ سے جواب دیا۔

''ہائے میری قسمت! ہائے مصیبت! خدایا میں معصوم ہوں! میں ایسا توہین آمیز اور ناپاک اعلان کبھی نہیں کیا۔میرے دشمنوں نے امیر سے یہ تہمت تراشی کی ہے۔ارے مہربان مومن، میری مدد کرو!''

خواجہ نصرالدین تو اسی بات کے منتظر ہی تھے کیونکہ وہ خود مدد کی پیش کش کر کے دانا کو شبہ کرنے کی گنجائش نہیں دینا چاہتے تھے۔

''آپ کی مدد کروں؟'' انہوں نے کہا۔''میں آپ کی مدد کیسے کرسکتا ہوں؟ اپنے آقا کے وفادار اور

مخلص خادم کی حیثیت سے تو مجھے آپ کو بلا تاخیر سپاہیوں کے حوالے کو دینا چاہئے تا کہ مجھے پر سازش کا الزام نہ عائد کیا جا سکے۔''

ہچکیاں لیتے اور کانپتے ہوئے دانا نے التجا آمیز نظروں سے خواجہ نصر الدین کو دیکھا۔

''پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ آپ بے گناہ ہیں اور لوگوں نے آپ کے خلاف تہمت تراشی کی ہے۔ میں تو آپ کی بات کا یقین کرنے کے لئے تیار ہوں'' خواجہ نے اس کو یقین دلایا'' کیونکہ اس بزرگی کی عمر میں بھلا آپ کا حرم میں کیا کام۔''

''بالکل ٹھیک کہتے ہو!'' بڈھے نے کہا۔''لیکن میرے لئے نجات کا راستہ کیا ہے؟''

''ایک راستہ ہے'' خواجہ نصر الدین نے جواب دیا۔ وہ بڈھے کو پچھلی والی اندھیری کوٹھری میں لے گئے اور وہاں انہوں نے اس کو عورت کے کپڑوں کی پوٹلی دی۔''میں نے آج یہ اپنی بیوی کے لئے خریدے تھے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ اس کا تبادلہ اپنے عمامے اور عبا سے کر لیں۔ عورت کی نقاب میں آپ جاسوسوں اور سپاہیوں سے محفوظ رہیں گے۔''

بڑی خوشی اور شکریے کے ساتھ بڈھے نے کپڑے لے کر پہن لئے خواجہ نصر الدین نے اس کی سفید عبا پہنی، اس کا طرح دار عمامہ سر پر رکھا اور چوڑا ستاروں والا پٹکا باندھا۔ پھر انہوں نے بڈھے کو اپنے اونٹ پر چڑھنے میں مدد دی۔

''خدا آپ کی حفاظت کرے، اے دانائے روزگار! دیکھئے عورتوں کی طرح ذرا باریک آواز میں بولنا نہ بھولئے گا۔''

بڈھا اپنی سواری پر بگٹٹ بھاگا۔

خواجہ نصر الدین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔محل کا راستہ کھلا ہوا تھا۔

یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ بازار میں جھگڑا ختم ہو رہا ہے تقدس مآب امیر نے فیصلہ کیا کہ وہ دربار خاص میں درباریوں کے پاس جائے گا۔ اس نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ وہ پرسکون ہے لیکن اس کو کچھ تکلیف ضرور ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی درباری یہ سوچنے تک کی جرأت کر سکے کہ اس کے شاہانہ دل میں خوف نے جگہ پائی ہے۔

امیر جب وہاں پہنچا تو درباری خاموش رہے کیونکہ ان کو یہ ڈر تھا کہ کہیں ان کی آنکھیں اور چہرے

اس بات کی غمازی نہ کردیں کہ وہ امیر کے صحیح جذبات سے بخوبی واقف ہیں۔

امیر اور درباری دونوں خاموش تھے۔ آخر کار یہ خوفناک سکوت امیر نے یہ کہہ کر توڑا:

''تم ہم سے کیا کہنا چاہتے ہو؟ تمہارا کیا مشورہ ہے؟ یہ سوال ہم تو سے پہلی بار نہیں پوچھ رہے ہیں!''

سب چپکے سے جھکائے سناٹے میں کھڑے رہے۔ اچانک امیر کا چہرہ غصے سے بگڑ گیا۔ نہ جانے کتنی خوشامدی زبانیں ہمیشہ کے لئے بند کردی جاتیں جو موت کی اذیت سے اس طرح خون سے عاری ہونٹوں سے باہر لٹک پڑتیں جیسے وہ زندہ لوگوں کو ان کی دولت ناپائدار، اپنی پرغرور اور بیگار تمناؤں، کوششوں اور امیدوں کی یاد دلا رہی ہوں۔

لیکن سرشانوں پر برقرار رہے، زبائیں فرالبدیہہ خوشامہ کے لئے تیز رہیں کیونکہ اسی وقت داروغہ محل نے آکر اعلان کیا:

''خدا مرکز جہاں کو سلامت رکھے! محل کے پھاٹک پر ایک اجنبی کھڑا ہے اور اپنا نام بغداد کا دانا مولانا حسین بتا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ بہت ضروری کام سے آیا ہے اور اسے فوراً جہاں پناہ کے حضور میں حاضر ہونا چاہئے۔''

''مولانا حسین!'' امیر نے اشتیاق سے کہا۔ ''اس کو آنے دو! اس کو یہاں لے آؤ!''

دانا اندر آیا نہیں بلکہ بھاگ کر اندر گھسا حتیٰ کہ جلدی میں اپنے گرد آلود سلیپر بھی اتارنا بھول گیا۔ تخت کے سامنے منہ کے بل گر گیا:

''مشہور اور پرعظمت امیر کو، سارے جہاں کے آفتاب و ماہتاب کو، دنیا کے لئے رحیم وقہار کو میرا سلام! میں دن رات منزلیں طے کرتا ہوا آیا ہوں تاکہ امیر کو ایک ہولناک خطرے سے آگاہ کرسکوں۔ امیر بتائیں کہ کیا آج وہ کسی عورت کے پاس گئے؟ امیر، میرے آقا، اس خادم کی بات کا جواب دیجئے.... میں آپ سے التجا کرتا ہوں!...''

''عورت؟'' امیر نے متحیر ہوکر دہرایا ''آج؟.. نہیں۔ ہمارا ارادہ تھا لیکن ابھی تک ہم نے ایسا کیا نہیں ہے۔''

دانا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اس نے انتہائی ہیجان کی حالت میں امیر کے جواب کا

انتظار کیا تھا۔اس کے ہونٹوں سے ایک طویل اور گہری آہ نکلی۔رفتہ رفتہ اس کے گالوں کا رنگ واپس آیا۔

''الحمداللہ''اس نے زور سے کہا''اللہ نے عقل اور رحمت کی روشنی کو گل ہونے سے بچالیا۔اے امیر! رات کو ستارے اور سیارے ایسے برجوں میں تھے جو حضور کے بے حد خلاف پڑتے ہیں۔اور میں نے،اس ناچیز نے جو امیر کے پیروں کی گرد کو بھی بوسہ دینے کے قابل نہیں ہے مشاہدہ کر کے سیاروں کے مقام کا حساب لگایا۔میں جانتا ہوں کہ جب تک وہ پھر سازگار اور نیک فال کے مقامات تک نہ پہنچ جائیں امیر کو کوئی عورت چھونا نہ چاہئے،نہیں تو ان کی تباہی لازمی ہے۔''

''رکو،مولانا حسین''امیر نے بیچ میں کہا''تم ایسی باتیں کر رہے ہو جس سمجھ میں نہیں آتیں...''

''الحمداللہ،کہ میں وقت پر پہنچا،،دانا کہتا رہا(جو حقیقت میں خواجہ نصرالدین تھے)''میں اپنی آخری سانس تک اس بات پر فخر کروں گا کہ میں نے امیر کو آج عورت چھونے سے روک دیا۔اس طرح میں نے دنیا کو ایک زبردست غم سے بچالیا۔''

اس نے یہ بات اس قدر مسرت اور خلوص سے کہی کہ امیر کو اس پر یقین ہی کرنا پڑا۔

''جب مجھ کو جو ایک حقیر چیونٹی کے مانند ہے اعلیٰ حضرت نے سرفراز کیا،مجھ ناچیز کو یاد کیا اور مجھے بخارا آ کر امیر کی خدمت میں رہنے کا فرمان ملا تو ایسا معلوم ہوا جیسے میں بے مثال مسرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوں۔یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں فوراً حکم بجالایا اور سفر کے لئے چل پڑا۔

''لیکن پہلے میں نے چند دن امیر کا زائچہ کھینچنے میں گذارے۔پھر میں نے فوراً ان کی خدمت اس طرح شروع کی کہ ان کی قسمت کے سیاروں اور ستاروں کا مطالعہ شروع کر دیا۔کل رات آسمان دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ستارے اور سیارے دونوں امیر کے لئے بری طرح خطرناک ہو رہے ہیں۔ستارہ الشعلہ جو ضرب کی علامت ہے ستارہ القلب کی طرف جو دل کی علامت ہے خراب رخ رکھتا تھا۔اس کے علاوہ میں تین اور ستارے الغفر جو عورت کی نقاب کی علامت ہے،دو ستارے الاکلیل جو تاج کی علامت ہیں اور دو ستارے السرطان دیکھے جو سینگوں کی علامت ہیں۔

''یہ سب منگل کو تھا جو سیارہ مریخ کا دن ہے اور یہ دن جمعرات کے برخلاف،بڑے آدمیوں کی موت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور امیروں کے لئے انتہائی مضرت رساں ہے۔ان تمام علامتوں کو دیکھ کر اس ناچیز نے جانا کہ موت کی ضرب کسی صاحب تاج کے دل پر پڑنے والی ہے اگر اس نے عورت کی

نقاب کو چھوا۔ اسی لئے میں انتہائی تعجیل کے ساتھ صاحب تاج کو آگاہ کرنے کے لئے آیا۔ میں نے دن رات سفر کیا۔ دو اونٹ مر گئے اور میں بخارا میں پیدل داخل ہوا۔''

''اے خدائے برتر!'' امیر نے بے حد متاثر ہو کر کہا۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کو ایسا خطرہ درپیش ہو؟ کیا تم کو قطعی یقین ہے کہ تم غلطی نہیں کر رہے ہو، مولانا حسین؟''

''غلطی؟ میں؟'' دانا نے زور سے کہا۔ ''اے امیر، بغداد سے بخارا تک دانائی، علم نجوم اور دست شفا میں میرا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں غلطی نہیں کر سکتا۔ آقا، آفتاب جہاں، امیر اعظم آپ اپنے حکما سے پوچھئے کہ میں نے ستاروں کے صحیح نام بتائے ہیں یا نہیں۔ اور زائچے میں ان کو ٹھیک مقام دئے ہیں یا نہیں؟''

امیر کا اشارہ پر کرٹیڑھی گردن والا دانا آگے بڑھا۔

''مولانا حسین، دانائی میں میرے بے نظیر ہم عصر نے ستاروں کے صحیح نام بتائے ہیں جن سے ان کے علم و فضل کا پتہ چلتا ہے جس پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا، لیکن،، دانائے اپنی بات ایسے لہجے میں جاری رکھی جو خواجہ نصر الدین کو کینہ آمیز معلوم ہوتا تھا ''مولانا حسین نے امیر کو چاند کا سولھواں برج اور وہ جھرمٹ نہیں بتایا جس میں یہ برج پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس اس نشان دہی کے بغیر یہ دعوی بے بنیاد ہو گا کہ منگل جو سیارہ مریخ کا دن ہے قطعی طور پر بڑے آدمیوں کی موت کی نشانی کا دن ہے جن میں تاجدار بھی شامل ہیں کیونکہ مریخ قیام ایک جھرمٹ میں کرتا ہے، اس کا عروج دوسرے میں اور زوال تیسرے میں ہوتا ہے اور چوتھے جھرمٹ میں وہ غروب ہو جاتا ہے۔ ان کے مطابق سیارہ مریخ کی چار مختلف علامتیں ہیں نہ کہ صرف ایک جیسا کہ انتہائی لائق اور دانا مولانا حسین نے کہا ہے۔''

دانا چالاکی سے مسکراتا ہوا خاموش ہو گیا۔ درباری ایک دوسرے سے اس بات پر خوش ہو کر کھسر پھسر کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ نو وارد گھبرا گیا ہے۔ اپنی آمدنیوں اور اعلی عہدوں کی حفاظت کے لئے وہ باہر کے تمام آدمیوں کو دور ہی رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہر نو وارد کو خطرناک حریف سمجھتے تھے۔

لیکن جب خواجہ نصر الدین کوئی بات اٹھاتے تھے تو پھر ہار نہیں مانتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دانا، درباریوں اور خود امیر کو بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے ذرا بھی گھبرائے بغیر بڑے سرپرستانہ انداز میں جواب دیا:

''شاید میرے دانش منداور لائق ہم عصر مجھ سے علم کی اور کسی شاخ میں بالاتا ہوں لیکن جہاں تک ستاروں کا تعلق ہے ان کے الفاظ ابن بجاع کی تعلیم سے قطعی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں جو دانائے روزگار تھا اور جس نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ سیارہ مریخ کا قیام جھرمٹ حمل وعقرب میں، اس کا عروج جھرمٹ جدی میں، زوال جھرمٹ سرطان میں اور غروب جھرمٹ میزان مین ہوتا، بہرحال یہ صرف منگل کی خصوصیت ہے جس پر سیارہ مریخ اثر انداز ہوتا ہے جو تاجداروں کے لئے مہلک ہے۔''

یہ جواب دیتے ہوئے خواجہ نصرالدین ذرا بھی نہیں ڈرے کہ ان پر جاہل ہونے کا الزام لگایا جائے گا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے مباحثوں میں اسی کی جیت ہوتی ہے جو سب سے زیادہ چرب زبان ہوتا ہے اور اس میں ان کا مقابلہ شاید ہی کوئی کرسکتا ہو۔

وہ اب دانا کے اعتراضات کا اعتراض کرنے اور مناسب جواب دینے کے لئے تیار کھڑے تھے لیکن دانا نے معاملے کو نہیں اٹھایا اور خاموش رہا۔ اس کی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ بحث کو زیادہ طول دے حالانکہ اس کو کافی شک تھا کہ خواجہ الدین جاہل اور دھوکے باز ہیں لیکن اس کو اپنی جہالت کا خود کافی علم تھا۔ اس لئے اس نے نووارد کو گھبرانے کی جو کوشش کی تھی اس کا اثر الٹا ہوا اور درباریوں نے اسے خاموش کر دیا۔ اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ حریف سے کھلم کھلا مقابلہ کرنا خطرناک ہے۔

یہ اشارے کنائے خواجہ نصرالدین نے بھی دیکھ لئے اور دل ہی دل میں کہا:

''ذرا ٹھہرو، بتاؤں گا تمہیں!''

''امیر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ہر ایک ساکت تھا مبادا امیر کے غور وفکر میں خلل انداز نہ ہو۔

''اگر تم نے تمام ستاروں کا نام وقیام صحیح بتایا ہے، مولانا حسین'' امیر نے آخر کار کہا ''تو واقعی تمہاری پیش گوئی ٹھیک ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دو ستارے السرطان جن کی علامت سینگیں ہیں ہمارے زائچے میں کیسے آئے؟ واقعی مولانا حسین، تم عین وقت پر پہنچے کیونکہ آج صبح ہی کو ایک دوشیزہ ہمارے حرم میں لائی گئی ہے اور ہم تیاری کررہے تھے کہ...''

خواجہ نصرالدین نے بناوٹی دہشت سے اپنے ہاتھ ہلائے۔

''اس کو اپنے دماغ سے نکال دیجئے، امیر محترم، اس کو نکال دیجئے!'' وہ چلائے جیسے یہ بھول گئے ہوں کہ امیر کو براہ راست حاضر کے صیغے سے نہیں مخاطب کرنا چاہئے۔ وہ جانتے تھے کہ اس بے ادبی کو

امیر سے وفاداری اور ان کی جان کی سلامتی کے لئے خوف کا زبردست جذبہ سمجھا جائے گا اور ان کے خلاف نہیں پڑے گا بلکہ اس کے برعکس امیر کے دل میں ان کے خلوص کے لئے زیادہ وقعت پیدا ہوگی۔

انہوں نے ایسے زوردار لہجے میں امیر سے درخواست والتجا کی کہ وہ لڑکی سے اپنے کو مس نہ کرے تا کہ اس کو یعنی مولانا حسین کو آنسوؤں کا سیلاب نہ بہانا پڑے اور سیاہ ماتمی لباس نہ پہننا پڑے کہ امیر اس سے بہت متاثر ہوا۔

''مطمئن رہو، مطمئن رہو، مولانا حسین۔ ہم اپنی رعایا کے دشمن تھوڑے ہی ہیں کہ ان کو رنج وغم میں مبتلا ہونے دیں۔ ہم تم سے ہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی قیمتی جان کی حفاظت کریں گے اور نہ صرف یہ کہ اس لڑکی کے پاس نہیں جائیں گے بلکہ عام طور پر اس وقت تک حرم میں داخل نہ ہوں گے جب تک تم ہمیں یہ نہ بتاؤ گے کہ اب ہمارے ستارے سازگار ہیں۔ یہاں آؤ۔''

یہ کہہ کر امیر نے اپنے حقہ بردار کو اشارہ کیا اور ایک لمبا کش کھینچ کر خود اپنے ہاتھ سے حقے کی طلائی مہنال نو وارد دانا کی طرف بڑھادی جو اس کے لئے بڑی عزت وعنایت کا باعث تھا۔ گھٹنوں کے بل جھک کر اور نگاہیں زمین کی طرف کر کے دانا نے امیر کی عزت افزائی کو قبول کیا اور اس کے بدن میں جھرجھری آ گئی۔ حاسد درباریوں کے خیال میں یہ جھرجھری خوشی کی تھی۔

''ہم مولانا حسین ایسے دانا کے لئے اپنی عنایتوں اور مہربانیوں کا اعلان کرتے ہیں۔'' امیر نے کہا ''اور ان کو اپنی سلطنت کا دانائے اعظم مقرر کرتے ہیں۔ ان کا علم وفضل اور عقل ودانش اور ہمارے ساتھ ان کی زبردست وفاداری ہر ایک کے لئے مثال بننی چاہیں۔''

درباری واقعہ نویس نے، جس کا یہ فرض تھا کہ وہ امیر کے ایک ایک لفظ اور کارروائی کو مدحیہ انداز میں لکھے تا کہ ان کی عظمت آنے والی نسلوں کے لئے قائم رہے (جس کے لئے امیر سب سے زیادہ مشتاق تھا) اپنا قلم چلانا شروع کیا۔

''جہاں تک تمہارا تعلق ہے'' امیر نے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اس کے برعکس، ہم تم پر اپنے عتاب کا اعلان کرتے ہیں کیونکہ خواجہ نصرالدین نے جو کچھ بدمزگی پیدا کر دی ہے اس کے علاوہ تمہارے آقا کی جان تک کا خطرہ تھا پھر تم نے مدد کے لئے ایک انگلی بھی نہ اٹھائی! ان کو دیکھو! مولانا حسین، ان حماقت بھرے چہرے والے گاؤدیوں کو دیکھو۔ ہیں نا یہ بالکل گدھوں کی طرح؟ واقعی کسی

بادشاہ کے بھی ایسے بیوقوف اور لاپرواوزیر نہ رہے ہوں گے!''

''محترم امیر کا فرمانا بالکل بجا ہے'' خواجہ نصرالدین ساکت درباریوں کی طرف دیکھ کر اس طرح کہا جیسے وہ پہلی چوٹ کے لئے نشانہ لے رہے ہوں۔''جہاں تک میں دیکھتا ہوں ان کے چہروں پر دانشمندی کی کوئی نشانی نہیں ہے۔''

''بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک'' امیر نے بہت خوش ہو کر تصدیق کی۔''بالکل ٹھیک، ان کے چہروں پر دانشمندی نہیں ہے، سنتے ہو تم احمقو؟''

''میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں'' خواجہ نصرالدین نے اپنی بات جاری رکھی''کہ نہ تو ان کے چہروں پر نیک صفات اور ایمانداری ہی کی نشانی ہے۔''

''یہ چور ہیں'' امیر نے دلی یقین کے ساتھ کہا''سب کے سب چور ہیں۔ یہ ہم کو دن رات لوٹتے رہتے ہیں۔ ہم کو محل میں ایک ایک چیز کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔ ہر بار جب ہم اپنی املاک کا جائزہ لیتے ہیں کوئی نہ کوئی چیز غائب ہوتی ہے۔ ابھی آج صبح ہی ہم اپنا ریشمی پٹکا باغ میں بھول گئے اور آدھ گھنٹے میں وہ غائب ہو گیا!...ان میں سے کوئی اس کو...سمجھے نا، مولانا حسین!..''

جب امیر یہ کہہ رہا تھا تو ٹیڑھی گردن والے دانا نے اپنی نگاہ بڑی ریاکاری سے نیچے جھکالی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اس طرف توجہ نہ جاتی لیکن اس وقت تو خواجہ نصرالدین بہت چوکنے ہو رہے تھے۔ انہوں نے فوراً بات تاڑ لی۔

بڑے اعتماد کے ساتھ وہ دانا کے پاس گئے، اپنا ہاتھ اس کی خلعت کے اندر ڈال کر ایک مرصع کار ریشمی پٹکا باہر کھینچ لیا۔

''کیا امیر اعظم اس پٹکے کے ضایع ہونے پر افسوس کر رہے تھے؟''

حیرت وخوف سے تمام درباری پتھر ہو گئے۔ واقعی نیا دانا بہت خطرناک ثابت ہو رہا تھا کیونکہ پہلے ہی آدمی کو جس نے اس کی مخالفت کی جرأت کی تھی اس نے بے نقاب کر کے کچل دیا تھا۔ بہت سے داناؤں، شاعروں، عمائدین اور وزرا کے دل خوف سے کانپ گئے۔

''خدا کی قسم'' امیر نے زور سے کہا''یہی میرا پٹکا ہے، واقعی مولانا حسین عقل ودانش میں تمہارا کوئی جواب نہیں! آہا!'' اور وہ درباریوں کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے پر بڑا اطمینان تھا۔ اس نے کہا''آہا،

آخر کار رنگے ہاتھوں پکڑے گئے! اب تم ہمارا ایک دھاگا بھی چرانے کی جرأت نہ کرو گے! تمہاری لوٹ مار سے ہم کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے! جہاں تک اس کمبخت چور کا تعلق ہے اس کے سر، ٹھڈی اور جسم سے تمام سے تمام بال اکھاڑ لئے جائیں۔ اس کے تلوؤں پر سو ضربیں لگائی جائیں اور منہ کی طرف پیٹھ کر کے گدھے پر ننگا بٹھا کر شہر میں گشت کرایا جائے اور اس کو عام طور پر چور مشتہر کیا جائے!''

ارسلان بیگ کا اشارہ پاتے ہی جلادوں نے فوراً دانا کو پکڑ لیا، اس کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ چند لمحے بعد اس کو پھر کھینچ کر ہال میں بالکل ننگا، بے بال اور انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں لایا گیا۔ اب سے پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ابھی تک اس کی داڑھی اور زبردست عمامہ اس کی کوتاہی عقل اور حماقت کو چھپائے تھے جو اس کے چہرے مہرے سے نمایاں تھیں اور ایسا ریاکارانہ چہرے والا آدمی سوائے بدمعاش اور چور کے کچھ نہیں ہوسکتا۔

''لے جاؤ اس کو'' امیر نے حقارت سے حکم دیا۔

جلاد اس کو گھسیٹ کر لے گئے۔ ذرا دیر بعد ہی کھڑکی سے ڈنڈوں اور لاتوں کی دھمک کے تال پر چیخوں کی آواز آنے لگی۔ آخر میں اس کو ایک گدھے پر ننگا بٹھا دیا گیا، اس کا منہ گدھے کی دم کی طرف کر کے نفیریوں اور نقاروں کی گونج میں بازار لے جایا گیا۔

امیر بڑی دیر تک نئے دانا سے باتیں کرتا رہا۔ درباری چاروں طرف بے حس و حرکت کھڑے تھے جوان کے لئے شدید ترین اذیت تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی اور قبا کے اندر ان کی پیٹھوں میں بری طرح کھجلی محسوس ہو رہی تھی۔

وزیر اعظم بختیار جو سب سے زیادہ نئے دانا سے ڈرا ہوا تھا کوئی منصوبہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا جس سے وہ اپنے حریف کو ختم کرنے کے لئے درباریوں کی مدد حاصل کر سکے۔ دوسری طرف درباری متعدد علامتوں سے یہ اندازہ لگا کر کہ اس مقابلے کا نتیجہ کیا ہوگا، یہ سوچ رہے تھے کہ بختیار کے ساتھ ایسے وقت غداری کس طرح کی جائے جو ان کے لئے بہت ہی اچھا ہو اور اس طرح نئے دانا کا اعتماد اور خوشنودی حاصل کی جائے۔

امیر نے خواجہ نصر الدین سے خلیفہ کی خیریت دریافت کی، بغداد کی خبروں اور ان کے سفر کے واقعات کے بارے میں پوچھا جن کا جواب انہوں نے بڑی ہوشیاری سے دیا۔ سب کچھ ٹھیک رہا اور امیر

نے باتوں کے تکان سے تھک کر آرام گاہ ٹھیک ٹھاک کرنے کا حکم دیا ہی تھا کہ اچانک ہنگامہ اور ایک چیخ سنائی دی۔ داروغہ محل تیزی سے دیوان کے اندر داخل ہوا اور اعلان کیا:

''آقائے نامدار کی خدمت میں عرض ہے کہ کافر اور امن شکن خواجہ نصر الدین گرفتار کر لیا گیا ہے اور محل کو لایا گیا ہے!''

ابھی اس نے یہ اعلان کیا ہی تھا کہ اخروٹ کی لکڑی کے نقشیں پھاٹک پٹو پٹ کھل گئے۔ اسلحہ کی فاتحانہ جھنکار ہوئی اور پہرے دار ایک عقابی ناک، سفید داڑھی والی آدمی کو سامنے لائے جو زنانے لباس میں تھا۔ انہوں نے تخت کے نیچے قالین پر اس کو ڈھکیل کر گرا دیا۔

خواجہ نصر الدین کے بدن میں کا ٹو تو لہو نہیں تھا۔ ہال کی دیواریں ان کی نگاہ کے سامنے ناچ رہی تھیں اور درباریوں کے چہرے سبزی مائل دھند میں چھپے معلوم ہونے لگے....

بغداد کا دانا، اصلی مولانا حسین، اسی پھاٹک پر دھر لیا گیا جس کے پار وہ نقاب کے اندر سے ہر سمت جانے والی سڑکیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر سڑک اس کو بدبختی سے نجات پانے کی راہ معلوم پڑتی تھی۔

لیکن پھاٹک کے پہرے داروں نے اس کو ٹوکا ''اے عورت، کہاں جا رہی ہے تو؟''

''میں عجلت میں ہوں، اپنے خاوند کے پاس جا رہی ہوں۔ بہادر سپاہیو، مجھے جانے دو۔''

آواز پر شبہ کرتے ہوئے پہرے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک نے اونٹ کی مہار تھام لی۔

''تم کہاں رہتی ہو؟''

''یہیں، بالکل قریب'' دانا نے اور بھی باریک آواز میں جواب دیا۔ اس کوشش میں اس کو کھانسی آ گئی اور دم پھول گیا۔ پہرے داروں نے اس کا نقاب پھاڑ دیا۔ ان کو بے حد خوشی ہوئی۔

''وہی ہے، وہی!'' وہ چلائے ''پکڑ لو! پکڑ لو!''

اس کے بعد وہ بڈھے کو محل لائے اور راستے میں اس پر بات چیت کرتے رہے کہ کس طرح اس کو موت کی سزا ملے گی اور تین ہزار تانگے کا انعام جوان کو ملنے کی امید تھی۔ ان کا ایک ایک لفظ بڈھے کے لئے جلتے ہوئے انگارے کی طرح تھا۔

وہ تخت کے نیچے پڑا کانپ رہا تھا اور رو رو کر رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

''اس کو اٹھاؤ'' امیر نے حکم دیا۔

پہرے داروں نے اس کو پیروں پر کھڑا کر دیا۔ ارسلان بیگ درباریوں کے مجمع سے آگے آیا اور بولا:

''حضور، غلام کی بھی ایک بات سنیں۔ یہ آدمی خواجہ نصر الدین نہیں ہے۔ خواجہ نصر الدین نوجوان ہے، تیس سال سے کچھ اوپر اور یہ آدمی کافی معمر ہے۔''

پہرے دار ہراساں ہو گئے۔ انعام ان کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ ہر آدمی خاموش اور چکرایا ہوا تھا۔

''تو نے عورت کا بھیس کیوں بدلا؟'' امیر نے دھمکی آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''میں امیر معظم و محترم کے محل کی طرف آ رہا تھا'' بڈھے نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن میری ملاقات ایک آدمی سے ہوئی جو بالکل اجنبی تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میرے بخارا آنے سے پہلے ہی امیر نے میرا سر قلم کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ میں نے خوف سے بھیس بدل کر بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔''

امیر نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ سب سمجھتا ہے قہقہہ لگایا:

''تم ایک آدمی سے ملے... ایک اجنبی سے اور فوراً اس کی بات کا یقین کر لیا؟.. کیا لاجواب قصہ ہے! ہم تمھارا سر کیوں قلم کرنے والے تھے؟''

''کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ میں نے بالا علان اس بات کی قسم کھائی تھی کہ امیر معظم کے حرم میں گھسونگا... لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے اس بات کا کبھی خیال بھی نہیں کیا! میں بڈھا اور ضعیف ہوں اور مدتوں ہوئے خود اپنے حرم تک کو ترک کر چکا ہوں۔''

''ہمارے حرم میں گھس جاؤ گے؟'' امیر نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے دھرایا۔ اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ بڈھے کے خلاف اس کے شکوک میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ''تم ہو کون اور کہاں سے آئے ہو؟''

''میں ہوں بغداد کا دانا، ماہر نجومی اور حکیم مولانا حسین۔ میں امیر معظم کے حکم کے مطابق بخارا آیا ہوں۔''

''مولانا حسین؟'' امیر نے دھرایا۔ ''تم مولانا حسین ہو! تمھارا نام مولانا حسین ہے! ارے کمبخت بڈھے، یہ تو سفید جھوٹ ہے!'' وہ اتنی زور سے گرجا کہ ملک الشعرا اچانک گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ ''جھوٹ

بولتا ہے! یہ رہے مولانا حسین!''

امیر کا اشارہ پا کر خواجہ نصر الدین بڑی فرمانبرداری کے ساتھ آگے بڑھے اور بڈھے سامنے تن کر کھڑے ہو گئے اور نڈر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

بڈھا حیرت سے پیچھے ہٹ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے کو سنبھال کر چلایا:

''آقا! ارے یہ تو وہی آدمی ہے جو مجھے بازار میں ملا تھا اور اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ امیر میرا سر قلم کر دینا چاہتے ہیں!''

''یہ کیا کہہ رہا ہے، مولانا حسین!'' امیر نے انتہائی پریشان ہو کر کہا۔

''یہ مولانا حسین نہیں ہے!'' بڈھا چیخا۔ ''میں مولانا حسین ہوں۔ یہ دھوکے باز ہے! اس نے میرا نام چرا لیا ہے!''

خواجہ نصر الدین نے امیر کے سامنے بہت جھک کر کہا:

''معظم بادشاہ میری گستاخی معاف ہو لیکن یہ بڈھا واقعی بے حد بے حیا ہے! کہتا ہے کہ میں نے اس کا نام چرا لیا اور شاید یہ بھی کہے گا کہ میں نے اس کی عبا پر قبضہ جما لیا ہے؟''

''ہاں، ہاں!'' بڈھا چلایا۔ ''یہ عبا میری ہ ہے!''

''ممکن ہے کہ یہ عمامہ بھی تمہارا ہو؟'' خواجہ نصر الدین نے مذاق اڑاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، ضرور! یہ میرا ہی عمامہ ہے! تم نے میری عبا اور عمامے کو زنانے لباس سے بدل لیا تھا۔''

''اچھا'' خواجہ نصر الدین نے اور طنز سے کہا۔ ''اور یہ پٹکا بھی غالباً تمہارا ہی ہے؟''

''میرا ہی ہے!'' بڈھے نے غصے کے ساتھ زور دے کر کہا۔

خواجہ نصر الدین تخت کی طرف مڑے اور بولے:

''حضور والا، امیر معظم نے خود دیکھ لیا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ آج یہ جھوٹا اور بیہودہ بڈھا یہ کہتا ہے کہ میں نے اس کا نام چرا لیا، عبا اس کی ہے، یہ عمامہ اس کا ہے اور یہ پٹکا اس کا ہے اور کل یہ کہے گا کہ یہ محل اس کا ہے اور ساری سلطنت اس کی ہے اور بخارا کا اصلی امیر وہ عظیم اور آفتاب جیسا بادشاہ نہیں ہے جو اس وقت ہمارے سامنے تخت پر جلوہ فرما ہے بلکہ یہ، بے ہودہ جھوٹا ہے! اس سے ہر بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔ وہ بخارا کیوں آیا؟ کیا وہ امیر کے حرم میں اس طرح گھسنے نہیں آیا جیسے کہ اس کا خود کا حرم ہو؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو، مولانا حسین'' امیر نے کہا۔ ''ہاں، ہم کو یقین ہو گیا۔ بڈھا مشکوک اور خطرناک آدمی ہے اور اس کے ارادے بد ہیں۔ ہماری رائے میں اس کا سر فوراً جسم سے جدا کر دیا جائے۔''

بڈھا آہ بھر کر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھک لیا۔

بہر حال، خواجہ نصر الدین یہ نہیں گوارا کر سکتے تھے کہ ان کے اوپر جو الزامات تھے ان کی بنا پر کسی بے گناہ کو موت کے گھاٹ اتارا جائے چاہے وہ آدمی درباری دانا ہی کیوں نہ ہو جو اپنے جعل سے بہتوں کی تباہی کا باعث بن چکا تھا۔ اس لئے انہوں نے امیر کے سامنے بہت جھک کر عرض کیا:

''امیر معظم میری بات سننے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اس کا سر جب چاہے قلم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پہلے کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ اس کا اصلی نام اور بخارا آنے کا سبب معلوم کیا جائے؟ ممکن ہے کہ سازش میں اس کے ساتھی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی بد طینت جادوگر ہو جو ستاروں کی خرابی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو۔ اگر ایسا ہے تو امیر معظم کے قدموں کے نیچے کی مٹی لے گا اور اس کو چمگادڑ کے بھیجے میں ملا دیے گا اور پھر اس کو امیر کے حقے میں رکھ دے اور اس طرح ان کی صحت کو نقصان پہنچائے گا۔ امیر معظم اس کی جان بخشی کریں اور اس کو مجھے حوالے کریں۔ وہ معمولی پہرے داروں پر اپنے جادو سے قابو پا لے گا لیکن میرے خلاف اس کا زور نہیں چل سکتا کیونکہ اپنے علم سے میں جادوگروں کی ساری چالیں جانتا ہوں اور ان کے جادو کے توڑ کے سب طریقے معلوم ہیں۔ میں اس کو بند کر کے قفل پر ایسی دعا پڑھ دوں گا جو صرف مجھ کو معلوم ہے۔ اس طرح صرف اپنی جادو کی طاقت سے وہ قفل نہیں کھول سکے گا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو اذیت پہنچا کر میں اس کو سب کچھ قبولنے پر مجبور کروں گا۔''

''اچھا'' امیر نے کہا ''مولانا حسین، تم معقول بات کہہ رہے ہو۔ اس کو لے جاؤ اور جو جی چاہے کرو لیکن ہوشیار رہنا کہیں یہ بھاگ نہ جائے۔''

''میرا سر قلم کر دیجئے گا۔''

آدھ گھنٹے بعد خواجہ نصر الدین جواب امیر کے مشیر خاص اور نجومی بن چکے تھے اپنی نئی جائے رہائش پر آ گئے جو ان کے لئے محل کی فصیل کے ایک برج میں خاص طور سے سجی گئی تھی۔ ان کے پیچھے، سخت پہرے میں سر جھکائے ملزم تھا، اصلی مولانا حسین۔

خواجہ نصر الدین کی قیام گاہ سے اوپر برج میں ایک چھوٹا سا گول کمرہ تھا جس میں سلاخ دار کھڑکی

تھی۔خواجہ نصرالدین نے ایک بہت بڑی کنجی سے زنگ لگا ہوا پیتل کا قفل اور بکتر بند دروازہ کھولا۔ پہرے داروں نے بڈھے کو اندر ڈھکیل دیا۔اسے کولی پیال لیٹنے کے لئے پھینک دی۔خواجہ نصرالدین نے دروازے میں قفل لگا دیا اور اس پیتل کے قفل پر بڑی تیزی سیکچھ اس طرح پڑھتے رہے کہ پہرے داروں کی سمجھ میں صرف جابجااللہ کا نام آتا تھا۔

خواجہ نصرالدین اپنی قیام گاہ دیکھ کر خوش ہوئے۔امیر نے ان کو بارہ گدے، آٹھ تکئے اور سامان خانہ داری دیا تھا اور ایک ٹوکری نانیں، شہد اور بہت سی دوسری لطیف اور مزیدار چیزیں کھانے کے لئے اپنے دسترخوان سے بھیجی تھیں۔خواجہ نصرالدین بہت تھکے اور بھوکے تھے لیکن کھانا کھانے سے پہلے انہوں نے چھ گدے اور چار تکئے قیدی کو پہنچا دئے۔

بڈھا ایک کونے میں سمٹا سمٹایا پڑا تھا، اس کی آنکھیں اندھیرے میں غضب ناک بلی کی طرح چمک رہی تھیں۔

''اچھا'' خواجہ نصرالدین نے سہج سے کہا ''ہم اس برج میں تم کو تکلیف نہ ہونے دیں گے۔میں نیچے ہوں اور تم اوپر جیسا کہ تمہاری عمر اور دانائی کے لئے زیبا ہے۔ارے، یہاں کتنی گرد ہے! میں ذرا اس کو صاف کردوں۔''

وہ نیچے سے پانی کا ایک گھڑا اور جھاڑو لائے۔انہوں نے اچھی طرح پتھر کا فرش دھویا، گدے بچھائے اور تکئے لگائے۔پھر انہوں نے نیچے کا ایک اور چکر لگا اور نان، شہد، حلوہ اور پستے لائے جن کو انہوں نے ایمانداری کے ساتھ قیدی کے سامنے دو حصوں میں تقسیم کیا اور کہا:

''تم بھوکے نہیں رہوگے، مولانا حسین۔ہم کھانے کا کافی انتظام کر لیں گے۔یہ رہا حقہ اور تمباکو۔''

ہر چیز انہوں نے اس طرح سجادی کہ یہ چھوٹا سا کمرہ خود ان کے اپنے کمرے سے بہتر معلوم ہونے لگا۔اب خواجہ نصرالدین رخصت ہوئے اور دروازے میں قفل لگا دیا۔

بڈھا اکیلا پڑا رہا۔وہ بہت بدحواس تھا۔بڑی دیر تک وہ سوچتا اور گتھیاں سلجھاتا رہا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ اس کا کیا حشر ہو رہا ہے۔گدے بہت نرم تھے اور تکئے بھی آرامدہ تھے۔نہ تو نان میں اور نہ شہد یا تمباکو میں کوئی زہر تھا....سارے دن کے ہنگامے سے تھکے چور بڈھے نے اپنی قسمت کا فیصلہ

اللہ پر چھوڑ کر سونے کا ارادہ کیا۔

اس دوران میں وہ آدمی جو اس کی تمام مصیبتوں کا باعث تھا نیچے کے کمرے میں کھڑکی پر بیٹھا شفق کو رات میں ڈھلتے دیکھ رہا تھا اور اپنے غیر معمولی طوفانی زندگی اور محبوبہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو یہاں اس سے بہت ہی قریب تھی لیکن اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آنے لگی۔ موذنوں کی گونجتی ہوئی پرسوز آواز شہر کے اوپر کسی نقرئی فیتے کی طرف پھیل گئی۔ سیاہ آسمان میں تارے جھلملانے لگے۔ ان کی چمک اور جھلملاہٹ ایک خالص، سرد اور دور دراز کی آگ سے ملتی تھی۔ وہاں ستارہ القلب چمک رہا تھا جو دل سے تعلق رکھتا ہے اور تین ستارے الغفر تھے کسی دوشیزہ کے نقاب کی نشانی ہیں اور دو ستارے اسرطان تھے جو دو سینگیں پیش کرتے ہیں اور صرف ستارہ الشعلہ جو نحس اور موت کی نشانی ہے آسمان کی تاریک بلندیوں پر نہیں دکھائی دے رہا تھا...

حصہ سوم

اس پر سلام جو جاودانی اور لافانی ہے!

''الف الیلہ''

27

خواجہ نصر الدین نے امیر کا اعتماد اور عنایات حاصل کر لیں اور تمام معاملات میں اس کے خاص مشیر بن گئے۔ خواجہ نصر الدین فیصلے کرتے تھے۔ امیر کا کام صرف ان پر دستخط کرنا اور وزیر اعظم بختیار کا فرض منصبی صرف ان پر مہر لگانا تھا۔

''اللہ اکبر! ہماری ریاست میں اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے!'' بختیار نے ٹیکسوں کے خاتمے، سڑکوں اور پلوں کے مفت استعمال اور بازار کے نرخ کم کرنے کے بارے میں امیر کا فرمان پڑھ کر کہا ''جلد ہی خزانہ خالی ہو جائے گا! یہ نیا مشیر، خدا اس کو غارت کرے، اس نے تو ایک ہفتے میں وہ سب ڈھا دیا جو میں

نے دس سال میں بنایا تھا!''

ایک دن اس نے اپنے شبہات امیر کے گوش گذار کرنے کی جرأت کی لیکن امیر نے جواب دیا:

''مجہول انسان، تو کیا جانتا ہے اور کیا سمجھتا ہے؟ ہم کو بھی یہ فرمان جاری کر کے رنج ہوتا ہے جو ہمارے خزانے کو خالی کرتے ہیں لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں اگر ستاروں کا یہی حکم ہے؟ بختیار گھبراؤ نہیں! یہ صرف تھوڑے دن کے لئے ہے جب تک ستارے سازگار نہیں ہوتے۔ مولانا حسین، اس کو یہ سمجھاؤ!''

خواجہ نصرالدین وزیراعظم کو علحدہ لے گئے اور اس کو گدوں پر بٹھا کر بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا کہ لوہاروں، ٹھٹھیروں اور اسلحہ سازوں کے مزید ٹیکس فوراً ختم کرنے کی ضرورت کیوں ہے۔

''جھرمٹ قوس میں البلدہ ستارے جھرمٹ عقرب میں صد بلا ستاروں کے خلاف ہیں'' خواجہ نصرالدین نے کہا ''دانائے روزگار وزیر آپ سمجھتے ہیں نا کہ وہ خلاف ہیں اور دونوں کے قرآن کا امکان نہیں ہے۔''

''اچھا، تو اس سے کیا ہوتا ہے؟'' بختیار نے جواب دیا۔ ''وہ پہلے بھی قران میں نہیں تھے پھر انہوں نے ہم کو ٹیکس وصول کرنے سے نہیں روکا۔''

''لیکن آپ جھرمٹ ثور میں ستارہ الدبران کو بھول گئے!'' خواجہ نصرالدین نے زور سے کہا ''وزیر محترم، آپ آسمان کو دیکھئے خود پتہ چل جائے گا۔''

''میں آسمان کیوں دیکھوں'' ضدی وزیر نے کہا ''میرا کام ہے خزانے کی حفاظت کرنا اور اس کو دولت سے بھرنا اور میں دیکھتا ہوں کہ جب سے آپ محل میں آئے ہیں خزانے کی آمدنی گھٹ گئی ہے اور ٹیکسوں کا آنا کم ہو گیا ہے۔ یہی وقت شہر کے کاریگروں سے ٹیکس وصول کرنے کا ہے۔ بتایئے، ہم انہیں کیوں نہ وصول کریں؟''

''کیوں؟'' خواجہ نصرالدین چیخے ''میں ایک گھنٹے سے آپ کو یہی بات سمجھا رہا ہوں۔ کیا اب بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہر منطقہ البروج پر چاند کے دو محل ہوتے ہیں ایک تہائی کے ساتھ...''

''لیکن مجھے ٹیکس تو وصول کرنا ہی ہیں!'' وزیر نے پھر بات کاٹ کر کہا ''ٹیکس، سمجھتے ہیں نا آپ۔''

''صبر کیجئے'' خواجہ نصرالدین نے بختیار کو روک دیا ''ابھی میں نے آپ سے الثریا کے مجموعہ نجوم اور النعیم کے آٹھ ستاروں کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں...''

اب خواجہ نصرالدین نے ایسا پیچیدہ اور طویل بیان شروع کر دیا کہ وزیراعظم کے کان سننا نے لگے اور آنکھیں دھندلی پڑ گئیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا گیا اور خواجہ نصرالدین نے امیر کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

''آقائے نامدار، چاہے عمر نے ان کے سر کو چاندی سے ڈھک دیا ہو اور اس سے ان کا سر باہر سے بیش قیمت ہو گیا ہو لیکن جو کچھ اندر ہے وہ سونا نہیں بنا ہے۔ وہ میرے علم و فضل کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھے آقا! کاشکہ ان کو امیر کی ذہانت کا جو خود لقمان کی فراست کو مات کرتی ہے ہزارواں حصہ ہی ملا ہوتا!''

امیر بڑی مہربانی اور خود پسندی سے مسکرایا۔ ان دنوں خواجہ نصرالدین بڑی محنت سے اس کو یقین دلا رہے تھے کہ اس کی فراست کا کوئی جواب نہیں ہے اور اس کوشش میں خواجہ پوری طرح کامیاب ہوئے تھے چنانچہ جب وہ کوئی بات امیر کے سامنے ثابت کرنے لگتے تو امیر اس کو بڑے غور سے سنتا اور اس پر بحث نہ کرتا کیونکہ اس کو یہ ڈر تھا کہ کہیں اس کی ذکاوت کا پول نہ کھل جائے۔

...دوسرے دن بختیار نے اپنے دل کی بات درباریوں کے ایک گروہ سے کہی:

''یہ نیا دانا، مولانا حسین ہم سب کو تباہ کر دے گا! جس دن ٹیکس جمع کئے جاتے ہیں اسی دن ہم بھی اس ابلتے ہوئے چشمے سے سیراب ہوتے ہیں جو امیر کے خزانے کی طرف بہتا ہے۔ لیکن جب سیراب ہونے کا وقت آتا ہے تو یہ مولانا حسین ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیتا ہے! وہ ستاروں کا محل بتانے لگتا ہے۔ بھلا کبھی کسی نے یہ سنا ہے کہ یہ ستارے جو اللہ کے احکام کے تابع ہیں امرا و شرفا کے بھی خلاف پڑے ہوں اور حقیر کاریگروں کے لئے سازگار رہے ہوں جو، میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، اپنی کمائی ہمیں دینے کے بجائے خود بڑی بے شرمی سے چٹ کر رہے ہیں؟ بھلا کسی نے ستاروں کی ایسی گردش کے بارے میں سنا ہے؟ اس طرح کی کوئی کتاب نہیں لکھی جا سکتی تھی کیونکہ وہ کتاب فوراً جلا دی جاتی اور اس کے مصنف کو بہت بڑا کافر، منکر اور مجرم ٹھہرا کر سولی پر چڑھا دیا جاتا!''

درباریوں نے کچھ نہیں کہا کیونکہ انہیں قطعی یقین نہیں تھا کہ کسی کی طرف داری کرنا مفید ہوگا بختیار کی یا نئے دانا کی؟

''ٹیکس کی وصولیابی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے'' بختیار نے اپنی بات جاری رکھی ''اور کیا ہوگا؟ اس

مولانا حسین نے امیر کو یہ کہہ کر دھوکہ دیا ہے کہ ٹیکس چند دن کے لئے ختم کئے گئے ہیں اور بعد میں پھر ان کو لگا کر اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ امیر کو اس کی بات کا یقین ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کسی ٹیکس کو ختم کرنا آسان ہے لیکن کوئی نیا لگانا بہت ہی مشکل ہے۔ آدمی اپنا پیسہ اس وقت جلدی دے دیتا ہے جب وہ اس بات کا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ پیسے کو کسی دوسرے کا سمجھے لیکن ایک بار وہ اپنے اوپر یہ رقم خرچ کر لے تو پھر دوسری بار اس کو اسی طرح خرچ کرنا چاہے گا۔

''خزانہ خالی ہو جائے گا اور ہم یعنی امیر کے درباری تباہ ہو جائیں گے۔ زربفت کے لباس کے بجائے ہمیں موٹے کپڑے پہننا پڑیں گے۔ بیس بیویوں کے بجائے ہمیں دو ہی پر قناعت کرنی پڑے گی۔ چاندی کی پلیٹوں میں کھانے کے بجائے مٹی کے برتن ہوں گے اور نرم میمنے کے نرم گوشت کے پلاؤ کے بجائے ہمیں گائے کے سخت گوشت کا پلاؤ کھانا پڑے گا جو صرف کتوں اور دستکاروں کے لئے ہی موزوں ہے۔ یہی مولانا حسین ہمارے لئے کرنے والا ہے۔ جو اس کو نہیں سمجھتا وہ اندھا ہے اور لعنت ہو اس پر!''

اس طرح کہہ کر بختیار نے نئے دانا کے خلاف درباریوں کو بہکانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی کوشش بے سود رہیں۔ مولانا حسین کو اپنے منصب میں برابر کامیابیاں ہوتی گئیں۔ وہ خاص طور سے ''یوم مدح سرائی،، کے موقع پر ممتاز رہا۔ ایک پرانے رواج کے مطابق ہر مہینے تمام وزرا و امرا، حکما و شعرا کا امیر کے سامنے مقابلہ ہوتا تھا جس میں امیر کی مدح و ثنا کی جاتی تھی۔ مقابلے میں جیتنے والے کو انعام ملتا تھا۔

ہر شخص نے اپنا قصیدہ پیش کیا لیکن امیر خوش نہیں ہوا۔ اس نے کہا:

''یہی باتیں تم نے پچھلی بار بھی کہی تھیں۔ ہم دیکھتے ہیں تم اپنی تعریفوں میں زیادہ گہرے نہیں ہو۔ تم اپنے دماغوں پر زور دینا نہیں چاہتے ہو۔ ہم تم سے سوالات کریں گے اور تم ان کا جواب اس طرح دو کہ تعریف و تشبیہہ دونوں کو امتزاج ہو جائے۔ غور سے سنو، ہمارا پہلا سوال ہے۔ اگر ہم، امیر اعظم بخارا تمہارے دعوے کے مطابق طاقتور اور ناقابل تسخیر ہیں تو پڑوسی اسلامی ممالک کے حکمرانوں نے ابھی تک ہمارے یہاں اپنے ایلچی اور قیمتی تحائف ہماری مکمل اطاعت کے پیغام کے ساتھ کیوں نہیں بھیجے ہیں؟ ہم تمہارے جواب کے منتظر ہیں۔''

درباری گھبرا گئے۔ وہ براہ راست جواب کے بجائے منہ ہی منہ میں بد بدانے لگے۔ صرف خواجہ نصرالدین پرسکون تھے۔ جب ان کی باری آئے تو وہ بولے:

''میں اپنے حقیر الفاظ امیر کے گوش گذار کرنے کی التجا کرتا ہوں۔ ہمارے شاہ کے سوال کا جواب آسان ہے۔ پڑوسی ملکوں کے تمام حکمراں ہمارے آقا کی قدرت کامل سے برابر لرزاں وترساں رہتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں: 'اگر ہم بخارا کے عظیم، صاحب شان وشوکت امیر کو بیش قیمت تحفے بھیجیں تو وہ یہ سوچ سکتے ہیں کہ ہمارا ملک زرخیز ہے جو ان کے لئے اس بات کی ترغیب ہوگی کہ وہ فوجیں لے کر ہم پر چڑھ آئیں اور ہمارے ملک پر قبضہ کر لیں۔ اگر اس کے برعکس ہم ان کو حقیر تحفے بھیجیں تو وہ ناراض ہو جائیں گے اور اپنی فوج ہمارے خلاف بھیج دیں گے۔ بخارا امیر عظیم، صاحب شان وشوکت اور طاقتور ہیں اس لئے یہی بہتر ہے کہ ہم ان کو اپنے وجود کی یاد ہی نہ دلائیں۔،

''یہ ہیں خیالات جو بادشاہوں کے دماغوں میں ہیں اور اس کا سبب کہ وہ بیش بہا تحفوں کے ساتھ اپنے سفیر بخارا کیوں نہیں بھیجتے ہمارے بادشاہ کی قدرت کامل کے مستقل خوف میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔''

''اہا'' خواجہ نصر الدین کے جواب سے مسرور ہو کر امیر نے کہا ''امیر کے سوالوں کا جواب اسی طرح دینا چاہئے! سنی تم لوگوں نے مولانا حسین کی بات؟ ارے بیوقوفو، گاؤدیو! ان سے سیکھو! واقعی مولانا حسین کی عقل ودانش تم سے دسیوں گنی زیادہ ہے۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

درباری باورچی نے فوراً لپک کر خواجہ نصر الدین کا منہ حلوے اور شیرینی سے بھر دیا۔ خواجہ نصر الدین کے گال پھول گئے اور گلا گھٹنے لگا۔ میٹھی رال ان کی ٹھڈی تک بہر نکلی۔

امیر نے اور کئی ٹیڑے سوال کئے لیکن ہر بار خواجہ نصر الدین ہی جواب بہترین رہا۔

''درباری کا اولین فرض کیا ہے؟'' ایک ایسا ہی سوال تھا جس کا جواب خواجہ نصر الدین نے یوں دیا:

''اے صاحب شان وشوکت اور باعظمت بادشاہ! درباری کا اولین فرض ہے کہ وہ روزانہ ریڑھ کی کسرت کرتا رہے تا کہ اس میں ضروری لچک پیدا ہو جائے کیونکہ اس کے بغیر وہ بجا طور پر اپنی وفاداری اور احترام کا اظہار نہیں کر سکتا۔ درباری کی ریڑھ کی ہڈی میں جھکنے کے ساتھ ساتھ چاروں طرف گھومنے مرنے کی خوبی بھی ہونی چاہئے۔ اس میں عام آدمی کی پتھرائی ہوئی ریڑھ کی ہڈی سے امتیاز ہونا چاہئے جس کو ٹھیک سے جھک کر سلام کرنا بھی معلوم نہیں ہے۔''

''بالکل ٹھیک!'' امیر نے خوش ہو کر روز سے کہا۔ ''بالکل ٹھیک! اپنی ریڑھ کی ہڈی کی روزانہ کسرت! ہم دوسری بار مولانا حسین کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

ایک بار پھر خواجہ نصر الدین کا منہ حلوے اور شیرینی سے بھر دیا گیا۔

اس دن بہت سے درباری بختیار کے گٹ کو چھوڑ کر خواجہ نصر الدین سے آن ملے۔

اس دن بہت سے درباری بختیار نے ارسلان بیگ کو اپنے گھر مدعو کیا۔ نیا دانا دونوں کے لئے مساوی طور پر خطرناک تھا اور اس کو ختم کرنے کی خواہش نے ان کی پرانی دشمنی کو عارضی طور پر دبا دیا تھا۔

''اگر اس کے پلاؤ میں کچھ ملا دیا جائے تو اچھا رہے گا'' ارسلان بیگ نے تجویز کی جو ایسے کاموں میں بڑا استاد تھا۔

''اور اس کے بعد امیر ہمارے سر قلم کر دے گا'' بختیار چٹ سے بولا۔ ''نہیں محترم ارسلان بیگ ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ ہمیں مولانا حسین کی عقلمندی کی ہر طرح تعریف کرنی چاہئے یہاں تک کہ امیر کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ درباری مولانا حسین کو خود امیر سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ ہمیں متواتر مولانا حسین کی تعریفوں کے پل باندھ دینا چاہئے اور ایک دن ایسا آئے گا جب امیر رشک کرنے لگے گا۔ وہ دن مولانا حسین کے عروج کا آخری دن اور اس کے زوال کی ابتدا ہوگی۔''

لیکن قسمت خواجہ نصر الدین پر مہربان تھی اور ان کی غلطیاں بھی ان کے لئے مفید بن جاتی تھیں۔

جب بختیار اور ارسلان بیگ نے نئے دانا کی مسلسل اور مبالغہ آمیز مدح وثنا سے تقریباً اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا اور امیر دل ہی دل میں اس سے رشک کرنے لگا تھا تو اتفاق سے خواجہ نصر الدین سے ایک فاش غلطی ہوگئی۔

خواجہ امیر کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے، پھولوں کی مہک اور چڑیوں کی چہکار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ امیر خاموش تھا۔ خواجہ نصر الدین نے یہ محسوس کیا کہ اس خاموشی میں کچھ ناراضگی پنہاں ہے لیکن اس کی وجہ نہ سمجھ سکے۔

''اور وہ بڈھا، تمہارا قیدی کیسا چل رہا ہے؟'' امیر نے پوچھ لیا۔ ''کیا تم نے اس کا اصلی نام اور بخارا آنے کا سبب معلوم کر لیا؟''

خواجہ نصر الدین اس وقت گل جان کے خیال میں محو تھے۔ اس لئے انہوں نے کھوئے پن سے جواب دیا:

''جہاں پناہ غلام کو معاف کریں! میں ابھی تک اس بڈھے سے ایک لفظ بھی نہیں معلوم کر سکا۔ بس،

وہ توبت کی طرح گونگا ہے۔''

''لیکن کیا تم نے اس کو اذیت پہنچانے کی کوشش کی؟''

''ہاں، ہاں، خداوند نعمت! پرسوں میں نے اس کے جوروں کو کس دیا۔ کل میں گرم چمٹی سے اس کے دانت ہلانے میں سارا دن صرف کیا۔''

''دانت ہلانا بڑی اچھی اذیت ہے'' امیر نے تصدیق کی۔ ''حالانکہ یہ عجیب بات ہے کہ وہ خاموش ہے۔ کیا میں کوئی ماہر اور تجربے کار جلاد تمہاری مدد کے لئے بھیجوں؟''

''نہیں، حضور والا اس فکر کی زحمت نہ کریں۔ کل میں ایک نئی اذیت آزماؤں گا۔ کل میں بڈھے کی زبان اور مسوڑے ایک لال انگارہ برمے سے چھیدوں گا۔''

''ٹھہرو! ٹھہرو!'' امیر نے زور سے کہا۔ اس کا چہرہ یک دم خوشی سے چمک اٹھا۔ ''بھلا وہ تمہیں اپنا نام کیسے بتائے گا اگر تم نے اس کی زبان جلتے ہوئے برمے سے چھید دی! مولانا حسین، تم نے اس کی بابت کبھی نہیں سوچا تھا، ہے نا؟ اور ہم نے، امیر اعظم نے یہ فوراً سوچ لیا اور تم کو ایک زبردست غلطی کا مرتکب ہونے سے بچالیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر چہ تم دانائے بے نظیر ہو ہماری عقل و فراست تم سے کہیں زیادہ ہے، جیسا کہ تم نے ابھی ابھی دیکھا۔''

وہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ مسرت میں سرشار اس نے درباریوں کو فوراً طلب کیا۔ جب وہ سب جمع ہو گئے تو اس نے اعلان کیا کہ اس دن وہ مولانا حسین سے عقل و دانش میں سبقت لے گیا ہے اور ایسی غلطی بچالی ہے جو دانا کرنے ہی والا تھا۔

درباری واقعہ نویس نے آنے والی نسلوں کے لئے امیر کے ایک ایک لفظ کو بڑی محنت سے لکھ لیا۔

اس دن سے امیر کے دل میں رشک و حسد نہیں رہا۔

اس طرح ایک اتفاقیہ غلطی نے خواجہ نصر الدین کے دشمنوں کی عیارانہ سازشوں کو ناکام بنا دیا۔

لیکن رات کی تنہائیوں میں ان کی پریشانی زیادہ بڑھنے لگی۔ پورا چاند شہر بخارا پر بلند ہو چکا تھا۔ بے شمار میناروں کے سروں پر روغن دار کھپرے چمک رہے تھے اور پتھر کی زبردست بنیادیں ایک نیلگوں دھندلے مستور تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ چھتوں پر تو خنک تھی لیکن نیچے جہاں زمین اور دھوپ سے جلتی ہوئی دیواروں کو ٹھنڈا ہونے کے لئے کافی وقت نہیں ملا تھا۔ یہی ہوا گھٹن پیدا کر رہی تھی۔ سب

چیزوں پر نیند چھائی ہوئی تھی۔محل، مسجدوں اور جھونپڑیوں پر۔صرف الوا پنی تیز چیخوں سے اس مقدس شہر کے امن وسکوت میں خلل انداز ہو رہے تھے۔

خواجہ نصرالدین کھلی کھڑکی پر بیٹھے تھے۔ان کا دل یہ کہتا تھا کہ گل جان بھی ابھی نہ سوئی ہوگی اور انہیں کے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔شاید اس وقت وہ دونوں ایک ہی مینار کو دیکھ رہے ہوں لیکن ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ وہ دیواروں، سلاخوں، خواجہ سراؤں اور مغلانیوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جدا تھے۔خواجہ نصرالدین محل میں تو آ گئے تھے لیکن ابھی حرم تک پہنچ نہیں ہوئی تھی جس کا موقع قسمت ہی سے مل سکتا تھا۔وہ انتھک اس موقع کے بارے میں سوچتے رہتے لیکن سب بے سود ہوتا! وہ گل جان کو کوئی پیام تک نہ بھیج سکے تھے۔وہ کھڑکی پر بیٹھے ہوا کو چوم کر یہ کہہ رہے تھے:

''تیرے لئے تو یہ بہت آسان ہے! آہستہ سے اس کی کھڑکی کے اندر جا کر اس کے ہونٹ چوم۔ گل جان کو میرا بوسہ اور پیام پہنچا! اس سے بتا کہ میں اس کو بھولا نہیں ہوں اس سے کہہ کہ میں اسے نجات دلاؤں گا۔''

لیکن ہوا خواجہ نصرالدین کو غم میں ڈوبا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

پھر حسب معمول ایک اور دن کاموں اور فکروں کے ساتھ شروع ہو جاتا۔پھر خواجہ نصرالدین کو دربار میں حاضر ہونا پڑتا، امیر کی آمد کا انتظار کرنا ہوتا، درباریوں کی چاپلوسیاں سننا پڑتیں، بختیار کی عیارانہ سازشوں کو سمجھنا اور اس کی خفیہ زہریلی نگاہوں کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔پھر امیر کے سامنے جھکنا پڑتا، اس کے قصیدے پڑھنے پڑتے اور اس کے بعد امیر کے ساتھ گھنٹوں تنہائی میں رہ کر، اس کے پھولے اور مسخ چہرے سے نفرت کے باوجود، اس کی احمقانہ باتوں کو غور سے سننا پڑتا اور اس کو ستاروں کی گردش کے بارے میں بتانا پڑتا۔خواجہ نصرالدین ان باتوں سے اتنے تنگ آ چکے تھے کہ وہ کوئی نئی بات نہ کہتے اور ہر چیز کی خواہ وہ امیر کا دردسر ہو یا فصل کی خشک سالی اور غلے کی گرانی ایک ہی الفاظ میں اور ایک ہی ستاروں کے جھرمٹ سے تاویل کر دیتے۔وہ اکتائے لہجے میں کہتے:

''سعدالذبیح کے ستارے جھرمٹ قوس کے خلاف ہیں جب کہ سیارہ عطارد اب جھرمت عقرب کے بائیں طرف آ گیا ہے۔امیر کو کل رات نیند آنے کی وجہ یہ ہے۔''

''سعدالذبیح کے ستارے سیارہ عطارد کے خلاف ہیں جب کہ.... مجھے یہ یاد رکھنا چاہئے...مولانا

حسین اس کو دھراؤ۔''

بہر حال امیر اعظم کے یہاں حافظے کا فقدان تھا۔

دوسرے دن پھر اسی پر نئے سرے سے بات چیت شروع ہوتی:

''امیر اعظم پہاڑی علاقوں میں مویشیوں کی ہلاکت کا سبب یہ ہے کہ سعد الذبیح کے ستارے جھرمٹ قوس سے مطابقت کر رہے ہیں جب کہ عطارد عقرب کے خلاف ہے۔''

''اچھا تو سعد الذبیح کے ستارے'' امیر کہتا ''مجھے یہ یاد رکھنا چاہئے۔''

''اللہ اکبر! کتنا احمق ہے یہ!'' خواجہ نصر الدین عاجز آ کر سوچتے۔ ''یہ تو میرے سابق مالک سے بھی زیادہ دگدھا ہے! میں تو اس تنگ آ گیا۔ نہیں معلوم مجھے اس محل سے کب نجات ملے گی!''

اس دوران میں امیر اور کوئی موضوع چھیڑ دیتا:

''مولانا حسین، ہماری سلطنت میں امن واطمینان کا دور دورہ ہے۔ اب خواجہ نصر الدین کی کوئی خبر نہیں آئی۔ وہ کہاں چلا گیا؟ وہ کیوں خاموش ہے؟ ہمیں یہ بتاؤ۔''

''شہنشاہ معظم، مرکز عالم! سعد الذبیح کے ستارے...'' خواجہ نصر الدین نے اکتائی اور تھکی ہوئی آواز سے کہنا شروع کیا اور وہی سب باتیں دھراڈالیں جو پہلے نہ جانے کتنی بار کہہ چکے تھے ''اور اس کے علاوہ، عظیم امیر، یہ بدمعاش خواجہ نصر الدین بغداد جا چکا ہے اور ظاہر ہے کہ اس نے میری عقل و دانش کی شہرت سنی ہوگی اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں بخارا آ گیا ہوں تو وہ خوف و ہراس سے پوشیدہ ہو گیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کو آسانی سے گرفتار کر سکتا ہوں۔''

''اس کو گرفتار کر سکتے ہو؟ یہ تو بہت اچھا رہے گا! لیکن تم یہ کام کیسے کرنے والے ہو؟''

''اس کے لئے میں سعد الذبیح کے ستاروں اور سیارہ مشتری کے قرآن سعدین کا انتظار کروں گا۔''

''سیارہ مشتری کے ساتھ'' امیر نے دھرایا ''مجھے یہ یاد رکھنا چاہئے۔ مولانا، جانتے ہو کل رات میرے دماغ میں ایک لاجواب خیال آیا ہے۔ ہم نے سوچا کہ بختیار کو برطرف کر کے اس کی جگہ پر تم کو وزیر اعظم مقرر کیا جائے۔''

خواجہ نصر الدین کو امیر کے سامنے جھک کر اس کی تعریف کرنی پڑی اور شکریہ ادا کرنا پڑا اور یہ وضاحت کرنا پڑی کہ فی الحال سعد الذبیح کے ستارے وزیروں میں کسی تبدیلی کے لئے ناسازگار ہیں۔

''جلدی، جلدی بھاگو یہاں سے!'' خواجہ نصرالدین نے سوچا۔

اس طرح محل میں ان کی زندگی خوشیوں سے خالی اور اداس گذر رہی تھی۔ وہ بازار، بھیڑ بھکڑ، چائے خانوں اور دھوئیں بھرے باورچی خانوں کے لئے بے تاب تھے۔ وہ امیر کے پورے لذیذ دستر خوان کو لات مار کر بھیڑ کے پایوں کے گرم گرم پیاز کٹے خوب چٹ پٹے شوربے کے پیالے یا بھیڑ کی سخت بوٹیوں کے سستے بازاری پلاؤ کو خوشی سے ترجیح دیتے۔ خوشامد اور تعریف کی جگہ وہ سیدھی سادی بات چیت اور زندہ دلانہ قہقہے سننے کے لئے اپنے زرتار لباس کا تبادلہ چیتھڑوں سے کر سکتے تھے۔

لیکن قسمت کو خواجہ نصرالدین کی آزمائش منظور تھی اس لئے وہ سازگار موقع نہیں ہاتھ آرہا تھا جس کا مدتوں سے انتظار تھا۔ اس دوران امیر برابر یہ پوچھتا رہتا کہ آخر کب ستارے اس کو اپنی نئی داشتہ کا نقاب الٹنے کی اجازت دیں گے۔

28

ایک دن امیر نے خواجہ نصرالدین کو بے وقت طلب کر لیا۔ صبح کا تڑکا تھا، محل سویا ہوا تھا، فوارے کلبلا رہے تھے اور قمریاں کوکو کر کے اپنے پر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔

''اس کو مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے؟'' خواجہ نصرالدین نے شاہی کمرے کی طرف جانے والے یشب کے زینوں پر چڑھتے ہوئے سوچا۔

خواجہ کی مڈبھیڑ بختیار سے ہوئی جو خواب گاہ سے نکل کر چپکے سے سائے کی طرح غائب ہو گیا۔ انہوں نے بلا رکے ہوئے صاحب سلامت کی۔ خواجہ نصرالدین تاڑ گئے کہ کچھ سازش ہے اور پھونک پھونک کر قدم بڑھانے لگے۔

خوابگاہ میں خواجہ سراؤں کا داروغہ موجود تھا۔ حضور عصمت مآب شاہی بستر کے پاس پٹ پڑے ہوئے بری طرح کراہ رہے تھے۔ سونے سے منڈھے ہوئے پام کے ایک بید کے ٹکڑے ٹوٹے ہوئے ان کے پاس قالین پر بکھرے ہوئے تھے۔

مخمل کے بھاری پردوں نے خواب گاہ میں صبح کی تازہ ہوا، سورج کی شعاعیں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ کو آنے سے روک رکھا تھا۔ کمرے میں ایک ٹھوس سونے کے لیمپ کی دھیمی روشنی تھی جو سونے

کا ہونے کے باوجود معمولی مٹی کے چراغ کی طرح دھواں اور بودے رہا تھا۔ایک کونے میں نقشی عوددان سے بڑی بھینی بھینی تیز خوشبو نکل رہی تھی لیکن وہ بھیڑ کی چربی کی بو کو نہیں دور کر سکی تھی۔خواب گاہ کی فضا اتنی بھاری تھی کہ خواجہ نصرالدین کی ناک میں کھجلی ہونے لگی اور گلا گھٹنے سا لگا۔

امیر بیٹھا ہوا تھا۔اس کے بالدار پیر ریشمی لحاف سے باہر نکلے ہوئے تھے۔خواجہ نصرالدین نے دیکھا کہ شاہ کی ایڑیاں ایسی زرد تھیں جیسے اس نے ان کو اکثر اپنے ہندی عوددان کے اوپر سینکا ہو۔

''مولانا حسین، ہم سخت پریشان ہیں'' امیر نے کہا ''اور ہمارے خواجہ سراؤں کا داروغہ، جس کو تم یہاں دیکھتے ہو اس کا سبب ہے۔''

''شہشاہ معظم!'' خواجہ نصرالدین نے زور سے کہا لیکن اندر سے برف ہو گئے ''اس کی یہ جرأت کیسے ہوئی؟''

''ارے، نہیں!'' امیر نے تیوری چڑھا کر ہاتھ جھٹکا۔''وہ کیسے کر سکتا تھا جب کہ ہم نے حسب معمول اپنی فراست ودانائی سے ہر چیز پہلے سے دیکھ لی اور اس کو خواجہ سراؤں کا داروغہ مقرر کرنے سے پہلے ہر بات اچھی طرح جانچ لی تھی۔نہیں، نہیں، اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ہمیں آج یہ معلوم ہوا کہ یہ بدمعاش، ہمارے خواجہ سراؤں کا داروغہ، اس بات کو بھول گیا کہ ہم نے اس کو اپنی سلطنت میں ایک بہت ہی اونچا منصب عطا کیا ہے اور اپنے فرائض سے غفلت برتنے لگا۔

''اس بات سے فائدہ اٹھا کر کہ ہم آج کل اپنی داشتاؤں کے پاس نہیں جا رہے ہیں اس نے تین دن حرم سے غائب رہ کر حشیش پینے کی لت میں مست رہنے کی جرأت کی۔حرم کا نظم ونسق بگڑ گیا۔ہماری داشتائیں بے مہار ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے، ایک دوسرے کا منہ اور بال نوچنے لگیں۔اس سے ہمارا کافی نقصان ہوا کیونکہ ہماری نگاہ میں وہ عورت حسین نہیں ہو سکتی جس کے چہرے پر کھرونچے ہوں اور سر کے کافی بال غائب ہو چکے ہوں۔اس کے علاوہ ایک اور بات نے ہم کو رنج وغم میں غرق کر دیا ہے۔ہماری نئی داشتہ بیمار پڑ گئی ہے اور تین دن سے کھانا نہیں کھا رہی ہے۔''

خواجہ نصرالدین چونک پڑے لیکن امیر نے ان کو اشارے سے روکا:

''رکو، ابھی ہم نے بات نہیں ختم کی ہے۔وہ بیمار پڑ گئی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اپنی جان ہی گنوا بیٹھے۔اگر ہم اس کے پاس صرف ایک ہی بار گئے ہوتے تو ہم کو اس کی بیماری، حتیٰ کہ اس کی موت کا بھی اتنا غم نہ

ہوتا۔لیکن تم سمجھ سکتے ہو،مولانا حسین، کہ موجودہ حالات میں ہم کس قدر ناراض ہیں۔اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے'' امیر نے اپنی آواز بلند کردی'' کہ مزید کوفتوں اوفکروں سے بچنے کے لئے ہم اس حشیش پینے والے بدمعاش، پاجی کو برطرف کردیں،اس کو اپنی عنایات سے محروم کردیں اواس کو دوسو درے لگوائیں۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے،مولانا حسین، ہم نے اس کے برعکس فیصلہ کیا ہے کہ تم پر عنایت کرتے ہوئے اپنے حرم میں خواجہ سراؤں کے داروغہ کے عہدے پر فائز کریں۔''

خواجہ نصرالدین کو محسوس ہوا جیسے ان کے پیر سن ہوگئے ہیں،ان کی سانس گلے ہی میں رک گئی ہے اوران کے پیٹ کے اندر کسی نے برف کی سل رکھ دی ہے۔

امیر نے تیوری چڑھا کر دھمکی آمیز لہجے میں دریافت کیا:

''مولانا حسین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہم سے بحث کرنے پر تلے ہو۔کیا ایسے ہے کہ تم بیگار اور وقتی خوشیوں کو ماب دولت کی خدمت کرنے کی عظیم مسرت پر ترجیح دیتے ہو؟''

خواجہ نصرالدین نے اب تک اپنے کو سنبھال لیا تھا۔وہ بہت جھک کر تعظیم بجالائے اور بولے:

''خدا ہمارے مہربان بادشاہ کو سلامت رکھے۔مجھ پر امیر کی عنایات بے انتہا ہیں۔شہنشاہ معظم میں اپنی رعایا کے انتہائی خفیہ اور اندرونی آرزوؤں کو معلوم کرنے کی معجزنما خوبی ہے۔اس طرح وہ اپنی رعایا پر متواتر اکرام کی بارش کرتے رہتے ہیں۔میں نے،اس ناچیز نے اکثر یہ تمنا کی ہے کہ اس کاہل اور بیوقوف آدمی کی جگہ حاصل کروں جو منصفانہ سزا پانے کے بعد جس کا وہ خود سبب بنا ہے قالین پر پڑا کراہ رہا ہے اور فریاد کررہا ہے۔کتنی بار یہ خواہش میرے دل میں آئی لیکن میں نے امیر سے عرض نہیں کیا۔لیکن اب خود شہنشاہ اعظم نے فرمایا۔''

''تو پھر دیر کیوں ہو؟'' امیر نے خوش ہوکر دوستانہ انداز میں ان کی بات کاٹ دی۔''ہم حکیم کو طلب کرتے ہیں۔وہ اپنے چاقو ساتھ لائے گا اور تم اس کے ساتھ تنہا جگہ میں چلے جاؤ گے۔اس دوران میں ہم بختیار کو حکم دیں گے کہ وہ تم کو خواجہ سراؤں کا داروغہ مقرر کرنے کے فرمان تیار کرلے۔ارے!'' اس نے زور سے کہا اور تالی بجائی۔

''حضور اعلیٰ میری حقیر بات بھی سن لیں'' خواجہ نصرالدین نے ہراساں دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔''میں بڑی خوشی کے ساتھ حکیم کے ساتھ فوراً کسی تخلیے کی جگہ جانے کو تیار ہوں لیکن

صرف حضور کی سلامتی کی فکر مجھے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔اس عمل کے بعد مجھے کئی دن تک صاحب فراش رہنا پڑے گا۔اس دوران میں نئی داشتہ مرسکتی ہےاور پھرامیر کے دل پرغم کے سیاہ بادل چھا جائیں گےجس کا خیال ہی ان کے غلام کے لئے ناقابل برداشت ہے۔اس لئے میری تجویز یہ ہے کہ پہلے داشتہ صحت منہ ہوجائے اس کے بعد میں حکیم کے پاس جاؤں اورخواجہ سراؤں کے داروغہ کے منصب کے لئے تیاری کروں۔''

''ہونہہ''امیرخواجہ نصرالدین کی طرف بےاعتباری سے دیکھے ہوئے بڑبڑایا۔

''آقا،اس نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا ہے۔''

''ہونہہ''امیر نے دھرایا۔پھر وہ کراہتے ہوئے خواجہ سرا کی طرف مڑگیا''ارے،کمبخت مکڑی کے بچے جواب دے،کیا ہماری نئی داشتہ بہت بیمار ہے،کیااس کی جان کا خطرہ ہے؟''

خواجہ نصرالدین بڑی بےچینی سے جواب کا انتظار کررہے تھے۔ان کے چہرے پرٹھنڈا پسینہ بہہ رہا تھا۔

خواجہ سرا نے کہا:

''شہنشاہ معظم،ہو ہلال کی طرح دبلی اورزرد ہوگئی ہے۔اس کا چہرمومی ہوگیا ہےاورانگلیاں ٹھنڈی پڑگئی ہیں۔مغلانیاں کہتی ہیں کہ یہ بہت بری علامتیں ہیں....''

امیرسوچ میں پڑگیا۔خواجہ نصرالدین تاریکی میں ہٹ گئے۔وہ خواب گاہ کی اس دھواں دھواں سی نیم تاریکی کےشکرگذار تھےجس نے ان کے چہرے کی زردی چھپالی تھی۔

''ہاں!''آخرکارامیر بولا۔''اگرایسا ہےتوممکن ہے کہ وہ مرجائے اوراس سےہمیں بڑارنج ہوگا۔ لیکن کیا تمہیں یقین ہے۔مولانا حسین،کہ تم اس کوشفایاب کرسکوگے؟''

''بادشاہ سلامت جانتے ہیں کہ بخارااور بغداد کے درمیان میرا جیسا کوئی حکیم نہیں ہے۔''

''جاؤ،مولانا،اس کے لئے دوا تیارکرو۔''

''بادشاہ سلامت،پہلے مجھےاس کی بیماری معلوم کرنی ہوگی۔مجھےاسے دیکھنا چاہئے۔''

''اسے دیکھنا چاہئے؟''امیر نے حقارت سے ہنس کرکہا۔''مولانا حسین،جب تم خواجہ سراؤں کے داروغہ ہوجاؤ گےتو تم کواسے دیکھنے کے لئے کافی وقت ملے گا۔''

''اعلیٰ حضرت!'' خواجہ نصرالدین زمین تک جھک گئے۔ ''مجھے ضرور....''

''دلیل غلام!'' امیر چیخا۔ ''کیا تو نہیں جانتا کہ ہماری داشتاؤں کے چہرے پر کسی آدمی کی نگاہ پڑنے کا انجام اس کی اندوہناک موت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں، اعلیٰ حضرت!'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا مطلب اس کے چہرے سے نہ تھا۔ میں اس کے چہرے کو دیکھنے کی کبھی جرأت نہیں کرسکتا۔ میرے لئے تو صرف اس کا ہاتھ دیکھنا کافی ہوگا کیونکہ میں اپنے پیشے میں کافی ماہر ہوں اور میں ہر بیماری کی تشخیص ناخونوں کا رنگ دیکھ کے کرسکتا ہوں۔''

''اس کا ہاتھ؟'' امیر نے دھرایا۔ ''تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتادیا تاکہ ہمیں غصہ نہ آتا؟ اس کا ہاتھ؟ ہاں، یہ ممکن ہے۔ ہم تمہارے ساتھ حرم میں چلیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ کسی عورت کا ہاتھ دیکھنا ہمارے لئے نقصان کا باعث نہ ہوگا۔''

''اس کے ہاتھ پر نگاہ ڈالنے سے اعلیٰ حضرت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ چونکہ وہ گل جان سے کبھی تنہا نہیں مل سکیں گے کسی نہ کسی کی موجودگی لازمی ہے۔ اس لئے اگر وہ آدمی امیر خود ہی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ اس طرح امیر کو شک بھی نہ ہو گا۔

29

اتنے دن انتظار میں بیگار گذارنے کے بعد بالآخر حرم کے دروازے خواجہ نصرالدین کیلئے کھل گئے۔

پہرے دار تعظیم بجالاتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے۔ خواجہ نصرالدین امیر کے پیچھے ایک پتھر کے زینے پر چڑھے اور پھر ایک چھوٹے دروازے کے ذریعہ حسین باغ میں آ گئے۔ یہاں گلاب، اور سوسن وسنبل کے تختے کھلے تھے اور ان کے درمیان سنگ مرمر اور سنگ اسود کے حوضوں میں فوارے اچھل رہے تھے۔ ان پر پانی کی ایک لطیف چادر سی پھیلی ہوئی تھی۔ پھولوں اور گھاس پر صبح کی شبنم چمک اور تھرک رہی تھی۔

خواجہ نصرالدین کا ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ خواجہ سرا نے اخروٹ کا نقشیں دروازہ کھول دیا۔ مشک و

وعنبر اور گلاب کے عطر کا ایک زوردار بھبکا اندر کے پراسرار حصے سے آیا۔ یہ تھا حرم، امیر کے حسین قیدیوں کی غم انگیز رہائش گاہ۔

خواجہ نصر الدین نے ایک ایک کونے، گذرگاہ اور موڑ کو اچھی طرح ذہن نشین کولیا۔ تاکہ جب وہ فیصلہ کن لمحہ آئے تو راستہ نہ بھولیں کیونکہ اس کا مطلب اپنی اور گل جان دونوں کی موت تھا۔

''دائیں طرف'' انہوں نے دل ہی دل میں دہرایا ''پھر بائیں۔ یہاں ایک زنیہ ہے جس پر ایک بڈھی عورت پہرے دے رہی ہے۔ اب پھر بائیں کو...''

گذرگاہوں میں بہت مدہم روشنی تھی جو نیلے، سبز اور گلابی چینی شیشوں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔

خواجہ سرا ایک تنگ سے دروازے کے پاس رک گیا:

''آقا، وہ یہاں ہے۔''

خواجہ نصر الدین نے امیر کے پیچھے اس چوکھٹ کو پار کیا جو ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی تھی۔

چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی دیواریں اور فرش قالینوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ طاقچوں میں سیپ کے ڈبے رکھے تھے جن میں کنگن، بالیاں اور ہار بھرے ہوئے تھے اور دیوار پر ایک چاندی کے فریم کا آئینہ آویزاں تھا۔ بیچاری گل جان نے تو یہ زر و جواہر خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے! خواجہ نصر الدین کی نگاہ اس کی موتیوں سے مرصع چھوٹی سی جوتیوں پر پڑی اور وہ کانپ گئے۔ گل جان نے ان کے تلے گھس دئے تھے۔ ان کو اپنے جذبات کا گلا گھونٹنے کے لئے اپنی تمام قوت ارادی سے کام لینا پڑا۔

خواجہ سرا نے ایک کونے میں ریشمی پردے کی طرف اشارہ کیا۔ گل جان وہاں لیٹی تھی۔

''وہ سو رہی ہے'' خواجہ سرا نے سرگوشی میں کہا۔

خواجہ نصر الدین کے اندر ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ ان کی محبوبہ اتنی قریب تھی۔ ''اپنے دل کو فولاد کا بنالو، سب جھیل جاؤ، خواجہ نصر الدین!'' انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔

جب وہ پردے کی قریب گئے تو انہوں نے سوتی ہوئی گل جان کی سانس لینے کی آواز سنی۔ مسہری کے سرہانے کی طرف ریشمی کپڑا آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ خواجہ نصر الدین کو ایسا لگا جیسے کسی کی آہنی گرفت نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہے، ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان کی سانس پھول گئی۔

''مولانا حسین، تم اس قدر سست کیوں پڑ گئے؟'' امیر نے پوچھا۔

''اعلیٰ حضرت، میں اس کی سانس کی آواز سن رہا ہوں۔ میں اس پردے ے پیچھے سے آپ کی خاتون کے دل کی حرکت معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔اس کا نام کیا ہے؟''

''اس کا نام گل جان ہے'' امیر نے کہا۔

''گل جان!'' خواجہ نصرالدین نے نرمی سے پکارا۔

مسہری کے سرے پر پردے کی حرکت اچانک رک گئی۔گل جان جاگ اٹھی تھی اور بے حس وحرکت لیٹی تھی۔اس کو یہ یقین نہیں تھا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے یا وہ واقعی اپنے محبوب کی آواز سن رہی ہے۔

''گل جان!'' خواجہ نصرالدین نے پکارا۔گل جان کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی لیکن خواجہ نصرالدین نے تیزی سے کہا:

''میرا نام مولانا حسین ہے۔میں نیادانا، نجومی اور حکیم ہوں جو بغداد سے امیر کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔تم سمجھیں نا،گل جان۔میں ہوں نیادانا، نجومی اور حکیم مولانا حسین۔''

امیر کی طرف مڑتے ہوئے خواجہ نصرالدین نے کہا:

''کسی وجہ سے وہ میری آواز سن کر ڈر گئی۔غالباً اعلیٰ حضرت کی غیر موجودگی میں یہ خواجہ سرا اس کے ساتھ سختی سے پیش آیا ہے۔''

امیر نے خواجہ سرا کو گھور کر دیکھا جو اپنی صفائی دینے کے لئے آواز نکالے بغیر کانپ کر زمین تک جھک گیا۔

''گل جان،تمہارے لئے خطرہ ہے'' خواجہ نصرالدین نے کہا''لیکن میں تمہیں بچالوں گا۔تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہئے کیونکہ میرا فن ہر چیز پر قابو حاصل کر سکتا ہے۔''

''میں تمہاری بات سن رہی ہوں،مولانا حسین، بغداد کے حکیم۔میں تم کو جانتی ہوں اور تم پر اعتماد کرتی ہوں اور یہ میں بادشاہ سلامت کے حضور میں کہتی ہوں جن کے قدم میں پردے کی درازوں سے دیکھ رہی ہوں۔''

یہ لحاظ رکھتے ہوئے کہ امیر کی موجودگی میں ان کے لئے باوقار اور عالمانہ رویہ اختیار کرنا لازمی تھا خواجہ نصرالدین نے درشتی سے کہا:

''مجھے اپنا ہاتھ دو تا کہ میں ناخونوں کے رنگ سے تمہاری بیماری کی تشخیص کر سکوں۔''

ریشمی پردہ ہلا اور بیچ سے کھل گیا۔خواجہ نصرالدین نے نرمی سے گل جان کا ہاتھ پکڑ لیا۔وہ اکو دبا کر ہی اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے تھے۔گل جان نے بھی ہلکے سے ان کا ہاتھ دبا کر جواب دیا۔انہوں نے اس کا ہاتھ پلٹا اور بڑی دیر تک غور سے ہتھیلی کو دیکھتے رہے۔''کتنی دبلی ہوگئی ہے''ان کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔امیر ان کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔اس کی سانس خواجہ کے کان میں لگ رہی تھی۔خواجہ نصرالدین نے اس کو گل جان کی چھنگلیا کا ناخون دکھا کر اپنا سر اس طرح ہلایا جیسے کوئی خطرہ ہو۔حالانکہ یہ ناخون بھی دوسرے ناخونوں کی طرح تھا لیکن امیر کو اس میں کوئی خرابی معلوم ہوئی اور اس نے اپنے ہونٹ چبا کر خواجہ نصرالدین کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔

''تمہارے درد کہاں ہوتا؟''خواجہ نصرالدین نے پوچھا۔

''دل میں''گل جان نے آہ بھر کر جواب دیا۔''میرا دل غمگین اور اداس ہے۔''

تمہارے غم کا سبب کیا ہے؟''

''میں اپنے محبوب سے جدا ہوں۔''

خواجہ نصرالدین نے چپکے سے امیر سے کہا:

وہ اعلیٰ حضرت سے جدائی کی وجہ سے بیمار ہے۔''

امیر کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔اس کی سانس اور تیز ہوگئی۔

''میں اپنے محبوب سے جدا ہوں''گل جان نے کہا''اور اب میں محسوس کرتی ہوں کہ میرا محبوب مجھ سے قریب ہے لیکن نہ تو میں اس کو چوم سکتی ہوں اور نہ اس سے بغل گیر ہو سکتی ہوں۔

ارے وہ دن کب آئے گا جب وہ مجھ سے بغل گیر ہوگا اور مجھے اپنی آغوش میں لے گا۔''

''اللہ اکبر''خواجہ نصرالدین نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

''اعلیٰ حضرت نے اس مختصر مدت میں عشق کا کیسا زبردست شعلہ اس کے اندر روشن کر دیا ہے!''

امیر خوشی سے بدمست ہو گیا۔وہ نچلا نہ رہ سکا اور ٹہلنے لگا۔ساتھ ہی منہ پر ہاتھ رکھ کر ہی ہی کر رہا تھا۔

''گل جان!''خواجہ نصرالدین نے کہا۔''اطمینان رکھو،جس سے تم محبت کرتی ہو وہ تمہاری باتیں سن رہا ہے۔''

''ہاں،ہاں،امیر سے اب ضبط نہ ہو سکا اور وہ جھٹ سے بولا:

''وہ تمہاری باتیں سن رہا ہے، گل جان! تمہارا محبوب سن رہا ہے!''

صراحی کے قلقل کی طرح پردے کے پیچھے سے ہنسنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ خواجہ نصر الدین نے اپنی بات جاری رکھی:

''تمہارے لئے خطرہ ہے، گل جان، لیکن ڈرو نہیں۔ میں، مشہور دانا، نجومی اور حکیم مولانا حسین، تم کو بچالوں گا۔''

''یہ تم کو بچالیں گے!'' امیر نے خوشی کے ساتھ دہرایا۔ ''یہ تم کو قطعی بچالیں گے!''

''اعلیٰ حضرت نے جو کچھ کہا تم نے سنا؟'' خواجہ نصر الدین نے بات جاری رکھی۔ ''تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے۔ میں تم کو خطرے سے نجات دلاؤں گا۔ تمہاری مسرتوں کا دن اب قریب ہے۔ فی الحال بادشاہ سلامت تمہارے پاس نہیں آسکتے کیونکہ میں نے ان کو ستاروں کے اس حکم سے آگاہ کر دیا ہے کہ ان کو عورت کی نقاب نہ چھونا چاہئے۔ لیکن ستاروں کا مقام بدل رہا ہے، تم سمجھتی ہو نا گل جان؟ جلد ہی ستارے راس آئیں گے اور تم اپنے محبوب سے ہم آغوش ہوسکو گی۔ جس دن میں تم کو دوا بھجوں گا اس کے ایک دن بعد تمہاری مسرت کا دن آئے گا۔ تم سمجھتی ہو نا، گل جان۔ دوا ملنے پر تم کو تیار ہو جانا چاہئے!''

''تمہارا بہت بہت شکریہ، مولانا حسین!'' گل جان نے خوشی سے ہنستے اور روتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہارا شکریہ، لاجواب اور دانا حکیم! میرا محبوب قریب ہے اور میں محسوس کرتی ہوں کہ ہمارے دل ایک ساتھ مل کر دھڑک رہے ہیں۔''

امیر اور خواجہ نصر الدین باہر نکلے۔ خواجہ سراؤں کا داروغہ دروازے پر آکر ان سے ملا۔

''آقا!'' وہ گھٹنوں کے بل گر کر چلایا۔ ''سچ مچ دنیا نے ایسا ماہر حکیم کبھی نہیں دیکھا ہے۔ تین دن سے وہ بے حس و حرکت پڑی تھی اور اب اچانک اس نے اپنی مسہری چھوڑ دی ہے، وہ گا رہی ہے، ہنس اور ناچ رہی ہے اور جب میں اس کے قریب گیا تو اس نے میرے کان پر ایک مکہ عنایت فرمایا۔''

''یہ ہے میری گل جان'' خواجہ نصر الدین نے سوچا ''وہ ہمیشہ ہاتھ کی تیز تھی۔''

ناشتے پر امیر نے تمام درباریوں پر عنایات کی بارش کر دی۔ خواجہ نصر الدین کو دو تھیلیاں عطا ہوئیں۔ بڑی تھیلی چاندی کے سکوں سے بھری تھی اور چھوٹی میں طلائی سکے تھے۔

''ہم نے کیا جذبات اکسا دئے ہیں!'' اس نے چہکتے ہوئے کہا ''تمہیں ماننا پڑے گا، مولانا حسین

کہ تم نے ایسی لگن کم ہی دیکھی ہوگی۔اس کی آواز کیسی کانپ رہی تھی،کیسی وہ رواور ہنس رہی تھی۔لیکن یہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو تم خواجہ سراؤں کے داروغہ کا منصب سنبھالنے کے بعد دیکھو گے۔''

مودب درباریوں کی صفوں میں کچھ سرگوشی ہوئی۔بختیار کینہ آمیز انداز میں مسکرایا۔اب خواجہ نصرالدین کو پتہ چلا کہ اس کو خواجہ سراؤں کا داروغہ بنانے کی بات کس نے امیر کو سمجھائی ہے۔

''اب وہ صحت یاب ہوگئی ہے''امیر نے کہا''اوراب تمہاری تقرری کو ملتوی رکھنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔اب ہمارے ساتھ چائے پیواوراس کے بعد تم حکیم کے پاس جاسکتے ہو۔ارے سننا''وہ حکیم کی طرف مڑااورحکم دیا''جاؤاپنے نشتر لاؤ۔بختیار فرمان لاؤ۔''

خواجہ نصرالدین کے گلے میں گرم چاا ٹک گئی اور وہ کھانسنے لگے۔بختیار تیار شدہ فرمان لے کر آگے بڑھا۔وہ انتقامانہ مسرت سے سرشار تھا۔امیر کے سامنے قلم حاضر کیا گیا اوراس نے دستخط کر کے فرمان بختیار کو واپس کر دیا۔بختیار نے جلدی سے اس پر مہر لگائی۔یہ سب کام چٹکی بجاتے ہوگیا۔

''لائق اور عقلمند مولانا حسین،ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرط مسرت سے تمہارے ہونٹوں پر مہر لگ گئی ہے''بختیار نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''بہر حال،آداب کا تقاضہ یہ ہے کہ تم امیر کا شکریہ ادا کرو۔''

خواجہ نصرالدین تخت کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئے۔

''آخرکار میری دلی تمنا بر آئی''انہوں نے کہا۔''مجھے اس تاخیر کے لئے بڑا رنج ہے جو امیر کی داشتہ کی دوا تیار کرنے میں لگے گی۔ہمیں علاج کو پختہ کر لینا چاہئے ورنہ بیماری پھر اس کے جسم کو ستا سکتی ہے۔''

''کیا دوا کی تیاری کے لئے اتنے وقت کی ضرورت ہے؟''بختیار نے بے چینی سے سوال کیا۔

''یقیناً وہ آدھ گھنٹے میں تیار کی جاسکتی ہے....''

''بالکل ٹھیک''امیر نے تصدیق کی۔''آدھ گھنٹے کا وقت کافی ہے۔''

''آقا!اس کا انحصار تو سعد الذبیح کے ستاروں پر ہے''خواجہ نصرالدین نے ترکش کا آخری تیر استعمال کرتے ہوئے جواب دیا۔''ان کے محل کے مطابق مجھے دو سے پانچ دن تک لگ سکتے ہیں۔''

''پانچ دن!''بختیار زور سے کہا۔''فاضل بزرگ،میں تو کبھی کسی دوا کی تیاری میں پانچ دن لگتے نہیں سنے۔''

خواجہ نصر الدین امیر سے مخاطب ہو گئے:

''شاید اعلیٰ حضرت عنایت کر کے اپنی نئی داشتہ کا علاج آئندہ کے لئے میرے نہیں بلکہ وزیر اعظم بختیار کے سپرد کریں گے۔ اب وہی اس کا علاج کریں۔ میں اس کی زندگی کی ذمے داری نہیں لیتا۔''

''کیا ہوا مولانا؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' امیر نے گھبرا کر کہا۔ ''بختیار دوا علاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور وہ کچھ ایسا ہوشیار بھی نہیں ہے جیسا کہ میں نے تم سے اسی وقت کہا تھا جب تم کو وزیر اعظم کا عہدہ کرنے کی تجویز کی تھی۔''

وزیر اعظم کے جسم میں ہلکی سی جھرجھری دوڑ گئی۔ اور انہوں نے زہر آلود نگاہوں کو دیکھا۔

''جاؤ دوا تیار کرو'' امیر نے کہا ''لیکن پانچ دن بہت ہوئے مولانا، کیا اس سے جلدی نہیں تیار کر سکتے؟ ہم چاہتے ہیں کہ تم جلد از جلد اپنا منصب سنبھال لو۔''

''شہنشاہ معظم، میں خود بھی مشتاق ہوں!'' خواجہ نصر الدین نے کہا۔ ''میں جلد از جلد دوا تیار کرنے کی کوشش کروں گا۔''

وہ پچھلے پیروں ہٹتے ہوئے رخصت ہوئے اور متعدد بار جھک کر تعظیم بجا لائے۔ بختیار نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا اور اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دشمن اور حریف کو اتنا صاف جاتے ہوئے دیکھ کر کیسا سلگ رہا ہے۔

''سانپ! مکار لکڑ بگھے!'' خواجہ نصر الدین نے سوچا اور غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''لیکن بختیار تم چوک گئے۔ اب تم میرا بال بھی بیگا نہ کر سکو گے کیونکہ میں نے امیر کے حرم کے تمام راستے، آنے اور جانے کے معلوم کر لئے ہیں جو میں جاننا چاہتا تھا۔ ارے پیاری گل جان! تم کتنی ہوشیار ہو کہ عین موقع پر بیمار پڑیں اور خواجہ نصر الدین کو درباری جراح کے چاقو سے بچا لیا! حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ تم صرف اپنے ہی بارے میں سوچ رہی تھیں!''

وہ اپنے برج کو واپس گئے جس کے سائے میں پہرے دار بیٹھے مزے میں چوسر کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک جو سب کچھ ہار چکا تھا اپنے جوتے داؤں پر لگانے کے لئے اتار رہا تھا۔ سخت گرمی تھی لیکن برج کے اندر اس کے موٹی دیواروں کی وجہ سے کافی خنکی اور تازگی تھی۔ خواجہ نصر الدین تنگ زینے سے اوپر گئے۔ وہ اپنے کمرے سے گذرتے ہوئے اوپر والے کمرے میں بغداد کے دانا کو دیکھنے گئے۔

بڈھے کی صورت بہت وحشیانہ ہوگئی تھی کیونکہ قید کے دوران اس کی داڑھی اور بال بڑھ گئے تھے اور پریشان ہو گئے تھے۔ گھنی بھوؤں کے نیچے سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے خواجہ نصرالدین پر لعنت ملامت کی بوچھار کردی:

''ارے کمبخت حرامزادے، خدا کرے تیرے سر پر بجلی گرے اور تلوے سے نکلے! ارے بدمعاش، دھوکے باز، بعلئے! تو نے میرا نام، میرا لباس، میرا عمامہ اور پٹکا سب چرالیا! خدا کرے تجھے کیڑے مکوڑے زندہ ہڑپ کر جائیں!''

خواجہ نصرالدین کو اس طرح کی باتوں کی عادت ہوگئی تھی اس لئے وہ ناراض نہیں ہوئے:

''محترم مولانا حسین، میں نے آج آپ کے لئے ایک نئی اذیت ایجاد فرمائی ہے۔ یعنی ایک رسی کے پھندے اور ڈنڈے کی مدد سے آپ کا سر دبایا جائے۔ پہرے دار نیچے ہیں۔ آپ اس طرح چلائیں کہ وہ سن لیں۔''

سلاخ دار کھڑکی کے پاس جا کر بڈھے نے یکساں آواز میں چلانا شروع کیا:

''ارے اللہ! اب تو یہ مصیبتیں نہیں ہوتیں! ارے میرا سر پھندے اور ڈنڈے سے نہ دباؤ! اس اذیت سے تو موت ہی اچھی ہے!''

''ٹھہرو، ایک منٹ ٹھہرو مولانا حسین!'' خواجہ نصرالدین بیچ میں بولے۔ ''تم بڑے اطمینان سے اس طرح چلا رہے ہو جس کا کسی کو یقین نہ آئے گا۔ یاد رکھو، پہرے دار ان باتوں میں بڑے مشاق ہیں۔ اگر ان کو یہ خیال ہوگیا کہ تم بن رہے ہو تو وہ تمہاری رپورٹ ارسلان بیگ سے کر دیں گے اور تب تم واقعی جلاد کے ہاتھ میں جا پڑو گے۔ یہ تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے کہ تم زیادہ زور سے چلاؤ۔ دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

وہ کھڑکی کے پاس گئے، ایک گہری سانس لی اور اچانک اتنی زور سے چیخے کہ بڈھا کانوں میں انگلیاں دیکر پیچھے ہٹ گیا۔

''ارے حرامزادے کے بچے!'' بڈھا چلایا۔ ''میں ایسا گلا کہاں سے لاؤں کہ میری چیخیں شہر کے دوسرے سرے تک سنائی دیں۔''

''جلاد کے ہاتھوں سے بچنے کا تمہارے لئے یہی واحد راستہ ہے'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔

بڈھے نے پھر کوشش کی۔اپنی پوری طاقت لگادی۔وہ اس بری طرح چیخا دھاڑا کہ پہرے داروں نے اس کا لطف لینے کے لئے اپنا کھیل روک دیا۔

بڈھا بری طرح کھانس کھنکھار رہا تھا۔

''ارے، ارے، میرا گلا'' بڈھا فریاد کرنے لگا ''کتنی محنت پڑی ہے۔اب تو خوش ہوا۔کمبخت بدمعاش؟ خدا تجھے جہنم واصل کرے۔''

''بالکل ٹھیک ہے'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔''اور دانائے روزگار مولانا حسین یہ رہا آپ کی کوششوں کا انعام۔''

انہوں نے وہ تھیلیاں نکالیں جو امیر نے ان کو عطا کی تھیں اور ان کو ایک کشتی میں الٹ کر ساری رقم دو حصوں میں تقسیم کی۔

بڈھا صلواتیں سناتا اور بڑبڑاتا رہا۔

''تم مجھے اس طرح برا بھلا کیوں کہہ رہے ہو؟'' خواجہ نصرالدین نے بڑے سکون سے پوچھا۔''کیا میں نے مولانا حسین کا نام کسی طرح نیچا کیا ہے؟ کیا میں نے ان کے علم وفضل کو ذلیل کیا ہے؟ یہ رقم دیکھ رہے ہو نا؟ یہ رقم امیر نے مشہور نجومی اور حکیم مولانا حسین کو اپنے حرم ایک لڑکی کو شفایاب کرنے کے لئے دی ہے۔''

''تم نے کسی لڑکی کو اچھا کیا ہے؟'' بڈھے نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔''تمہیں بیماریوں کا کیا پتہ، جاہل، بدمعاش، مکار!''

''تم نے کسی لڑکی کو اچھا کیا ہے؟'' بڈھے نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔''تمہیں بیماریوں کا کیا پتہ، جاہل، بدمعاش، مکار!''

''میں بیماریوں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا لیکن لڑکیوں کے بارے میں کچھ ضرور جانتا ہوں'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔''اس لئے یہ بات معقول ہوگی کہ امیر کا انعام دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ایک حصہ تمہارے علم کے لئے اور دوسرا حصہ میرے فن کے لئے۔میں آپ بتانا چاہتا ہوں، مولانا، کہ میں نے لڑکی کا علاج سرسری طور پر نہیں کیا بلکہ ستاروں کی گردش کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ہے۔کل رات میں نے دیکھا کہ سعد السعود اور سعد الاخبیہ کے ستاروں کا قران ہو رہا ہے اور جھرمٹ

عقرب نے جھرمٹ سرطان کی طرف رخ کرلیا ہے۔''

''کیا، کیا؟'' بڈھے نے زور سے کہا اور غصے میں کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔''جاہل کہیں کا، تو تو صرف گدھے ہانک سکتا ہے! تجھے یہ تک تو پتہ ہے نہیں کہ سعدالسعود کے ستاروں کا قرآن سعد الاحبیہ کے ستاروں کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو ایک ہی نظام فلکی کے ستارے ہیں! اور تمہیں سال کے اس وقت جھرمٹ عقرب دکھائی کہاں سے دیتا ہے؟ میں نے ساری رات ستارہ شماری کی ہے۔ سعد بولا اور السمک کے ستارے قرآن میں تھے اور الجبہہ کا زوال ہورہا تھا۔ سن رہا ہے نا، گدھے؟ عقرب اب آسمان میں نہیں ہے! تو نے سب کچھ گڈمڈ کردیا۔ گدھے ہکانے والا خواہ مخواہ کو ایسی باتوں میں کود پڑا جو اس کی سمجھ سے بالاتر ہیں! تو غلطی سے الحق کے ستاروں کو جو آج کل البوطین کے ستاروں کے مقابل ہیں قرب سمجھ بیٹھا!''

غصے میں آکر، اس نیت سے کہ خواجہ نصرالدین کی جہالت کا بھانڈا پھوڑا جائے بڈھا بری دیر تک ستاروں کے صحیح مقام کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس کا سننے والا ہر ہر لفظ کو بری توجہ سے سن کر ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہا تھا تاکہ وہ دوسرے داناؤں کی موجودگی میں امیر سے باتیں کرنے میں غلطی نہ کرے۔

''ارے جاہلوں کے سردار!'' بڈھا برستا رہا''تجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس وقت چاند کے انیسویں برج پر جس کو الشعلہ کہتے ہیں اور جو قوس رامی پر ہوتا ہے، صرف اسی برج کے ستاروں سے انسان کی قسمت کا پتہ لگایا جاسکتا ہے کسی دوسرے سے نہیں۔ اس واقعہ کو دانائے روزگار شہاب الدین محمود ابن کراجی نے بڑی وضاحت سے اپنی کتاب میں لکھا ہے....''

''شہاب الدین محمود ابن کراجی'' خواجہ نصرالدین نے اچھی طرح یاد کرلیا۔''کل میں امیر کی موجودگی میں اس لمبی داڑھی والے دانا کا بھانڈا پھوڑونگا کہ وہ اس کتاب کے بارے میں لاعلم ہے اور میرے علم وفضل کی عظمت سے اس کا دل دہل جائے گا اور میں محفوظ ہوں گا۔''

30

جعفر سودخور کے گھر میں سونے سے بھری ہوئی مہر بند بارہ دیگیں رکھی تھیں لیکن وہ اب کم از کم بیس

جمع کرنے کی سوچ رہا تھا۔قسمت نے اس کو ایسی شکل وصورت دے کر جس سے اس کی حرص اور بے ایمانی ظاہر ہوتی تھی اس کے عیبوں کو اور عیاں کر دیا تھا۔ یہ عیب اعتبار کرنے والے ناتجربے کار احمقوں کو آگاہ کر دیتے اور نیا شکار پھانسنا مشکل ہوتا۔اس لئے اس کی دیگیں اس کی خواہش سے کہیں زیادہ سست رفتار سے بھر رہی تھیں۔

''کاش کہ میرے جسمانی عیب دور ہو سکتے!'' وہ آہ بھر کر کہتا ''لوگ میری صورت دیکھ کر تو نہ بھاگتے، مجھ پر شبہ نہیں اعتبار کرتے۔اس وقت ان کو دھوکہ دینا کتنا آسان ہوتا اور میری آمدنی کتنی تیزی سے بڑھتی۔''

جب شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ امیر کے نئے دانا مولانا حسین نے بیماریوں کے علاج میں مہارت تامہ دکھائی ہے تو جعفر سودخور نے ایک ٹوکری میں بیش بہا تحائف بھرے اور محل میں حاضر ہوا۔

ارسلان بیگ ٹوکری کا سامان دیکھنے کے بعد بڑی خوشی سے اس کی مدد کے لئے تیار ہو گیا:

''محترم جعفر، آپ بڑے وقت سے آئے ہیں۔آج جہاں پناہ بہت محظوظ ہیں اور وہ شاید ہی آپ کی درخواست کو رد کریں۔''

امیر نے سودخور کی بات سنی، ہاتھی دانت کے فریم کی شطرنج کی طلائی بساط نذرانے میں قبول فرمائی اور دانا کی طلبی کا حکم دیا۔

''مولانا حسین'' امیر نے کہا جب خواجہ نصرالدین آ کر اس کے سامنے جھکے ''یہ آدمی، جعفر سودخور، ہمارا وفادار خادم ہے۔اس نے ہماری بڑی خدمت کی ہے۔ہم حکم دیتے ہیں کہ تم فوراً اسکا لنگڑا پن، کوبڑ، آنکھ کا جالا اور دوسرے عیب دور کرو۔''

یہ کہہ کر امیر اس طرح مڑ گیا جیسے وہ کوئی عذر سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔خواجہ نصرالدین کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ تعظیم بجالائیں اور چلے جائیں۔ان کے پیچھے سودخور بھی اپنا کوبڑ گھسیٹتا ہوا کچھوے کی طرح چلا۔

''ہمیں جلدی کرنی چاہئے، عقلمند مولانا حسین'' اس نے نقلی داڑھی میں خواجہ نصرالدین کو نہ پہچانتے ہوئے کہا۔''ہمیں جلدی کرنی چاہئے کیونکہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا ہے اور میں رات ہونے سے پہلے شفایاب ہو سکتا ہوں....آپ نے تو سنا، امیر نے حکم دیا ہے آپ مجھے فوراً اچھا کریں۔''

خواجہ نصرالدین دل ہی دل میں سودخور، امیر اور اپنے کو کوس رہے تھے کہ انہوں نے اپنے علم وفضل کو مشتہر کرنے میں اتنا جوش وخروش کیوں دکھایا۔ سودخور تیز رفتاری سے چلنے کے لئے ان کی آستین برابر کھینچ رہا تھا۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ خواجہ نصرالدین کے پیر گرم دھول میں دھنس رہے تھے۔ راہ چلتے انہوں نے سوچا ''اس بلا سے کس طرح نجات ملے گی؟'' وہ اچانک رک گئے ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اپنی قسم پوری کرنے کا وقت آ گیا ہے۔'' تیزی سے انہوں نے ایک منصوبہ تیار کیا اور ہر ہر موقع کو اچھی طرح تولیا۔ ''ہاں'' انہوں نے سوچا ''اب وقت آ گیا ہے۔ سودخور، غریبوں پر ظلم کرنے والے سنگ دل، آج ہی تجھ کو ڈبونا ہے۔'' وہ مڑ گئے تا کہ سودخور ان کی سیاہ آنکھوں کی چمک نہ دیکھ سکے۔

وہ ایک گلی میں مڑ گئے جہاں ہوا سے گرد کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ سودخور نے اپنے گھر کا پھاٹک کھولا۔ صحن کے دوسری طرف جہاں ایک نیچی بار کے ذریعہ زنان خانہ الگ کیا گیا تھا خواجہ نصرالدین نے سبز بیلوں کے پردے کے پیچھے سے چلنے پھرنے، چپکے چپکے کھسر پھسر اور ہنسی کی آوازیں سنیں۔ سودخور کی بیویاں اور داشتائیں اکسی اجنبی کے آنے سے بہت خوش تھیں کیونکہ اس قید کی حالت میں ان کے لئے اور کوئی دلچسپی کا سامان نہ تھا۔ سودخور نے ذرا رک کر اس طرف درشتی سے دیکھا۔ بالکل سناٹا ہو گیا۔

''حسین قیدیو، آج میں تمہیں نجات دلا دوں گا'' خواجہ نصرالدین نے سوچا۔

جس کمرے میں سودخور ان کو لے گیا اس میں کھڑکیاں نہ تھیں اور دروازے کو کئی زنجیروں اور تین قفلوں سے محفوظ کیا گیا تھا جن کے کھولنے کا گر صرف مالک مکان جانتا تھا۔ دروازہ کھولنے میں اس کو کافی دیر لگی۔ یہاں اس کی سونے کی دیگیں رکھی تھیں اور تہہ خانے کے دھانے پر لکڑی کے تختے پڑے تھے جن پر وہ سوتا تھا۔

''کپڑے اتارو!'' خواجہ نصرالدین نے حکم دیا۔

سودخور نے اپنے کپڑے اتار دئے اور عریانی کی حالت میں وہ اور کریہہ المنظر ہو گیا۔ خواجہ نصرالدین نے دروازہ بند کر کے دعائیں پڑھنا شروع کیں۔

اس دوران میں جعفر کے بہت سے رشتے دار صحن میں جمع ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے اس کے قرضدار تھے اور ان کو امید تھی کہ وہ ان کے قرض معاف کر کے یہ خوشی کی تقریب منائے گا۔ لیکن ان کی امیدیں بے بنیاد تھیں۔ بند کمرے میں مقروض لوگوں کی آواز سن کر اس کا دل کینہ بھری خوشی سے باغ باغ

ہو گیا۔ ''آج تو میں ان سے کہہ دوں گا کہ میں نے ان کا قرض معاف کیا'' اس نے سوچا ''لیکن میں ان کے تمسک واپس نہیں دوں گا۔ وہ یقین کر کے بے فکر ہو جائیں گے۔ میں کچھ نہیں کہوں گا اور ان کے قرض کا کھاتہ بنالوں گا۔ اور جب ان پر اصل کا سود دس گنا ہو جائے گا اور پوری رقم ان کے مکانات، باغات اور انگور کے باغیچوں کی مالیت سے زیادہ ہو جائے گی تو میں قاضی کے پاس جاؤں گا اور اپنے وعدہ سے انکار کر کے رسیدیں پیش کروں گا۔ ان کا مال متاع بکوا کر ان کو بھک منگا بنا دوں گا اور سونے سے ایک دیگ بھر لوں گا!''

''اٹھو! کپڑے پہنو!'' خواجہ نصر الدین نے کہا ''ہم احمد پیر کے تالاب پر جائیں گے اور وہاں تم پاک پانی میں نہاؤ گے۔ شفا کے لئے یہ لازمی ہے۔''

''احمد پیر کا تالاب!'' سود خور گھبرا کر بولا۔ ''ایک بار تو میں اس میں ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ دانائے روزگار مولانا حسین سمجھ لیجئے کہ میں تیرنا نہیں جانتا۔''

''تالاب کی طرف جاتے ہوئے تمہیں متواتر دعائیں پڑھتے رہنا چاہئے'' خواجہ نصر الدین نے کہا۔ ''تمہیں دنیاوی باتوں کے بارے میں نہ سوچنا چاہئے۔ تمہیں اشرفیوں سے بھری ایک تھیلی ساتھ لے چلنا ہوگا اور راستے میں جس سے بھی ملو گے اسے اک اشرفی دینی وہ گی۔''

سود خور کے منہ سے آہ نکل گئی لیکن اس نے ہدایت پر حرف بحرف عمل کیا۔ ان کی ملاقات ہر طرح کے لوگوں سے ہوئی۔ کاریگروں اور بھک منگوں سے اور سود خور نے ہر ایک کو ایک ایک اشرفی دی حالانکہ اس سے اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے رشتے دار بھی پیچھے پیچھے تھے۔ خواجہ نصر الدین نے خاص مقصد سے ان کو مدعو کر لیا تھا تا کہ آئندہ ان پر یہ الزام نہ لگایا جا سکے کہ انہوں نے جان بوجھ کر سود خور کو ڈبو دیا۔

سورج چھتوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا، درختوں کا سایہ تالاب پر پھیل گیا تھا، ہوا میں مچھر گا رہے تھے۔ جعفر نے کپڑے اتارے اور پانی کے قریب گیا۔

''یہاں بہت گہرا ہے'' اس نے فریاد کی ''میں نے جو کچھ کہا تھا اس کو آپ بھولے تو نہیں ہیں، مولانا۔ میں پیر نہیں سکتا۔''

رشتے دار خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ سود خور شرم سے اپنے کو ہاتھوں سے چھپائے، خوف سے سکڑا سکڑایا کسی اتھلی جگہ کے لئے تالاب کا چکر لگانے لگا۔

اکڑوں بیٹھ کر اس نے تالاب میں لٹکتی ہوئی جھاڑیوں کا سہارا لیا اور پانی میں ڈرتے ڈرتے ایک پیر ڈالا۔

''ٹھنڈا ہے پانی'' وہ بڑبڑایا۔اس کی آنکھیں پریشانی میں نکل پڑی تھیں۔

''تم وقت ضایع کر رہے ہو'' خواجہ نصرالدین نے اس کی طرف سے نگاہ ہٹاتے ہوئے کہا کیونکہ وہ اس رحم کے خلاف جس کا سودخور سزاوار نہ تھا اپنے دل کو فولادی بنا رہے تھے۔پھر انہوں نے ان مصیبتوں کا خیال کیا جو جعفر کے برباد کئے ہوئے غریب لوگ جھیلتے ہیں، بیمار بچے کے خشک لب، بڈھے نیاز کے آنسو۔اور ان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔اب وہ کھلم کھلا جرات کے ساتھ سودخور کی نگاہوں سے نگاہیں ملا سکتے تھے۔

''تم وقت ضایع کر رہے ہو'' انہوں نے بات دہرائی ''اگر شفا چاہتے ہو تو تالاب کے اندر اترو۔''

سودخور نے پانی کے اندر جانا شروع کیا۔وہ اتنا آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ جب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پہنچا تو اس کی توند کنارے ہی سے لگی تھی۔آخر کار جب وہ کھڑا ہوا تو کمر تک تھا۔گھاس پھوس ادھر ادھر حرکت کر رہے تھے اور ان کا سرد مس اس کے جسم میں گدگدی پیدا کر رہا تھا۔اس کے شانے سردی سے کانپ رہے تھے۔وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔اس کی آنکھیں کسی بے زبان جانور کی طرح التجا کر رہی تھیں لیکن خواجہ نصرالدین نے کچھ نہیں کہا۔اس وقت سودخور کو چھوڑ دینے کا مطلب ہزاروں غریبوں کو مصیبت میں مبتلا رکھنا تھا۔

پانی سودخور کے کوبڑ تک پہنچ گیا لیکن خواجہ نصرالدین اس سے برابر آگے بڑھنے کو کہتے رہے۔

''آگے بڑھو، آگے، پانی کانوں تک آجانے دو۔نہیں تو میں تمہارے علاج کا ذمے دار نہیں۔چلو، ہمت باندھو، محترم جعفر! دل مضبوط کرو! ایک اور قدم! ذرا سے اور آگے!''

''غ غ غ'' سودخور نے پانی کے اندر جاتے ہوئے غرغر کی آواز میں کہا۔

''غ غ غ'' جب وہ اوپر آیا تو یہی آواز پھر نکلی۔

''ڈوب رہا ہے!'' اس کے رشتے دار چلائے۔

ایک عام ہنگامہ ہو گیا۔ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرف شاخیں اور چھڑیاں بڑھا دی گئیں۔کچھ لوگ محض رحم دلی کی بنا پر اس کی مدد کرنا چاہتے تھے اور دوسرے محض بناوٹ کر رہے تھے۔خواجہ نصرالدین

آسانی سے بتا سکتے تھے کہ جعفر کا کون اور کتنا قرضدار ہے۔ وہ خود ہر ایک سے زیادہ گھبرا کر ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

''ارے یہاں! اپنا ہاتھ ہمیں دو، محترم جعفر! ارے سنو! اپنا ہاتھ ہمیں دو!''

ان کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ سودخور اپنا ہاتھ کبھی نہ دے گا کیونکہ ''دینے'' کا لفظ ہی اسے مفلوج کرنے کے لئے کافی تھا۔

''اپنا ہاتھ ہمیں دو!'' سب رشتے دار ایک ساتھ چلائے۔

اب سودخور غوطے کھا کھا کر اور دیر میں اوپر آنے لگا اور وہ اس مقدس پانی میں ڈوب مرتا اگر ایک سقہ اپنی پیٹھ پر خالی مشک لئے ننگے پیر ادھر سے دوڑتا نہ گذرتا۔

''ارے!'' اس نے ڈوبتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر کہا ''کہیں یہ جعفر سودخور تو نہیں ہے!''

اور وہ کپڑے اتارے بغیر بلا جھجک پانی میں کود گیا اور اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے زور سے کہا:

''لو یہ رہا میرا ہاتھ، اس کو پکڑ لو!''

''سودخور نے ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو پانی سے باہر صحیح سلامت کھینچ لایا گیا۔

سودخور کنارے پڑا دم لے رہا تھا اور اس کو نجات دلانے والا بڑی تیزی سے اس کے رشتے داروں کو بتا رہا تھا:

''تم غلط طریقے سے ان کی مدد کر رہے تھے۔ تم 'لو' کے بجائے 'دو'، کہہ رہے تھے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ معزز جعفر ایک بار اور اسی تالاب میں ڈوب رہے تھے۔ اور ایک اجنبی نے جو بھورے گدھے پر ادھر سے گذر رہا تھا انہیں بچایا تھا؟ اس اجنبی نے جعفر کو بچانے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا تھا اور مجھے یہ یاد رہ گیا۔ آج یہ کام آیا۔''

خواجہ نصر الدین یہ سن سن کر اپنے ہونٹ کاٹ رہے تھے۔ اس طرح گویا انہوں نے دو بار سودخور کی جان بچائی! ایک مرتبہ خود اپنے ہاتھوں اور دوسری بار سقے کے ذریعہ۔ ''خیر کوئی بات نہیں'' انہوں نے سوچا ''چاہے مجھے پورے سال بخارا میں رہنا پڑے لیکن میں اس کو ڈبو کر دم لوں گا۔''

اس دوران میں سودخور کی سانس ٹھکانے لگی اور اس نے شکایت آمیز لہجے میں منمنانا شروع کیا:

''ارے مولانا حسین! آپ نے تو میرا علاج کرنے کے لئے کہا تھا لیکن مجھ کو قریب قریب ڈبو ہی

دیا تھا! خدا کی قسم، اب میں کبھی اس تالاب کے قریب نہیں پھٹکوں گا! آپ کیسے دانا ہیں اگر آپ کو ایک سقہ یہ بتا تا ہے کہ کیسے آدمی کو ڈوبنے سے بچایا جا سکتا ہے؟ میری قبا اور عمامہ دو۔ آیئے، مولانا، اندھیرا ہو رہا ہے اور جو کچھ ہم نے شروع کیا ہے اسے ختم کرنا ہے۔ اور تم، میاں سقے'' سودخور نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ''مت بھولنا کہ تمہارا قرض ایک ہفتے میں واجب الادا ہو جائے گا۔ لیکن میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں اور اس لئے میں تمہیں آدھا... میرا مطلب ہے چوتھائی... نہیں تمہارے قرض کا دسواں حصہ معاف کر دوں گا۔ یہ کافی ہے کیونکہ میں تمہاری مدد کے بغیر آسانی سے اپنے کو بچا سکتا تھا۔''

''ارے محترم جعفر'' سقے نے جھجکتے ہوئے کہا ''آپ اپنے کو میری مدد کے بغیر نہیں بچا سکتے تھے۔ کیا آپ میرا چوتھائی قرض نہ معاف کر دیں گے؟''

''اچھا! تو تم نے مجھ کو اپنی غرض کی بنا پر بچایا!'' سودخور نے کہا۔ ''تم نے نیک مسلمان کی حیثیت سے یہ نہیں کیا بلکہ لالچ کی وجہ سے! ارے سقے، تجھے اس کی سزا ملنی چاہئے۔ میں تیرا ذرا سا قرض بھی نہیں معاف کروں گا!''

مغموم سقہ وہاں سے ہٹ گیا اور خواجہ نصرالدین اس کو رحم کی نظروں سے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے جعفر کی طرف نفرت وحقارت سے دیکھا۔

''آیئے، مولانا حسین'' جعفر نے جلدی کرتے ہوئے کہا ''آپ اس لالچی سقے سے کیا سرگوشی رک رہے ہیں؟''

''ٹھہرو'' خواجہ نصرالدین نے کہا۔ ''تم بھول گئے کہ تمہیں ہر ملنے والے کو ایک اشرفی دینی چاہئے۔ تم نے اس سقے کو اشرفی کیوں نہیں دی؟''

''ہائے مصیبت! میں تباہ ہو جاؤں گا!'' سودخور نے فریاد کی۔ ''سوچئے تو کہ میں ایسے برے اور لالچی آدمی کو اشرفی دینے پر مجبور ہوں گا!'' اس نے اپنی تھیلی کھول کر ایک اشرفی پھینک دی۔ ''بس یہ آخری ہے۔ اب اندھیرا ہو گیا ہے اور واپسی میں راستے پر ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔''

لیکن خواجہ نصرالدین نے سقے سے بلاوجہ کا ناپھوسی نہیں کی تھی۔

وہ واپسی روانہ ہو گئے۔ آگے سودخور تھا، اس کے پیچھے خواجہ نصرالدین اور پھر سودخور کے رشتے دار۔ ابھی وہ مشکل سے پچاس قدم گئے ہوں گے کہ ایک گلی سے سقہ نکلا۔ یہ وہی تھا جس کو یہ لوگ تالاب کے

کنارے چھوڑ آئے تھے۔

سود خور نے ادھر سے منہ موڑ لیا جیسے اس کو دیکھنا ہی نہ چاہتا ہو لیکن خواجہ نصر الدین نے اس کو پھٹکارا:

''جعفر یاد رکھو، ہر ایک کو جس سے بھی تم ملو!''

اندھیرے میں ایک انتہائی اذیت بھری کراہ گونجی۔ جعفر اپنی تھیلی کھول رہا تھا۔

سقے نے اشرفی لی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ کوئی پچاس قدم بعد پھر وہ ان کے سامنے آن موجود ہوا۔ سود خور زرد پڑ گیا اور کانپنے لگا۔

''مولانا'' اس نے فریاد کرتے ہوئے کہا ''یہ تو وہی ہے....''

''ہر ایک کو جس سے تم ملو'' خواجہ نصر الدین نے دھرا دیا۔

پھر خاموش فضا میں ایک کراہ گونجی۔ جعفر اپنی تھیلی کھول رہا تھا۔

یہ واقعہ سارے راستے پیش آیا۔ سقہ ہر پچاس قدم پر سامنے آ جاتا۔ وہ خوب ہانپ رہا تھا اور اس کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن وہ اشرفی لیتا اور تیز بھاگتا اور پھر آگے سڑک پر کسی جھاڑی سے برآمد ہوتا۔

اپنا پیسہ بچانے کے لئے سود خور تیز تیز چلنے لگا اور آخر میں دوڑنا شروع کر دیا لیکن وہ تو لنگڑا تھا۔ وہ سقے سے کیسے جیت سکتا تھا جو جوش میں ہوا ہوا جا رہا تھا۔ وہ جھاڑیوں اور باڑوں کو پار کرتا بھاگ رہا تھا۔ اس نے سود خور سے کم از کم پندرہ بار بھینٹ کی اور آخری بار بالکل اس کے گھر کے قریب۔ وہ ایک چھت پر سے کودا اور دروازے پر راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ آخری اشرفی پانے کے بعد وہ تھک کر زمین پر گر پڑا۔

سود خور جلدی سے اپنے صحن میں گھس گیا۔ خواجہ نصر الدین اس کے پیچھے تھے۔ اس نے اپنی خالی تھیلی خواجہ نصر الدین کے قدموں پر ڈال دی اور غصے سے چلایا:

''مولانا، میرا علاج بہت قیمتی ہے! میں ابھی تک تحفوں، خیرات اور اس کمبخت سقے پر تین ہزار تانگے خرچ کر چکا ہوں!''

''ذرا دم لو'' خواجہ نصر الدین نے جواب دیا ''بس، آدھ گھنٹے کے اندر تم کو اس کا انعام مل جائے گا۔ ایک بڑا سا الاؤ صحن کے بیچوں بیچ تیار کرنے کا حکم دو۔''

نوکر ایندھن لا لا کر الاؤ تیار کر رہے تھے اور خواجہ نصر الدین اس بات میں دماغ لڑا رہے تھے کہ کس طرح سود خور کو چرکا دیا جائے اور اس کے شفا نہ پانے کا سارا الزام اسی کے سر تھوپ دیا جائے۔ انہوں نے کئی منصوبے سوچے لیکن ان کو نامناسب پا کر رد کر دیا۔ اس درمیان میں الاؤ تیار ہو گیا تھا، ہلکی ہوا میں شعلے بھڑک رہے تھے اور انگوروں کا باغیچہ سرخ شعلوں سے روشن ہو گیا تھا۔

''جعفر، کپڑے اتار کر تین بار الاؤ کے گرد پھرو'' خواجہ نصر الدین نے کہا۔ وہ ابھی تک کوئی منصوبہ نہیں بنا سکے تھے اور تھوڑا سا وقت پانے کے لئے یہ کر رہے تھے۔ وہ خیالات میں ڈوبے نظر آتے تھے۔

رشتے دار خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ سود خور الاؤ کے گرد اس طرح گھوم رہا تھا جیسے کوئی زنجیر سے بندھا ہوا بندر ہو۔ وہ اپنے ہاتھ ہلا رہا تھا جو گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔

خواجہ نصر الدین کا چہرہ دمک اٹھا۔ انہوں نے اطمینان کی سانس لے کر انگڑائی لی:

''مجھے ایک کمبل تو دینا'' انہوں نے گونجتی ہوئی آواز میں حکم دیا۔ ''جعفر اور تمام دوسرے لوگ ادھر آؤ۔''

انہوں نے تمام رشتے داروں کا ایک حلقہ بنا دیا اور جعفر کو بیچ میں زمین پر بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے کہا:

''میں جعفر کو اس کمبل سے ڈھک کر ایک دعا پڑھوں گا۔ تم سب کو مع جعفر کے آنکھیں بند کر کے دعا کو دھرانا چاہئے۔ اس کے بعد جب میں کمبل اٹھاؤں گا تو جعفر شفایاب ہو گا۔ لیکن میں تم سب کو ایک انتہائی اہم شرط سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک وہ پوری نہ ہو گی جعفر شفایاب نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ میں کہتا ہوں کان دھر کر سنو اور یاد رکھو۔''

رشتے دار خاموشی سے سننے اور یاد رکھنے کی تیاری کرنے لگے۔

''جب تم میرے ساتھ دعا کو دھراتے ہو گے'' خواجہ نصر الدین نے زور سے صاف صاف کہا ''تم میں سے کسی کو بھی، اور سب سے زیادہ جعفر کو، بندر کا ہرگز ہرگز خیال نہ آنا چاہئے! اگر تم میں سے کوئی بھی اس کے بارے میں سوچے گا یا اس سے بھی برا یہ ہو گا کہ اس کو اپنے تصور میں دیکھے گا۔ اس کی دم، اس کے لال چوتڑ، کریہہ چہرا اور زرد دانت۔ تو پھر شفا نہ ہو گی اور نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ کسی مقدس کام کا انجام بندر ایسے گندے جانور کے خیال کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ سمجھے نا تم لوگ؟''

''ہم لوگ سمجھ گئے'' رشتے داروں نے کہا۔

''جعفر، تیار ہو جاؤ اور اپنی آنکھیں بند کر لو'' خواجہ نصر الدین نے سود خور پر کمبل ڈالتے ہوئے بڑی شان سے کہا۔ ''اور اب تم اپنی آنکھیں بند کرو!'' اس نے رشتے داروں سے کہا ''اور اس شرط کو یاد رکھنا، بندر کا خیال نہ آئے۔''

پھر انہوں نے دعا پڑھنا شروع کی:

''خداوند تعالی اس مقدس دعا کے اثر سے اپنے ناچیز خادم جعفر کو شفا بخش...''

''خداند تعالی اس مقدس دعا کے اثر سے...'' مختلف آوازوں میں رشتے داروں کا کورس بلند ہوا... اس موقع پر خواجہ نصر الدین نے دیکھا کہ ایک شخص کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے، دوسرے رشتے دار نے کھانسنا شروع کیا، تیسرا الفاظ کو دھرانے میں ھکلانے لگا اور چوتھے نے اس طرح سر ھلایا جیسے وہ کوئی صورت سامنے سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک لمحہ بعد جعفر خود بے چینی سے کلبلانے لگا۔ ایک بہت ہی کریہہ المنظر اور انتہائی بدصورت بندر جس کی دم لمبی اور دانت زرد تھے اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہو کر اس کو چڑا رہا تھا۔ کبھی وہ اس کو زبان نکال کر دکھاتا اور کبھی لال لال چوتڑ اور دوسرے اندام جو مومن کے تصور کے لئے بھی زیبا نہیں ہیں۔

خواجہ نصر الدین اونچی آواز میں دعا پڑھتے رہے۔ اچانک وہ چپ ہو گئے جیسے وہ کوئی بات سن رہے ہوں۔ رشتے دار بھی خاموش ہو گئے اور بعض تو پیچھے ہٹ گئے۔ جعفر کمبل کے نیچے دانت پیس رہا تھا کیونکہ اس کا بندر طرح طرح کی بدتمیزی کی شرارتوں پر اتر آیا تھا۔

''ارے ناپاک، بے ایمانو!'' خواجہ نصر الدین گرج پڑے۔ ''تم نے میری حکم عدولی کی جرأت کیسے کی۔ تمہیں یہ ہمت کیسے ہوئی کہ دعا پڑھتے وقت اسی بات کا تصور کرو جس کے لئے میں نے خاص طور سے تمہیں منع کیا تھا!'' انہوں نے کمبل الٹ دیا اور جعفر پر پھوٹ پڑے ''تم نے میری مدد کیوں مانگی تھی؟ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ تم شفا نہیں چاہتے تھے! تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ کہ تم شفا نہیں چاہتے تھے! تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ تم میرے دشمنوں کے لئے یہ سب کر رہے تھے! جعفر ہوشیار رہنا! کل ہی امیر کو سارا قصہ معلوم ہو جائے گا۔ میں انہیں بتاؤں گا کس طرح تم نے دعا پڑھتے وقت جان بوجھ کر مرتدانہ خیالات سے بندر کا تصور کیا! جعفر ہوشیار رہنا اور تم سب بھی! تم آسانی سے نہیں چھٹکارا پاؤ گے۔ یقیناً تم کو کفر کی سزا تو معلوم ہی ہو گی....''

چونکہ کفر کی سزا ہمیشہ انتہائی شدید ہوتی تھی اس لئے رشتے دار تو مارے خوف کے مفلوج ہو گئے۔ سودخور اپنے کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے اس طرح ہکلانے لگا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ خواجہ نصرالدین اس کی بات سننے کے لئے نہیں رکے۔ وہ وہاں سے مڑ کر چل پڑے اور پھاٹک دھڑام سے بند کیا۔

جلد ہی چاند بلند ہو گیا۔ شہر ہلکی ہلکی چاندنی میں نہا گیا۔ سودخور کے گھر میں رات گئے تک تُو تُو میں میں جاری رہی۔ ہر شخص گرم ہو کر بحث کر رہا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ بندر کا تصور کرنے میں کس نے پہل کی۔

31

سودخور کو اس طرح بیوقوف بنا کر خواجہ نصرالدین محل واپس روانہ ہوئے۔

دن بھر کی محنت مشقت کے بعد بخارا کے لوگ سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ گلیوں میں خنکی اور اندھیرا تھا اور پلوں کے نیچے پانی کی موسیقی گونج رہی تھی۔ بھیگی مٹی کی سوندھی مہک پھیلی تھی اور خواجہ نصرالدین کا پیر کیچڑ میں جا بجا پھسل رہا تھا کیونکہ کسی فیاض سقے نے بڑی دریا دلی سے سڑک پر چھڑکاؤ کیا تھا تاکہ صحنوں اور چھتوں پر تھکے ہارے آرام کرنے والوں کو گرد آلود ہوا نہ ستائے۔ اندھیرے میں لپٹے ہوئے باغ اپنی خوشگوار مہک دیواروں کے پار تک پہنچا رہے تھے۔ دور دراز آسمان پر ستارے خواجہ نصرالدین کی طرف آنکھیں جھپکا جھپکا کر ان سے کامیابی کا وعدہ کر رہے تھے۔

''ہاں'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ''بہر حال دنیا کوئی ایسی بری جگہ نہیں ہے! کم از کم ایسے آدمی کے لئے تو نہیں جس کے دماغ ہو، خالی کدو نہیں۔''

راستے میں وہ بازار کی طرف مڑ گئے اور اپنے دوست علی کے چائے خانے میں انہوں نے مہمان نواز روشنیاں چمکتے ہوئے دیکھیں۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی مالک نے ان کے لئے دروازہ کھول دیا۔ دونوں گلے ملے اور ایک اندھیرے کمرے میں چلے گئے۔ پتلی دیوار کے دوسری طرف سے باتوں، ہنسی اور برتنوں کی کھن کھناہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ علی نے دروازہ بند کر کے ایک چراغ جلا دیا۔

''سب تیار ہے'' اس نے چپکے سے کہا۔ ''میں گل جان کے چائے خانے میں انتظار کروں گا۔

یوسف آھنگر نے اس کے چھپنے کے لے ایک محفوظ جگہ تیار کر لی ہے۔تمہارے گدھے پر دن رات کاٹھی کسی رہتی ہے۔وہ بہت اچھا ہے۔خوب کھاتا ہے اور موٹا ہو گیا ہے۔''

''علیٰ،تمہارا بہت بہت شکریہ۔تمہارے احسان کے بارے میں کبھی سبکدوش نہیں ہوسکوں گا۔''

''ارے ہاں''علیٰ نے کہا۔''خواجہ نصرالدین تم جو کچھ چاہتے ہو ہمیشہ کر لیتے ہو۔اس لئے احسان وحسان کی بات چھوڑو۔''

یہ دونوں بیٹھ کر چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے رہے۔علیٰ نے گل جان کے لئے ایک مردانہ لباس دکھایا اور ایک بڑا سا عمامہ جو اس کے بالوں کو چھپا سکے۔

ہر بات پوری تفصیل کے ساتھ طے ہوگئی۔خواجہ نصرالدین رخصت ہونے والے تھے کہ انہوں نے دیوار کے دوسری طرف ایک جانی پہچانی آواز سنی۔چائے خانے کی طرف کھلنے والے دروازے کو انہوں نے ذرا کھولا اور کان لگا کر سننے لگے۔یہ چیچک رو جاسوس کی آواز تھی۔خواجہ نصرالدین نے دروازہ اور کھول دیا اور دیکھنے لگے۔

چیچک رو جاسوس ایک بھاری قبا پہنے،سر پر عمامہ رکھے اور مصنوعی داڑھی لگائے کچھ آدمیوں کے درمیان گھرا بیٹھا تھا اور بہت اہم بن کر کہہ رہا تھا:

''جو آدمی اپنے کو خواجہ نصرالدین کہتا ہے وہ جعل ساز ہے۔میں اصلی خواجہ نصرالدین ہوں لیکن میں نے بہت دن ہوئے اپنی بری حرکتوں سے توبہ کر لی ہے کیونکہ وہ واقعی بری اور ناپاک تھیں۔اس لئے میں یعنی اصلی خواجہ نصرالدین تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ تم بھی میری مثال کی پیروی کرو اور میری طرح خیال کرو کہ ہمارے معظم،مانند آفتاب امیر واقعی زمین پر اللہ کے نائب ہیں جس کا ثبوت ان کی بے نظیر دانش مندی اور رحم وکرم ہے۔میں،اصلی خواجہ نصرالدین تم کو یہ بتاتا ہوں۔''

''اچھا''خواجہ نصرالدین نے علیٰ کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔''تو اب یہ ہو رہا ہے۔ان کا خیال ہے کہ میں شہر چھوڑ کر جا چکا ہوں۔میں ذرا ان کو اپنی یاد تو دلاتا چلوں۔علیٰ،میں اپنی داڑھی،مرصع قبا اور عمامہ اس کمرے میں چھوڑے جاتا ہوں۔مجھے کچھ پرانے کپڑے دے دو۔''

علیٰ نے ان کو گندی،چیلڑوں سے بھری ایک پھٹی قبا دے دی جو مدتوں ہوئے اپنی خدمات انجام دے چکی تھی۔

''کیا تم چیلڑ پالتے ہو؟'' خواجہ نصرالدین نے قبا پہنتے ہوئے سوال کیا۔''شاید تم ان کی دوکان کھولنے والے ہو لیکن یہ اس سے پہلے ہی تم کو چٹ کر جائیں گے، دوست۔''

پھر خواجہ نصرالدین باہر سڑک پر نکل گئے اور چائے خانے کا مالک اپنے گاہکوں کے پاس آ کر آئندہ ہونے والے واقعات کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔اس کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔خواجہ نصرالدین ایک گلی سے آئے۔وہ اس طرح تھکے تھکے سے اندر داخل ہوئے جیسے تمام دن سفر کیا ہے۔وہ چائے خانے کے زینوں پر چڑھے اور ایک اندھیر کونے میں بیٹھ کر چاء مانگی۔کسی نے ان کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی۔ بخارا کی سڑکوں پر تو طرح طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔چیچک رو جاسوس اب بھی اپنی ہانک رہا تھا:

''میری غلطیاں بے شمار ہیں لیکن اب میں، خواجہ نصرالدین ان پر نادم ہوں اور قسم کھائی ہے کہ میں پاکباز رہوں گا، تمام اسلامی ہدایات پر عمل کروں گا اور امیر، ان کے وزیروں، صوبے داروں اور پہرے داروں کا حکم مانوں گا۔یہ طے کرنے کے بعد میرے ذہن کو بڑا سکوں اور خوشی مل رہی ہے اور میری دنیاوی ملکیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔پہلے میں ایک آوارہ گرد تھا جس کو ہر ایک حقیر سمجھتا تھا اور اب میں ایک نیک مومن کی طرح زندگی گذار رہا ہوں۔''

ایک ساربان نے جس کے پٹکے میں چابک لگی ہوئی تھی بڑے ادب سے اس کو چاء کی پیالی پیش کی اور کہا:

''بے نظیر خواجہ نصرالدین، میں قوقند سے بخارا آیا ہوں۔میں نے آپ کی دانشمندی کے بارے میں تو سنا تھا لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ کسی دن آپ کی زیارت ہوگی حتیٰ کہ بات چیت بھی ہوگی۔اب میں ہر ایک سے کہوں گا کہ آپ کی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی اور جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ بھی ان کو بتاؤں گا۔''

''اچھی بات ہے'' چیچک رو جاسوس نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے سر ہلایا''ہر ایک سے کہنا کہ خواجہ نصرالدین اب سدھر گئے ہیں، انہوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے اور پاکباز مسلمان بن کر امیر کے سچے خادم ہو گئے ہیں۔جس سے بھی تمہاری ملاقات ہو سبھی کو یہ خوش خبری سنانا۔''

''میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، بے مثال خواجہ نصرالدین'' ساربان بولا۔''میں سچا مسلمان ہوں اور انجانے بھی قانون کے خلاف کچھ کرنا نہیں چاہتا۔میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مان لیجئے میں

نہار ہا ہوں اور اذان کی آواز سنائی دیتی ہے تو مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کس طرف کا رخ مجھے کرنا چاہئے؟''

چیچک رو جاسوس بڑے مربیانہ انداز میں مسکرایا اور بولا:

''مکے کی طرف قطعی طور پر....''

تاریک کونے سے آواز آئی:

''اپنے کپڑوں کی طرف تاکہ گھر ننگے نہ جاؤ۔''

اس احترام کے باوجود جو جاسوس نے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا ساری محفل نے مسکراہٹ چھپانے کے لئے سر جھکا لیا۔

جاسوس نے خواجہ نصر الدین کو غور سے دیکھا لیکن دھندلے میں پہنچان نہ سکا۔

''اس کونے میں کون بھونک رہا ہے؟'' اس نے غرور سے پوچھا۔ ''اے، بھک منگے، کیا تو خواجہ نصر الدین کے مقابلے میں اپنی عقل آزمانے کی کوشش کر رہا ہے؟''

''اس کے لئے میں بہت چھوٹا آدمی ہوں'' خواجہ نصر الدین نے چائے پیتے ہوئے جواب دیا۔

اب ایک کسان نے پوچھا:

''محترم خواجہ نصر الدین بتایئے کہ کسی جنازے میں حصہ لیتے ہوئے اسلام کے مطابق کس جگہ کھڑے ہونا بہتر ہوگا۔ جنازے کے آگے یا پیچھے؟''

جاسوس نے بڑے اہم انداز میں ایک انگلی اٹھائی۔ وہ جواب دینے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس سے پہلے ہی کونے سے آواز آئی ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم جنازے کے آگے ہو یا پیچھے بشرطیکہ تم خود تابوت کے اندر نہ ہو۔''

چائے خانہ کا مالک جو مزاحیہ باتوں سے بڑا لطف لیتا تھا اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا اور فلک شگاف قہقہے لگانے لگا۔ دوسرے بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ کونے میں بیٹھا ہوا آدمی بڑا چرب زبان تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ خواجہ نصر الدین کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے۔

جاسوس نے جس کا غصہ بڑھ رہا تھا آہستہ سے اپنا سر گھمایا:

''ارے تیرا نام کیا ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ تیری زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ خبردار، کہیں اس سے بالکل ہی ہاتھ نہ دھونا پڑے! میں ایک جملہ کہہ کر اس کو آسانی سے ختم کر سکتا ہوں'' اس نے سامعین کی

طرف مڑتے ہوئے کہا ''لیکن اس وقت ہم مقدس اور پاکیزہ باتیں کر رہے ہیں جہاں حاضر جوابی کی کوئی گنجائش نہیں۔ سب باتوں کے لئے ایک وقت ہوتا ہے۔ فی الحال میں اس بھک منگے کو کوئی جواب نہیں دوں گا۔ ہاں میں کہہ رہا تھا کہ میں، خواجہ نصرالدین تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ میری پیروی کرو۔ ملاؤں کی عزت کرو، حکام کا حکم مانو اور پھر خوشحالی تمہارے قدم چومے گی۔ لیکن سب سے پہلے ان آوارہ گردوں کی بات نہ سنو جو جعل کرتے ہیں اور اپنے کو خواجہ نصرالدین کہتے ہیں، جیسے یہ آدمی جس نے حال ہی میں بخارا میں تمام ہنگامہ کیا اور پھر یہ جان کر بے پتہ نشان غائب ہو گیا کہ اصلی خواجہ نصرالدین آ گئے ہیں۔ ایسے تمام بہروپیوں کو پکڑ وا اور امیر کے پہرے داروں کے حوالے کر دو۔''

''بالکل ٹھیک!'' خواجہ نصرالدین نے زور سے کہا اور دھندلے سے روشنی میں آ گئے۔

تمام حاضرین نے ان کو فوراً پہچان لیا اور اس اچانک واقعہ سے ششدر رہ گئے۔ جاسوس زرد پڑ گیا۔ خواجہ نصرالدین جاسوس کے قریب آگے اور علی بھی چپکے سے ان کے پیچھے لگ لیا تا کہ جاسوس کو جھپٹ لے۔

''اچھا، تو تم اصلی خواجہ نصرالدین ہو؟''

جاسوس نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا، اس کے گال کانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ادھر ادھر نگراں تھیں۔ بہرحال اس نے زور لگا کر جواب دیا:

''ہاں، میں اصلی خواجہ نصرالدین ہوں، اور سب دھوکے باز ہیں اور تو بھی۔''

''مسلمانو! تم کیا کھڑے دیکھ رہے ہو؟'' خواجہ نصرالدین نے چیخ کر کہا۔ ''اس نے خود ہی کہا ہے! پکڑو، پکڑو، اس کو! کیا تم نے امیر کا حکم نہیں سنا ہے اور تمہیں پتہ نہیں ہے کہ خواجہ نصرالدین کے ساتھ کیا کرنا چاہئے؟ پکڑوا سے، نہیں تو تمہیں اس کو بچانے کے لئے جواب دہی کرنی ہوگی!''

انہوں نے جاسوس کی مصنوعی داڑھی نوچ لی۔

چائے خانے میں سبھی لوگوں نے اس نفرت انگیز چیچک رو، چپٹی ناک اور چالاک آنکھوں والے آدمی کو پہچان لیا۔

''اس نے خود ہی تسلیم کیا ہے!'' خواجہ نصرالدین دائیں طرف آنکھ مارتے ہوئے چیخے۔ ''پکڑو خواجہ نصرالدین کو!'' اور انہوں نے بائیں طرف آنکھ ماری۔

چائے خانے کے مالک علی نے سب سے پہلے جاسوس پر ہاتھ ڈالا۔ جاسوس نے چھڑانے کی کوشش کی لیکن سقے، کسان اور کاریگر جھگڑے میں کود پڑے۔ کچھ دیر تک تو بس مکوں کے اوپر اٹھنے اور گرنے کا منظر دکھائی دیا۔ خواجہ نصرالدین سب سے زیادہ زوروں سے کوٹائی کر رہے تھے۔

''ارے میں تو مذاق کر رہا تھا!'' جاسوس کراہتے ہوئے چلایا۔ ''ارے مسلمانو، یہ مذاق تھا! میں خواجہ نصرالدین نہیں ہوں! مجھے جانے دو!''

''تم جھوٹے ہو!'' خواجہ نصرالدین نے چلا کر جواب دیا۔ ان کی مٹھیاں ایسی چل رہی تھیں جیسے کوئی نانبائی آٹا گوندھ رہا ہو۔ ''تم نے خود اقرار کیا! ہم سب نے سنا! ارے مسلمانو! ہم جتنے لوگ یہاں موجود ہیں سب اپنے امیر کے سچے وفادار ہیں اور ہمیں چاہئے کہ ہم ان کے احکام کو وفاداری کے ساتھ بجا لائیں۔ اس لئے مسلمانو، اس خواجہ نصرالدین کو اچھی طرح دھنکنا چاہئے! اس کو گھسیٹ کر محل لے جاؤ اور پہرے داروں کے حوالے کر دو! اللہ اور امیر کی عظمت کا واسطہ، اس کو خوب پیٹو!''

مجمع نے جاسوس کو محل کے طرف گھسیٹنا شروع کیا اور راستے بھر اس کی مرمت برابر ہوتی رہی۔ خواجہ نصرالدین نے اس کو زوردار لات سے رخصت کیا اور چائے خانے واپس آ گئے۔

''اف'' انہوں نے اپنا پسینے سے تر چہرہ پونچھتے ہوئے کہا ''اس بار ہم نے اس کی خوب مرمت کر دی۔ اب بھی وہ پٹ رہا ہے۔ آوازوں سے معلوم ہوتا ہے۔''

مشتعل آوازیں اور جاسوس کی فریاد بھری چیخیں اب بھی دور سے آ رہی تھیں۔ ہر ایک کو اس سے کچھ نہ کچھ بدلا لینا تھا اور امیر کے حکم کے زور پر ان کو اچھا موقع مل گیا تھا۔

چائے خانے کا مالک خوش ہو کر اپنی توند سہلا رہا تھا:

''اس کے لئے سبق ہو جائے گا۔ وہ اب میرے چائے خانے میں قدم نہیں رکھے گا۔''

پچھلے کمرے میں خواجہ نصرالدین نے اپنا لباس تبدیل کیا، اپنی مصنوعی داڑھی لگائی اور پھر بغداد کے دانا مولانا حسین بن گئے۔

جب وہ محل واپس ہوئے تو انہوں نے پہرے داروں کے کمرے سے آتی ہوئی کراہوں کی آواز سنی۔ انہوں نے اندر دیکھا تو چیچک رو جاسوس ایک نمدے پر پڑا تھا۔ اس کا بدن سوجا ہوا اور جا بجا زخمی تھا اور اس کی حالت ابتر تھی۔ ارسلان بیگ اس کے پاس ایک لالٹین لئے کھڑا تھا۔ ''جناب ارسلان بیگ، کیا

ہوا؟'' خواجہ نصرالدین نے معصومیت کے ساتھ پوچھا۔

''مولانا، بہت برا ہوا۔ وہ بدمعاش خواجہ نصرالدین پھر شہر میں آ گیا۔ اس نے ہمارے سب سے ہوشیار جاسوس کو پیٹ دیا جو ہمارے حکم سے اپنے کو خواجہ نصرالدین بتا کر نیک اور وفادارانہ تقریریں کر رہا تھا تا کہ اصلی خواجہ کے برے اثرات دور ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ دیکھئے؟''

''آہ، آہ!'' جاسوس اپنا زخمی اور مسخ چہرہ اٹھاتے ہوئے کراہا ''میں اس کمبخت آوارہ گرد کے منہ کبھی نہ آؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اس بار تو وہ مجھے ختم ہی کر دے گا۔ اب میں جاسوسی نہیں کروں گا۔ کل میں بہت دور کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا اور کوئی ایمانداری کا کام کروں گا۔''

''میرے دوستوں نے واقعی اس کا بھرتا بنا دیا ہے'' خواجہ نصرالدین نے لالٹین کی روشنی میں جاسوس کو دیکھتے ہوئے سوچا اور اس پر ان کو تھوڑا سا ترس بھی آیا۔ ''اگر محل دو سو قدم اور آگے ہوتا تو وہ شاید یہاں زندہ نہ پہنچتا۔ اب دیکھنا ہے کہ اس نے کوئی سبق سیکھا ہے یا نہیں۔''

صبح سویرے خواجہ نصرالدین نے اپنے برج سے دیکھا کہ چپچپ رو جاسوس ایک چھوٹی سی گٹھری لے کر محل سے نکل گیا۔ وہ لنگڑا رہا تھا اور بار بار اپنے سینے، بازوؤں اور پہلوؤں کو ہاتھوں سے سہلاتا جاتا تھا۔ بار بار وہ دم لینے کے لئے بیٹھ جاتا۔ اس نے بازار کو پار کیا جو رفتہ رفتہ صبح کی خنک شعاعوں سے روشن ہوتا جاتا تھا اور ڈھکے ہوئے اسٹالوں کی قطاروں میں غائب ہو گیا۔

صبح سے رات کی تاریکی نے شکست کھائی۔ صبح خالص، شفاف اور پرسکون تھی۔ شبنم نے اس کو دھو کر اس پر دھوپ کے تار بکھیر دئے تھے۔ چریاں چہچہا رہی تھیں اور زفیلیں دے رہی تھیں۔ سورج کی پہلی کرنوں میں نہانے کے لئے تتلیاں اڑ رہی تھیں۔ خواجہ نصرالدین کے سامنے کھڑکی کے پٹرے پر ایک شہد کی مکھی آ کر رینگنے لگی۔ اس کو اس شہد کی تلاش تھی جو مرتبان میں تختے پر رکھا تھا۔

سورج خواجہ نصرالدین کا پرانا اور وفادار دوست تھا۔ اب وہ بلند ہو رہا تھا۔ ہر صبح خواجہ نصرالدین اس کو دیکھتے اور ایسا محسوس کرتے جیسے انہوں نے سورج کو سال بھر بعد دیکھا ہے۔ سورج بلند ہو رہا تھا، مہربان اور فیاض دیوتا جو سب کو یکساں فیض پہنچاتا ہے اور ساری دنیا بھی اس کے خیر مقدم کے لئے صبح کی کرنوں میں چمکتا دمکتا اپنا شعلہ ور حسن پیش کر دیتی ہے۔ پھولے پھولے بادل، میناروں کے پالش کئے ہوئے ٹائل، بھیگی ہوئی پتیاں، پانی اور گھاس، حتی کہ سنگ خارا کی سپاٹ چٹان، قدرت کی دھتکاری ہوئی

سوتیلی بیٹی بھی سورج کے خیر مقدم میں ایک انوکھا روپ دھار لیتی، اس کی ٹوٹی پھوٹی سطحیں اس طرح چمکنے دمکنے لگتیں جیسے ان پر ہیرے کا برادہ پھیلا دیا گیا ہو۔

خواجہ نصر الدین اپنے دوست کے دمکتے ہوئے چہرے سے کیسے بے اعتنائی برت سکتے تھے۔ سورج کی چمک دار کرنوں میں ایک درخت کی پتیاں رقص کر رہی تھیں۔ خواجہ نصر الدین بھی اس کے ساتھ جھوم گئے جیسے وہ بھی سرسبز پتیوں میں ملبوس ہوں۔ قریب کے مینار پر کبوتر غٹر غوں کر کے اپنے پر جھاڑ رہے تھے۔ تتلیوں کا ایک جوڑا کھڑکی کے سامنے لہرایا اور خواجہ کا دل چاہا کاش کہ وہ بھی ان کے اس نازک کھیل میں شریک ہو جاتے۔

خواجہ نصر الدین کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ چیچک رو جاسوس کا خیال کر کے ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کاش کہ یہ صبح اس جاسوس کی نئی زندگی کی صاف ستھری اور معقول صبح ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ برائیاں اس جاسوس کی روح تک میں پیوست ہو چکی ہیں اور وہ پوری طرح صحت یاب ہوتے ہی پھر اپنی پرانی حرکتوں پر اتر آئے گا۔

بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ خواجہ نصر الدین نے اپنی پیش گوئی میں غلطی نہیں کی تھی۔ وہ انسانوں کی اتنی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے لئے غلطی کرنا مشکل تھا حالانکہ ان کو اپنی غلطی پر خوشی ہوتی اور وہ اس جاسوس کے روحانی نوجیون پر خوش ہوتے۔ بہر حال، سڑی ہوئی چیز پھر تازہ اور بار آور نہیں ہو سکتی۔ بدبو خوشبو نہیں بن سکتی۔ خواجہ نصر الدین نے افسوس کے ساتھ آہ بھری۔

ان کا محبوب خواب یہ تھا کہ ایسی دنیا ہوتی جہاں انسان بھائیوں کی طرح رہ سکے، نہ تو ان میں حرص و حسد ہوتا اور نہ چوری چکاری اور غصہ، بلکہ وہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرتے اور ہر ایک کی خوشی کو سب کو خوشی سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہوتے۔ پھر بھی ایسی خوشگوار دنیا کا تصور کرتے ہوئے وہ اس تلخ حقیقت بھی سمجھتے تھے کہ انسان اس طرح رہتے ہیں جو ان کے لئے زیبا نہیں ہے، ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں، غلام بناتے ہیں اور اپنی روحوں کو ہر برائیوں سے داغدار کرتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو صاف ستھرے اور ایماندارانہ وجود کے قوانین کو سمجھنے میں کتنی مدت لگے گی؟

خواجہ نصر الدین کو اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ انسان کسی نہ کسی دن ان قوانین کو سمجھے گا۔ ان کو اس بات پر قطعی یقین تھا کہ اس دنیا میں برے آدمیوں سے زیادہ بھلے آدمی ہیں جعفر سود خور اور چیچک رو

جاسوس اور ان کی سڑی گلی روحیں کریہہ استثنیٰ ہیں۔ ان کو قطعی یقین تھا کہ فطرت نے انسان کو صرف بھلائیوں سے سنوارا ہے اور تمام برائیاں اس کوڑے کرکٹ کی طرح ہیں جو اس کی روح پر زندگی کے غلط اور غیر منصفانہ نظام نے باہر سے تھوپ دی ہیں۔ ان کو قطعی یقین تھا کہ وہ وقت ضرور آئے گا جب انسان اپنی زندگی کو پھر سے بنانا اور صاف کرنا شروع کر دیں گے تو وہ اپنی شرفیانہ محنت کے ذریعہ اپنی روح کی تمام گندگیوں کو دھوڈالیں گے۔

خواجہ نصرالدین کے خیالات کا یہ رجحان ان کے بارے میں بہت سے قصوں سے ثابت ہوتا ہے جن پر ان کے روحانی جذبات کا ٹھپہ ہے۔ ان میں یہ کتاب بھی شامل ہے۔ حالانکہ ان کی یاد کو داغدار بنانے کی بہتری کوششیں کی گئیں، محض کمینے رشک وحسد کی وجہ سے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئیں کیونکہ جھوٹ سچ پر کبھی غالب نہیں آ سکتا۔ خواجہ نصرالدین کی یاد ہمیشہ اس ہیرے کی طرح درخشاں اور خالص رہے گی جو سب باتوں کی باوجود اپنی چمک دمک برقرار رکھتا ہے۔ آج تک جو مسافر ترکی میں آک شہر کے سادے سے مقبرے کے سامنے رکتے ہیں اب بھی بخارا کے اس زندہ دل جہاں گرد، خواجہ نصرالدین کا نام کلمہ خیر سے ہی لیتے ہیں۔ ایک شاعر کے الفاظ میں وہ کہتے ہیں:

''انہوں نے اپنا دل دھرتی کو دے دیا حالانکہ وہ دنیا بھر میں ہوا کی طرح چکر لگاتے رہے، اس ہوا کی طرح جو ان کی موت کے بعد ان کے دل کی گلاب جیسی مہک ساری دنیا میں پھیلا آئی۔ دانائی کے ہمہ گیر حسن کو ہی دیکھنا زندگی کا حسن ہے۔ وہی زندگی حسین ہے جو ختم ہونے کے بعد اپنی روح کے خالص جذبات چھوڑ جاتی ہے۔''

یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آک شہر کے مقبرے میں کوئی دفن نہیں ہے اور خواجہ نصرالدین نے اس کو اسی مقصد سے بنوایا تھا کہ ان کی موت کی خبر پھیل جائے اور پھر وہ جہاں گردی کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ یہ سچ ہے یا نہیں؟ ہمیں بیگار قیاس آرائیوں میں وقت نہ گنوانا چاہئے۔ ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ نصرالدین سے ہر طرح کی باتوں کی توقع ہوسکتی ہے۔

صبح کا وقت جلد ہی گذر گیا اور پھر گرم اور امس بھری دوپہر آئی۔ اب فرار کے لئے سب کچھ تیار تھا۔ خواجہ نصرالدین اوپر اپنے قیدی کے پاس گئے۔

''آپ کی قید کی مدت ختم ہونے والی ہے، دانائے روزگار مولانا حسین۔ آج رات کو میں محل چھوڑ

دوں گا۔ میں آپ کا دروازہ ایک شرط پر کھلا چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ دو دن تک یہ جگہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر آپ جلدی نکلے تو مجھے محل میں پائیں گے اور پھر میں اس بات پر مجبور ہوں گا کہ آپ پر بھاگنے کا الزام لگا کر جلاد کے حوالے کر دوں۔ بغداد کے دانا، مولانا حسین، خدا حافظ۔ آپ میرے متعلق بہت برا خیال نہ کریں۔ میں آپ کو یہ فریضہ سپرد کرتا ہوں کہ آپ امیر کو سچی بات بتائیں اور اس کو میرا نام بتائیں۔ میرا نام خواجہ نصر الدین ہے۔''

''کیا؟'' بڈھے نے حیرت سے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ وہ نام کو سن کر ہی ہکا بکا رہ گیا۔

دروازے کے بند ہونے کی چر چراہٹ ہوئی۔ زینوں پر خواجہ نصر الدین کے قدموں کی آواز غائب ہو گئی۔ بڈھا احتیاط کے ساتھ دروازے تک گیا اور اس کو آزمایا۔ وہ مقفل نہیں تھا۔ اس نے باہر جھانک کر دیکھا، کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر کے زنجیر لگا لی۔

''نہیں'' وہ بڑبڑایا ''میں پورے ہفتے یہاں پڑے رہنے کو ترجیح دوں گا بمقابلہ اس کے کہ پھر خواجہ نصر الدین سے پالا پڑے۔''

رات کو جب فیروزی آسمان پر پہلے ستارے جھلملائے، خواجہ نصر الدین ایک مٹی کی صراحی لے کر ان پہرے داروں کے پاس گئے جو امیر کے حرم کے پھاٹک پر متعین تھے۔ پہرے داروں نے ان کو آتے نہیں دیکھا اور اپنی بات چیت جاری رکھی:

''وہ دیکھو، ایک اور ستارہ ٹوٹا'' کچے انڈے کھانے والے موٹے اور کاہل پہرے دار نے کہا ''اگر تمہارے کہنے کے مطابق وہ زمین پر گرتے ہیں تو لوگ ان کو پاتے کیوں نہیں؟''

''شاید وہ سمندر میں گرتے ہیں'' دوسرے پہرے دار نے کہا۔

''ارے، بہادر سپاہیو'' خواجہ نصر الدین بیچ میں بولے ''خواجہ سراؤں کے داروغہ کو تو بلانا۔ میں بیمار داشتہ کے لئے دوا لایا ہوں۔''

''خواجہ سراؤں کا داروغہ آیا اور ادب سے دونوں ہاتھ بڑھا کر چھوٹی سی صراحی سنبھالی جس میں چونے کے پانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا، دوا کے استعمال کی ہدایات سنیں اور چلا گیا۔

''دانائے روزگار مولانا حسین'' موٹے پہرے دار نے چاپلوسی کرتے ہوئے کہا ''آپ تو دنیا کی ہر بات جانتے ہیں۔ آپ کا علم و فضل تو بے پناہ ہے۔ ہمیں بتائیے کہ آسمان سے ٹوٹ کر ستارے کہاں

گرتے ہیں اور لوگ ان کو کیوں نہیں پاتے؟''

خواجہ نصرالدین بھلا مذاق سے باز آ سکتے تھے۔

''تم نہیں جانتے؟'' انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔''جب ستارے گرتے ہیں تو وہ چھوٹے چھوٹے چاندی کے سکوں میں ٹوٹ جاتے ہیں جو فقیر چن لیتے ہیں۔ بہت سے آدمی تو اس طرح امیر بن گئے۔''

پہرے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ان کے چہرے پر سخت حیرت کے آثار تھے۔

خواجہ نصرالدین ان کی حماقت پر ہنستے ہوئے اپنے راستے چلے گئے۔ان کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ مذاق اتنا کارآمد ثابت ہوگا۔

وہ آدھی رات تک اپنے برج میں رہے۔آخر کار شہر اور محل میں سناٹا چھا گیا۔اب وقت گنوانا نہیں تھا۔گرمیوں کی راتیں بڑی صبا رفتار ہوتی ہیں۔خواجہ نصرالدیں نیچے اترے اور چپکے سے امیر کے حرم کی طرف روانہ ہوئے۔

''پہرے دار اب تو سوتے ہوں گے'' انہوں نے سوچا۔

لیکن جب وہ قریب پہنچے تو ان کو بڑی ناامیدی ہوئی کیونکہ پہرے دار چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔

''اگر ایک ہی ستارہ یہاں گر جاتا'' موٹا کاہل پہرے دار کہہ رہا تھا''تو ہم چاندی بٹور کر یک دم امیر بن جاتے۔''

''مجھے یقین نہیں ہے کہ ستارے چاندی کے سکوں میں ٹوٹ جاتے ہیں'' اس کا ساتھی بولا۔

''لیکن بغداد کے دانا نے ایسا ہی بتایا ہے'' پہلے نے جواب دیا۔''واقعی وہ بہت بڑے عالم و فاضل ہیں اور غلطی نہیں کر سکتے ہیں۔''

''لعنت ہو ان پر!'' خواجہ نصرالدین نے اندھیرے میں چھپتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔''میں نے ان کو ستاروں کے بارے میں بتایا ہی کیوں؟ اب وہ صبح تک اس پر بحث کریں گے۔کیا بھاگنا ملتوی کرنا پڑے گا؟''

بخارا کے اوپر ہزاروں ستاروں کی صاف اور پرسکون روشنی تھی۔اچانک ایک چھوٹا سا ستارا ٹوٹا اور

آسمان کے پار انتہائی تیز رفتاری سے ترچھا گرنے لگا۔ایک اور ستارہ اس کے بعد روانہ ہوا اور اپنے پیچھے ایک جلتی ہوئی لکیر چھوڑتا گیا۔ یہ موسم گرما کا وسطی دور تھا جس میں ستارے کافی ٹوٹتے ہیں۔

''اگر وہ واقعی ٹوٹ کر چاندی کے سکے بن جاتے....'' دوسرے پہرے دار نے اپنی بات شروع کی۔

اچانک خواجہ نصرالدین کے ذہن میں ایک خیال چمکا۔انہوں نے جلدی سے اپنی تھیلی نکالی جو چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھی۔ستاروں کے گرنے میں ایک لمبا وقفہ ہو گیا۔آخر کار ایک ٹوٹا۔خواجہ نصرالدین نے ایک سکہ پہرے داروں کے قدموں کے قریب پھینکا۔پتھر کے فرش پر سکے کی جھنکار ہوئی، پہلے تو پہرے دار پتھرا سے گئے۔پھر وہ ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تم نے یہ سنا؟'' پہلے پہرے دار نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں میں نے سنا'' دوسرے نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

خواجہ نصرالدین نے ایک اور سکہ پھینکا جو چاندنی رات میں چمک اٹھا۔کاہل پہرے دار ہلکی سی چیخ مار کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

''تم....کومل...گیا؟'' دوسرے پہرے دار نے مشکل سے کہا۔جوش حیرت میں وہ تقریباً گونگا ہو گیا تھا۔

''می...می مل...گ...گیا'' موٹے پہرے دار نے ہکلاتے ہوئے کہا۔اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔اس نے اٹھتے ہوئے سکہ دکھایا۔

اچانک کئی اور ستارے ایک ساتھ ٹوٹے اور خواجہ نصرالدین نے مٹھی بھر بھر کر سکے پھینکنا شروع کر دئے۔پر سکوت رات سکوں کی لطیف کھن کھناہٹ سے گونج سی گئی۔پہرے دار بالکل بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے اپنے نیزے تو الگ پھینکے اور جھک کر سکے تلاش کرنے لگے۔

''یہ رہا!'' ایک کی بھاری گھٹی ہوئی آواز آئی۔''یہ رہا!''

دوسرا خاموشی سے رینگ رہا تھا۔پھر وہ کثرت سے سکے پھیلے دیکھ کر گھگھیا گیا۔

خواجہ نصرالدین نے ایک اور مٹھی سکے پھینکے اور بلا ورک ٹوک پھاٹک کے اندر داخل ہو گئے۔

باقی کام آسان تھا۔نرم، گداز ایرانی قالینوں پر ان کے قدموں کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔وہ تمام

موڑوں اور پیچیدہ راستوں سے واقف تھے۔خواجہ سرا سور ہے تھے....

گل جان نے ان کا خیر مقدم ایک محبت بھرے بوسے سے کیا اور کانپتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔

''جلدی کرو'' انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

کوئی ان کو روکنے والا نہ تھا۔ایک خواجہ سرا نے کروٹ لی اور نیند میں بڑبڑایا۔خواجہ نصر الدین اس پر جھک گئے لیکن اس کی زندگی ابھی باقی تھی۔اس نے اپنے ہونٹ چاٹے اور پھر خراٹے بھرنے لگا۔رنگین شیشوں سے ہلکی چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔

پھاٹک پر خواجہ نصر الدین رکے اور انہوں نے چاروں طرف غور سے نظر دوڑائی۔صحن میں پہرے دار اپنے چاروں ہاتھوں پیروں پر سے نظر دوڑائی۔صحن میں پہرے دار اپنے چاروں ہاتھوں پیروں پر ٹکے ہوئے گردنیں اوپر اٹھا اٹھا کر آسمان کو تک رہے تھے کہ کوئی اور ستارہ ٹوٹے۔خواجہ نے ایک مٹھی بھر اور سکے پھینکے جو کچھ درختوں کے دوسری طرف جا کر گرے۔پہرے دار اپنے بوٹ کھٹ کھٹ کرتے ہوئے آواز کی طرف دوڑ پڑے۔انہوں نے اپنے ہیجان میں چاروں طرف کچھ نہیں دیکھا اور زور زور سے ہانپتے اور شور مچاتے ہوئے خاردار جھاڑیوں کے پار دوڑے جن کے کانٹوں میں ان کی قباؤں اور شلواروں کے چیتھڑے پھٹ کر اٹک گئے۔

اس رات کو تو حرم سے ایک کیا ساری داشتائیں اغوا کی جا سکتی تھیں۔

''جلدی کرو، جلدی'' خواجہ نصر الدین برابر کہتے جاتے تھے۔

وہ دوڑ کر برج تک گئے اور زینوں پر چڑھے۔خواجہ نصر الدین نے اپنے بستر کے نیچے سے ایک رسی نکالی۔یہ انہوں نے پہلے سے تیار کر لی تھی۔

''بہت اونچا ہے...مجھے تو ڈر لگتا ہے'' گل جان نے چپکے سے کہا لیکن خواجہ نصر الدین نے اس کو ڈانٹا تو اس نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔

خواجہ نصر الدین نے گل جان کے گرد ایک پھندا باندھ دیا اور کھڑکی کا جنگلہ نکال دیا جو انہوں نے پہلے ہی کاٹ ڈالا تھا۔گل جان کھڑکی کے پتھر پر بیٹھی تھی۔وہ بلندی دیکھ کر کانپ گئی۔

''باہر نکلو!'' خواجہ نصر الدین نے حکم دیا اور اس کو پیچھے سے ہلکا سا دھکا دیا۔

گل جان نے آنکھیں بند کر لیں، چکنے پتھر پر سے پھسل کر ہوا میں لٹک گئی۔زمین پر پہنچ کر اس کے

حواس بجا ہوئے۔

''بھاگو، بھاگو!'' اوپر سے آواز آئی۔ خواجہ نصرالدین کھڑکی سے باہر جھکے ہوئے اپنے ہاتھ ہلا رہے تھے اور رسی اوپر کھینچ رہے تھے۔ گل جان نے جلدی سے اپنے کورسی سے کھولا اور سنسان چوک میں سے ہوکر بھاگی۔

اس کو پتہ نہیں تھا کہ پورے محل زبردست ہنگامہ برپا ہوگیا ہے۔ خواجہ سراؤں کے داروغہ کے ناخوشگوار تجربے نے اس میں بے وقت کا جوش پیدا کردیا تھا اور وہ آدھی رات کو نئی داشتہ کے کمرے میں نگہبانی کے لئے پہنچ گیا لیکن وہاں تو بستر خالی تھا۔ وہ بھاگتا ہوا گیا اور امیر کو جگا دیا۔ امیر نے ارسلان بیگ کو طلب کرلیا۔ ارسلان بیگ نے محل کے پہرے داروں کو جگایا۔ مشعلیں روشن ہوگئیں، نیزوں اور سپروں کی جھنکار گونجنے لگی۔

بغداد کے دانا کی طلبی ہوئی۔ امیر نے چیختے ہوئے شکایت کی:

''مولانا حسین! ہماری ریاست کی اب یہ حالت پہنچ گئی ہے کہ ہمیں، امیر اعظم کو یہ بدمعاش خواجہ نصرالدین ہمارے محل تک میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا! ایسا تو کبھی سنا بھی نہیں گیا تھا کہ امیر کے حرم سے داشتہ چوری جائے!''

''امیر اعظم''، بختیار نے بولنے کی ہمت کی ''شاید یہ خواجہ نصرالدین کی حرکت نہ تھی؟''

''اور کون ہوسکتا ہے؟'' امیر تیز آواز میں چیخا۔ صبح کو ہمیں رپورٹ ملی کہ وہ بخارا واپس آ گیا ہے اور رات میں ہماری داشتہ غائب ہوگئی جو اس کی منگیتر تھی۔ اس کے سوا اور کون یہ کرسکتا تھا؟ اس کو تلاش کرو۔ ہر جگہ پہرے داروں کی تعداد تگنی کردی جائے۔ اس کو محل سے باہر نکلنے کا وقت نہیں ملا ہے۔ ارسلان بیگ، یاد رکھو، تمہارے سر کی خیریت نہیں ہے!''

تلاش شروع ہوگئی۔ پہرے داروں نے محل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مشعلوں نے اپنے لہراتے ہوئے شعلوں سے سارا محل روشن کردیا۔ خواجہ نصرالدین ڈھونڈھنے والوں میں سب سے پیش پیش تھے۔ انہوں نے قالین اٹھا اٹھا کر دیکھا۔ سنگ مرمر کے حوضوں میں عصا ڈال کر کھنگالا، غل مچایا، دوڑ دھوپ کی اور چائے دانیوں اور صراحیوں میں جھانک جھانک کر دیکھا حتی کہ چوہوں کے بل بھی نہ چھوڑے۔

امیر کی خواب گاہ میں جا کر انہوں نے رپورٹ پیش کی ''شہنشاہ اعظم، خواجہ نصرالدین محل سے نکل

گیا۔''

''مولانا حسین!'' امیر نے غصے میں جواب دیا۔''ہمیں تمہاری لاپروائی پر حیرت ہے۔ مان لو وہ کہیں چھپ گیا ہو تو؟ ارے، وہ تو میری خواب گاہ میں بھی گھس سکتا ہے۔ ارے، پہرے داروں کو بلاؤ، پہرے دار وادھر آؤ!'' امیر چلایا۔ وہ خود اپنے ہی تصور سے ڈر گیا تھا۔

باہر ایک توپ دغی۔ اس کا مقصد ہاتھ نہ آنے والے خواجہ نصر الدین کو خوف زدہ کرنا تھا۔ امیر ایک کونے میں گٹھری بن کر پڑ گیا اور چلانے لگا:

''پہرے داروں کو بلاؤ! پہرے داروں کو بلاؤ!''

اس کا ڈر اسی وقت دور ہوا جب ارسلان بیگ نے خواب گاہ کے دروازوں پر تیس پہرے دار تعینات کر دئے اور ہر کھڑکی کے پاس دس دس پہرے دار مقرر کر دئے گئے۔ اب وہ کونے سے باہر نکلا اور فریاد آمیز لہجے میں کہنے لگا:

''مولانا، مجھے بتاؤ۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ بدمعاش میری خواب گاہ میں کہیں چھپا ہے؟''

''دروازوں اور کھڑکیوں پر پہرہ لگا دیا گیا ہے'' خواجہ نصر الدین نے جواب دیا۔''اس کمرے میں ہم دو ہیں۔ خواجہ نصر الدین کہاں ہو سکتا ہے؟''

''اس کو ہماری داشتہ کو اغوا کرنے کی سزا بھگتنا پڑے گی!'' امیر گرجا۔ اب اس کے خوف کی جگہ غصہ لے رہا تھا۔ اس نے اپنی انگلیوں کو اس طرح جھٹکا جیسے وہ خواجہ نصر الدین کا گلا گھونٹ رہا ہو۔''ارے مولانا حسین'' اس نے اپنی بات جاری رکھی''ہمیں بے انتہا غم وغصہ ہے! ہم اس کے پاس ایک بار بھی نہیں گئے۔ اس خیال سے ہمارا دل ملتا ہے۔ یہ سب تمہارے حماقت بھرے ستاروں کا قصور ہے، مولانا۔ اگر ہمارا بس چلتا تو اس گستاخی کے لئے ہم تمام ستاروں کا سر یک دم قلم کروا دیتے۔ لیکن اس بار خواجہ نصر الدین سزا پائے بغیر نہیں جا سکتا۔ ہم ارسلان بیگ کو حکم دے چکے ہیں اور مولانا تم بھی اس بدمعاش کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کرو! یہ نہ بھولو کہ خواجہ سراؤں کے داروغہ کا معزز عہدہ تمہیں ملنے کا انحصار اس کام میں کامیابی پر ہے۔ کل تم محل سے جاؤ گے اور خواجہ نصر الدین کے بغیر نہیں واپس ہو گے۔''

خواجہ نصر الدین اپنی شرارت آمیز آنکھیں نچاتے ہوئے زمین تک جھک کر تعظیم بجا لائے۔

33

باقی رات خواجہ نصرالدین امیر کو اپنے منصوبے بتاتے رہے کہ وہ خواجہ نصرالدین کو کس طرح گرفتار کریں گے۔ یہ منصوبے بڑی چالاکی کے تھے اور امیر ان کو سن کر بہت خوش ہوتا رہا۔

صبح کو خواجہ نصرالدین کو اخراجات کے لئے ایک خریطہ اشرفیوں کا عطا ہوا اور وہ آخری بار اپنے برج کے زینوں پر چڑھے۔ انہوں نے یہ رقم ایک چمڑے کی ھمیانی میں رکھی اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ انہوں نے ایک آہ بھری کیونکہ ان کو یہ جگہ چھوڑنے پر اچانک افسوس ہونے لگا تھا۔ انہوں نے بہت سی بے خواب راتیں نہ جانے کیا کیا سوچتے ہوئے یہاں گذاری تھیں۔ ان سنگین دیواروں کے پیچھے ان کی روح کا کوئی حصہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ جائے گا۔

انہوں نے زور سے دروازہ بند کیا اور نیچے کی طرف زینوں پر بھاگے۔ وہ آزادی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک مرتبہ پھر ساری دنیا ان کے سامنے ہوگی۔ سڑکیں، پہاڑی درے اور راستے ان کو دور دراز کی سیاحت کے لئے پکار رہے تھے۔ سرسبز جنگلات ان کے لئے اپنے سائے اور نرم پتیوں کے قالین پھیلائے کھڑے تھے۔ دریا اپنے خنک پانی سے ان کی پیاس بجھانے کے منتظر تھے۔ چڑیاں اپنے بہترین نغموں سے ان کے خیر مقدم کے لئے تیار تھیں۔ زندہ دل آوارہ گرد خواجہ نصرالدین کافی دن تک سونے کے پنجرے میں بند رہا تھا۔ دنیا اس کی بڑی کمی محسوس کر رہی تھی۔

جب وہ پھاٹک پر پہنچے تو انہیں ایسا صدمہ ہوا جس سے ان کا دل دھل گیا۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ان کو دیوار کا سہارا لینا پڑا۔

کھلے پھاٹک میں پہرے داروں سے گھرے ہوئے ان کے دوستوں کی لمبی قطار لگی تھی۔ ان کے ہاتھ بندے تھے اور سر ڈھلکے ہوئے تھے۔ اس میں بڈھا کمہار نیاز، چائے خانے کا مالک علی، آھنگر یوسف اور بہت سے دوسرے لوگ تھے جن جن سے ان کی کبھی ملاقات ہوئی تھی، جن کے ہاتھ سے انہوں نے کبھی پانی پیا تھا یا مٹھی بھر گھاس اپنے گدھے کے لئے لی تھی۔ سب وہاں بندھے ہوئے تھے۔ ارسلان بیگ اس اندوہناک جلوس کے پیچھے پیچھے تھا۔

جس وقت تک خواجہ نصرالدین کے حواس بجا ہوئے، پھاٹک بند ہو چکے تھے اور صحن خالی تھا۔ قیدی کال کوٹھریوں میں جا چکے تھے۔ خواجہ نصرالدین نے جلدی سے ارسلان بیگ کو تلاش کیا۔

''جناب ارسلان بیگ، کیا ہوا؟ یہ لوگ کہاں کے ہیں؟ انہوں نے کیا گناہ کیا ہے؟''

''یہ لوگ پاجی خواجہ نصرالدین کے پناہ دینے والے اور اس کے ساتھ مل کر سازشیں کرنے والے ہیں!'' ارسلان بیگ نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔ ''میرے جاسوسوں نے ان کا پتہ لگایا ہے اور آج ان کو کھلے عام بری طرح موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اگر انہوں نے خواجہ نصرالدین کا پتہ نہ بتایا۔ لیکن آپ اتنے زرد کیوں ہیں، مولانا؟ آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں...''

''زرد؟'' خواجہ نصرالدین نے حیرت سے کہا۔ ''اس کا یہ مطلب ہوا کہ انعام مجھ کو نہیں تم کو ملے گا!''

خواجہ نصرالدین کو مجبوراً محل میں ٹھہرنا پڑا۔ اس کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ معصوم لوگوں کی جان کا خطرہ تھا۔

دوپہر کو چوک پر فوج تعینات ہوگئی۔ اس نے تین تین کی قطاروں میں چبوترے کی چاروں طرف حلقہ بنالیا۔ مجمع کو نقیبوں نے بتا دیا تھا کہ کچھ لوگوں کو سزائے موت دی جائے گی اور وہ خاموشی سے منتظر تھا۔ صاف آسمان سے چلچلاتی ہوئی دھوپ آرہی تھی۔

محل کے پھاٹک کھلے اور دستور کے مطابق پہلے آگے آگے دوڑتے ہوئے نقیب آئے، پھر پہرے دار اور ان کے پیچھے سازندے، ہاتھی اور درباری۔ آخر میں امیر کی پالکی آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی آئی۔ سارا مجمع تعظیم کے لئے جھک گیا۔ پالکی چبوترہ تک لائی گئی۔

امیر تخت پر بیٹھ گیا۔ مجرم پھاٹک سے باہر لائے گئے۔ ان کو دیکھ کر مجمع میں ہلکا سا شور ہوا۔ مجرموں کے رشتے دار اور دوست آگے کی قطاروں میں کھڑے تھے تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ سکیں۔

جلادوں نے اپنے تیشے، نوکیلے ستون اور رسیاں ٹھیک کرنا شروع کر دیں۔ ان کو پورا دن کام کرنا تھا کیونکہ یکے بعد دیگرے ساٹھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

اس جان لیوا جلوس میں بڈھے نیاز کا نمبر پہلا تھا۔ اس کے دائیں طرف سولی تھی اور بائیں طرف تختہ اور سامنے ایک نوکیلا ستون زمین سے اوپر ابھرا ہوا تھا۔

وزیراعظم بختیار نے بڑی سنجیدہ اور پاٹ دار آواز میں اعلان کیا:

''اس اللہ کے نام پر جو رحیم و کریم ہے بخارا کے حکمراں، آفتاب جہاں، امیر بخارا نے میزان

انصاف میں اپنی رعایا کے ساٹھ افراد کے جرائم تولنے کے بعد جو ناپاک امن وامان شکن بانی شر وفساد خواجہ نصرالدین کو پناہ دینے سے متعلق ہیں مندرجہ ذیل حکم دیا ہے:

''کمہار نیاز کو خاص پناہ دینے والے کی حیثیت سے جس کے گھر میں متذکرہ بالا آوارہ گرد خواجہ نصرالدین نے بہت دن تک پناہ لی یہ سزا دی جاتی ہے کہ اس کا سر جسم سے جدا کر دیا جائے۔ جہاں تک دوسرے مجرموں کا سوال ہے پہلی سزا تو ان کے لئے یہ ہوگی کہ وہ نیاز کی موت کا نظارہ کریں تا کہ وہ اس سے بھی زیادہ خوفناک انجام کی توقع کر کے کانپ سکیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے موت کے طریقے کا الگ الگ اعلان کیا جائے گا۔''

پورے میدان میں ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ بختیار کا ایک ایک لفظ مجمع کی آخری قطاروں تک سنائی دے رہا تھا۔

''اور سب کو یہ معلوم ہونا چاہئے'' بختیار نے اپنی آواز اور بلند کرتے ہوئے اعلان جاری رکھا'' کہ آئندہ بھی جو کوئی خواجہ نصرالدین کو پناہ دے گا اس کا یہی انجام ہوگا۔ ایک بھی جلاد کے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔ بہر حال اگر کوئی بھی مجرم اس ناپاک بدمعاش کا پتہ بتا دے گا تو وہ نہ صرف اپنی جان کی امان پائے گا بلکہ وہ امیر کے انعام واکرام اور دعاؤں کے ساتھ دوسرے مجرموں کی جان بخشی کا باعث بھی ہوگا۔ کمہار نیاز کیا تو خواجہ نصرالدین کا پتہ بتا کر خود اپنے کو اور دوسروں کو نجات دلوائے گا؟''

نیاز بڑی دیر تک سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ جب بختیار نے اپنا سوال دہرایا تو نیاز نے جواب دیا ''نہیں میں نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں ہیں۔''

جلادوں نے بڈھے کو تختے کی طرف گھسیٹا۔ کوئی مجمع سے چیخا۔ بڈھا جھک گیا، اپنی گردن بڑھا کر اپنا سفید بالوں والا سر تختے پر رکھ دیا۔

اس لمحے خواجہ نصرالدین درباریوں کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے آگے بڑے اور امیر کے سامنے آئے۔

''ولی نعمت!'' انہوں نے زور سے کہا تا کہ پورا مجمع سن سکے۔ ''حکم دیجئے کہ سزا روک دی جائے۔ خواجہ نصرالدین کو یہاں اور ابھی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔''

امیر نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ مجمع میں ہل چل ہوئی۔ امیر کے اشارے پر جلاد نے تیشہ

اپنے قدموں تک نیچا کرلیا۔

''شہنشاہ اعظم!'' خواجہ نصرالدین نے بلند آواز میں کہا۔''کیا یہ انصاف ہوگا کہ ان حقیر پناہ دینے والوں کو سولی دی جائے اور بڑا پناہ دینے والا کوئی سزا نہ پائے، وہ جس کے گھر میں خواجہ نصرالدین اس زمانے میں رہتے تھے اور اب بھی ہیں، جو ان کو کھانا دیتا ہے، ان کو انعام دیتا ہے اور ہر طرح سے ان کی خاطر مدارات کرتا ہے؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو'' امیر نے شان سے کہا''اگر ایسا پناہ دینے والا ہے تو انصاف کے مطابق اس کا سر سب سے پہلے قلم ہونا چاہئے۔لیکن ہمیں بتاؤ تو وہ کون ہے، مولانا حسین؟''

سارے مجمع میں چاؤں چاؤں ہونے لگی۔آگے جو لوگ تھے وہ پیچھے کے لوگوں کو بتانے لگے کہ امیر نے کیا کہا۔

''لیکن اگر امیر اعظم اس بڑے پناہ دینے والے کو سولی نہ دینا چاہیں، اگر امیر اس کو زندہ رکھنا چاہیں تو کیا ایسی صورت میں ان حقیر پناہ دینے والوں کو سولی دینا انصاف ہوگا؟'' خواجہ نصرالدین نے پوچھا۔

امیر نے اور زیادہ پریشان ہوکر جواب دیا''اگر ہم بڑے پناہ دینے والے کو سولی دینا نہ چاہیں تو واقعی ہمیں دوسروں کو آزاد کردینا چاہئے۔لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا مولانا حسین کہ ہمیں کون سا سبب بڑے پناہ دینے والے کو سولی دینے سے باز رکھ سکتا ہے۔ہم کو اس کا نام بتاؤ اور ہم فوراً اس کا سر گردن سے اڑادیں گے۔''

خواجہ نصرالدین مجمع کی طرف مڑے اور انہوں نے کہا:

''آپ نے امیر کے الفاظ سنے؟ بخارا کے حکمران نے فرمایا کہ اگر وہ بڑے پناہ دینے والے کو سولی نہیں دیتے جس کا نام میں ابھی ابھی بتاؤں گا تو ان تمام حقیر پناہ دینے والوں کو جو سولی پر کھڑے ہیں رہا کردیا جائے گا اور وہ اپنے اپنے گھر والوں سے ملیں گے۔میں نے سچ عرض کیا ہے نا، عالی جاہ؟''

''تم نے سچ کہا ہے، مولانا حسین'' امیر نے تصدیق کی۔''ہم قول دیتے ہیں اس لئے یہی ہوگا۔لیکن جلدی کرو اور بڑے پناہ دینے والے کو بتاؤ۔''

''آپ سن رہے ہیں نا؟'' خواجہ نصرالدین نے مجمع سے پوچھا۔''امیر نے قول دیا ہے۔''

انہوں نے گہری سانس لی۔انہوں نے دیکھا کہ ہزاروں آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

''بڑا پناہ دینے والا.....'' وہ رک گئے اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ بہت سے لوگوں نے ان کے چہرے پر سخت پریشانی اور کوفت کے آثار دیکھے۔ وہ پیاری دنیا، لوگوں اور اپنے پیارے سورج سے رخصت ہو رہے تھے۔

''جلدی کرو!'' امیر بے چینی سے چلایا۔''جلدی بتاؤ، مولانا!''

خواجہ نصرالدین نے پرعزم گونجتی ہوئی آواز میں کہا:

''بڑے پناہ دینے والے....آپ ہیں، اے امیر!''

اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنا عمامہ اتار کر پھینک دیا اور اپنی مصنوعی داڑھی نوچ ڈالی۔

سارا مجمع ہکا بکا رہ گیا، اس میں ایک لہر سی پیدا ہوئی اور پھر مکمل سناٹا چھا گیا۔ امیر کی آنکھیں نکل پڑیں، اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی لیکن کوئی آواز نہیں نکلی۔ درباری اس طرح کھڑے تھے جیسے پتھرا گئے ہوں۔

لیکن یہ خاموشی مختصر تھی۔

''خواجہ نصرالدین! خواجہ نصرالدین!'' مجمع میں غلغلہ مچ گیا۔

''خواجہ نصرالدین! درباریوں نے سرگوشی میں کہا۔

''خواجہ نصرالدین!'' ارسلان بیگ حیرت سے بولا۔

آخر کار امیر کے حواس اتنے بجا ہوئے کہ وہ بھی دھیمی آواز میں بڑبڑا سکا:

''خواجہ نصرالدین!''

''ہاں، بذات خود۔ اچھا تو عالیجاہ حکم دیجئے ان کو کہ یہ آپ کا بڑے پناہ دینے والے کی حیثیت سے سر قلم کر دیں! میں آپ کے محل میں رہتا تھا۔ میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا اور آپ سے انعامات حاصل کئے۔ میں آپ کا تمام امور میں خاص اور قریبی مشیر رہا۔ امیر، آپ پناہ دینے والے ہیں۔ حکم دیجئے کہ وہ آپ کا سر قلم کریں!''

خواجہ نصرالدین پکڑ لئے گئے۔ ان کے ہاتھ باندھ دئے گئے لیکن انہوں نے چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے زور سے کہا''امیر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجرموں کو رہا کر دیں گے! آپ سب نے

امیر کو قول دیتے سنا تھا!''

مجمع میں غل غپارہ ہونے لگا اور وہ آگے بڑھنے لگا۔ پہرے داروں کا تہرا حلقہ ان کو روکنے کے لئے پورا زور لگا رہا تھا۔ لوگ زیادہ زور زور سے چیخ رہے تھے:

''معتوبوں کو رہا کرو!''

''امیر نے قول دیا تھا!''

''رہا کرو!''

شور وغل بڑھ رہا تھا۔ پہرے داروں کا حلقہ ٹوٹنے لگا۔

بختیار نے جھک کر امیر سے کہا:

''آقائے نامدار، ان لوگوں کو آزاد کر دینا چاہئے ورنہ عام بغاوت ہو جائے گیا۔''

امیر نے سر ہلا دیا۔

''امیر اپنے قول پر قائم ہیں!'' بختیار نے چلا کر کہا۔

پہرے داروں نے راستہ دے دیا اور معتوب لوگ فوراً مجمع میں غائب ہو گئے۔

خواجہ نصر الدین کو محل لے جایا گیا۔ بہت سے لوگ مجمع میں ان کے پیچھے روتے چلاتے رہے:

''خدا حافظ خواجہ نصر الدین! الوداع، پیارے، شریف دل خواجہ نصر الدین! آپ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے!''

خواجہ اپنا سر اونچا کئے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے چہرے سے نڈرپن کا اظہار ہوتا تھا۔ پھاٹک پر وہ مڑے، رخصت ہوتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ مجمع نے ایک زور کا نعرہ لگایا۔

امیر جلدی جلدی اپنی پالکی میں بیٹھ گیا اور شاہی جلوس واپس ہو گیا۔

34

خواجہ نصر الدین کا فیصلہ کرنے کے لئے مخصوص دیوان طلب کیا گیا۔

جب وہ سخت پہرے میں ہتھکڑی پہنے داخل ہوئے تو سارے درباریوں نے آنکھیں جھکا لیں۔ ان کو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے شرم آتی تھی۔ دانا بھی تیوریاں چڑھائے اپنی داڑھیاں سہلا رہے

تھے۔امیر نے بھی منہ موڑ کر گہری سانس لی اور اپنا گلا صاف کرنے لگا۔

لیکن خواجہ نصرالدین بری جرأت کے ساتھ نگاہ ملا کر سب کو دیکھ رہے تھے۔اگر ان کے ہاتھ پیچھے نہ بندھے ہوتے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ملزم وہ ہیں بلکہ یہ سب لوگ مجرم نظر آتے تھے جو ان کے سامنے بیٹھے تھے۔

بغداد کا دانا اصل مولانا حسین جو آخر کار اپنی قید سے نجات پا چکا تھا اس مجلس میں دوسرے درباریوں کے ساتھ حاضر تھا۔خواجہ نصرالدین نے اس کی طرف دوستانہ انداز میں آنکھ ماری جس پر بغداد کا دانا اپنی جگہ پر کسمسایا اور غصے میں گہری سانس لی۔

فیصلہ ہونے میں دیر نہیں لگی۔خواجہ نصرالدین کو سزائے موت دی گئی۔صرف یہ طے کرنا باقی رہ گیا کہ ان کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا جائے۔

''شہنشاہ اعظم'' ارسلان بیگ نے کہا ''میرے خیال میں مجرم کو نوکیلے ستون پر بٹھا کر مارنا چاہئے تاکہ اس کی زندگی کا خاتمہ سخت کرب کی حالت میں ہو۔''

خواجہ نصرالدین نے رویاں بھی نہیں ہلایا۔وہ خوش خوش مسکرا رہے تھے۔انہوں نے اپنا چہرہ ایک سورج کی کرن کی طرف کر لیا جو اوپر کی کھلی ہوئی کھڑکی سے ہال میں آ رہی تھی۔

''نہیں'' امیر نے قطعی طور پر کہا ''ترکی کے سلطان اس کافر کو نوکیلے ستون پر بٹھا کر ختم کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔غالباً وہ اس طرح کی موت سے بچنے کی صورت جانتا ہے،نہیں تو بھلا یہ سلطان کے ہاتھ سے زندہ جان نکل سکتا تھا!''

بختیار نے مشورہ دیا کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے۔

''یہ سچ ہے کہ بہت ہی آسان موت ہوگی'' اس نے کہا ''لیکن یہ سب سے یقینی بھی ہے۔''

''نہیں!'' امیر نے کہا ''خلیفہ بغداد نے اس کا سر قلم کروا دیا لیکن وہ ابھی تک زندہ ہے۔''

یکے بعد دیگرے درباری اٹھ اٹھ کر اپنی تجویزیں پیش کرنے لگے۔کوئی کہتا کہ ان کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے تو کوئی یہ مشورہ دیتا کہ ان کی کھال کھنچوا لی جائے۔امیر نے یہ تمام تجویزیں مسترد کر دیں۔وہ خواجہ نصرالدین کو دیکھتا رہا تھا۔اس نے خواجہ کے چہرے پر خوف کی کوئی نشانی نہ دیکھ کر یہ سمجھا کہ ان طریقوں کے ناکافی ہونے کا یہی ثبوت ہے۔

درباری لاچار ہوکر خاموش ہوگئے۔امیر کے چہرے پر بے صبری اور غصے کے آثار نظر آنے لگے۔

بغداد کا دانا اٹھا۔ چونکہ وہ پہلی مرتبہ امیر کے سامنے زبان کھولنے جارہا تھا اس لئے اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے مشورہ کو تول لیا تھا تا کہ اپنے عقل ودانش کی برتری کا مظاہرہ کر سکے۔

''جہاں پناہ! اگر یہ مجرم ابھی تک تمام سزاؤں سے صحیح سلامت بچ نکلتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کو ارواح خبیثہ سے، تاریکی کی ایسی بدروحوں سے مدد ملتی ہے جن کا نام امیر کی موجودگی میں لینا گستاخی ہوگی؟''

یہ کہہ کر دانا نے اپنے شانوں پر دعا پڑھ کر پھونکی جس کی پیروی خواجہ نصرالدین کے سوا سب نے کی۔

''مجرم کے بارے میں تمام معلومات پر غور وخوض کرنے اور تولنے کے بعد'' دانا نے اپنی بات جاری رکھی ''ہمارے امیر نے اس کو موت کی سزا دینے کے تمام طریقوں کو اس خوف سے مسترد کر دیا ہے کہ ارواح خبیثہ پھر مجرم کی مدد کریں گی اور وہ منصفانہ سزا سے بچ جائے گا۔لیکن سزائے موت کا ایک اور طریقہ بھی ہے جو مبینہ مجرم پر نہیں آزمایا گیا ہے اور وہ ہے۔ڈبو دینا!''

بغداد کے دانا نے فخر سے سر اٹھا کر سارے مجمع کو دیکھا۔

خواجہ نصرالدین ہلکے سے چونک پڑے اور امیر نے اس حرکت کو دیکھ لیا ''اچھا! تو یہ تھا اس کا راز!''

اس دوران میں خواجہ نصرالدین سوچ رہے تھے:

''یہ بڑی اچھی علامت ہے کہ ان لوگوں نے ارواح خبیثہ کا ذکر چھیڑ دیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی امید نے بالکل سانس نہیں توڑ دی ہے۔''

''میں نے جو کچھ سنا اور پڑھا ہے اس سے مجھے علم ہے'' دانا نے اپنی بات جاری رکھی ''کہ بخارا میں ایک مقدس تالاب ہے۔جس کو شیخ احمد کا تالاب کہتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ارواح خبیثہ اس تالاب کے قریب نہیں پھٹک سکتیں۔اس لئے جہاں پناہ، اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجرم کو کافی دیر تک اس مقدس پانی میں ڈبوئے رکھا جائے۔اس کے بعد وہ مرجائے گا۔''

''یہ مشورہ انعام کے قابل ہے!'' امیر نے کہا۔

خواجہ نصرالدین نے مولانا حسین سے مخاطب ہوکر ملامت آمیز لہجے میں کہا:

''مولانا حسین! جب تم میرے بس میں تھے تو کیا میں نے تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا تھا؟ اس کے بعد انسان کیسے کسی کے احسان کا اعتبار کر سکتا ہے!''

یہ طے کیا گیا کہ خواجہ نصر الدین کو غروب آفتاب کے بعد شیخ احمد کے مقدس تالاب میں سر عام ڈبویا جائے گا۔ اس خیال سے کہ وہ راستے میں بھاگ نہ سکیں ان کو ایک چمڑے کے تھیلے میں تالاب تک لے جایا جائے گا اور اسی میں ان کو ڈبو دیا جائے گا۔

....سارے دن بڑھئیوں کے بسولے تالاب کے کنارے گونجتے رہے جہاں ایک پلیٹ فارم بنایا جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ امیر کو وہاں اس پلیٹ فارم کی کیوں ضرورت ہے لیکن ان کے لئے چارہ ہی کیا تھا جب ہر بڑھئی کے سر پر ایک پہرے دار سوار تھا؟ وہ خاموشی سے کام کر رہے تھے۔ ان کے چہرے افسردہ اور ملول تھے۔ جب کام ختم ہو گیا تو ان کو جو معمولی اجرت دی جا رہی تھی وہ اس سے انکار کر کے سر جھکائے وہاں سے چلے گئے۔

پلیٹ فارم اور تالاب کا وہ کنارا جس پر پلیٹ فارم تھا قالینوں سے ڈھک دئے گئے۔ سامنے کا کنارا عام لوگوں کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

جاسوسوں نے مخبری کی کہ سارے شہر میں بڑا ہنگامہ ہے۔ احتیاط کے لئے ارسلان بیگ نے تالاب کے چاروں طرف بے شمار سپاہی تعینات کر دئے اور توپیں لگا دیں۔ اس ڈر سے کہ مبادا لوگ خواجہ نصر الدین کو راستے میں نہ چھڑا لیں ارسلان بیگ نے چار بورے چیتھڑوں سے بھروا لئے۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ ان چار بوروں کو عام سڑکوں سے علانیہ تالاب تک بھیجے گا اور جس بورے میں خواجہ نصر الدین ہوں گے اس کو ویران گلیوں سے لایا جائے گا۔ اس نے اپنے پرفن منصوبے میں یہ اضافہ کیا کہ نقلی بوروں پر تو آٹھ آٹھ پہرے دار رکھے اور اصلی کے ساتھ صرف تین۔

''میں تمہیں تالاب سے ہرکارہ بھیجوں گا'' ارسلان بیگ نے پہرے داروں سے کہا ''اور تم نقلی بورے فوراً یکے بعد دیگرے روانہ کر دینا اور پانچواں جس میں مجرم ہو گا ذرا بعد میں اس طرح بھیجنا کہ لوگوں کی توجہ اس طرف نہ جائے، اس وقت جب کہ پھاٹک کا مجمع نقلی بوروں کے پیچھے ہو لے، سمجھے نا؟ یاد رکھو کہ یہ تمہارے سر دھڑ کا سوال ہے۔''

شام کو نقاروں کی گونج نے بازار ختم ہونے کا اعلان کیا۔ ہر طرف سے لوگوں کا سیلاب امنڈ کر

تالاب کی طرف چلا۔ جلد ہی امیر بھی اپنے ماہی مراتب کے ساتھ پہنچ گیا۔ پلیٹ فارم پر اور اس کے چاروں طرف مشعلیں جلا دی گئیں۔ ان کی لویں ہوا میں پھن پھنا اور لہرا رہی تھیں اور پانی پر خونیں شعاعیں ڈال رہی تھی۔ سامنے والا کنارا تاریکی میں غلطاں تھا۔ پلیٹ فارم سے مجمع تو نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے چلنے پھرنے کی ہل چل تو سنائی دے رہی تھی جو رات کی ہوا کے جھونکوں میں غیر واضح اور بے چین آوازوں کا اضافہ کر رہی تھی۔

بختیار نے پاٹ دار آواز میں خواجہ نصر الدین کی سزائے موت کے لئے امیر کا فرمان پڑھا۔ اس لمحے ہوا بھی ساکن ہوگئی اور ایسی مکمل خاموشی چھا گئی کہ تقدس مآب امیر کا دل بھی کانپ اٹھا۔ پھر ہوا نے آہ بھری اور اس کے ساتھ ہزاروں سینوں سے بھی آہ نکلی۔

''ارسلان بیگ'' امیر گھبرا کر کہا ''دیر کیوں ہو رہی ہے؟''

''عالی جاہ! میں ہرکارہ روانہ کر دیا ہے۔''

اچانک اندھیرے سے غل غپاڑے اور ہتیاروں کی جھنکار کی آواز آئی۔ کہیں لڑائی چھڑ گئی تھی۔ امیر اچھل پڑا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ایک منٹ بعد پلیٹ فارم کے سامنے روشنی کے حلقے میں آٹھ پہرے دار خالی ہاتھ آئے۔

''مجرم کہاں ہے؟'' امیر گرجا۔ ''انہوں نے پہرے داروں سے چھین لیا! وہ بھاگ نکلا! یہ سب تیری وجہ سے ہوا، ارسلان بیگ!''

''عالی جاہ!'' ارسلان بیگ نے جواب دیا۔ ''آپ کا ناچیز غلام یہ سب پہلے سے جانتا تھا۔ بورا تو پرانے چیتھڑوں سے بھرا تھا۔''

سامنے والے کنارے سے پھر لڑائی کی آواز آ رہی تھی۔ ارسلان بیگ نے جلدی جلدی امیر کو اطمینان دلایا:

''آقائے نامدار! ان کو بورا لے جانے دیجئے۔ یہ بھی پرانے چیتھڑوں سے بھرا تھا۔''

پہلا بورا تو پہرے داروں سے چائے خانے کے مالک علی اور اس کے دوستوں نے چھینا تھا اور دوسرا یوسف کی قیادت میں آہنگروں نے۔ پھر کمہاروں نے تیسرا بورا چھینا۔ لیکن اس میں صرف چیتھڑے بھرے تھے۔ چوتھے بورے کو پہرے دار بلا روک ٹوک لے گئے۔ پہرے داروں نے اس کو مشعلوں سے

روشن پانی پر سارے مجمع کے سامنے الٹ دیا۔ وہ چیتھڑوں سے بھرا تھا۔

پریشان اور متحیر مجمع خاموش کھڑا تھا۔ یہ تھا ارسلان بیگ کا منصوبہ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ تذبذب کا نتیجہ لاچاری ہوتا ہے۔

اب پانچویں بورے سے نبٹنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس دوران میں ان پہرے داروں کو جو اسے لا رہے تھے راستے میں دیر ہو چکی تھی اور وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔

35

جب پہرے داروں نے خواجہ کو کال کوٹھری سے نکالا تو انہوں نے کہا:

''تو تم مجھ کو یہاں سے اپنی پیٹھ پر لے جاؤ گے؟ افسوس کہ میرا گدھا یہاں نہیں ہے ورنہ وہ تو ہنستے ہنستے دم توڑ دیتا۔''

''بند کر اپنی زبان! تو خود روئے گا!'' پہرے داروں نے ڈانٹ بتائی۔ وہ اس کو نہیں معاف کر سکتے تھے کہ خواجہ نے خود اپنے آپ کو امیر کے حوالے کر دیا تھا۔

انہوں نے تنگ بورے کو پھیلا کر اس میں خواجہ نصر الدین کو ٹھونسنا شروع کر دیا۔

''ارے شیطان کے بچو!'' خواجہ نصر الدین جو تہرے ہو چکے تھے چلائے ''تم کو اس سے بڑا بورا نہیں ملا؟''

''چپ رہ!'' پہرے داروں نے ہانپتے اور پسینے پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ''زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ دیکھ حرامزادے، زیادہ پھیلنے کی کوشش نہ کر، نہیں تو ہم تیرے گھٹنے پیٹ میں اتار دیں گے!''

اب ہاتھا پائی شروع ہو گئی جس کی وجہ سے محل کے سارے ملازم جمع ہو گئے اور بڑی کشمکش کے بعد پہرے دار خواجہ نصر الدین کو بورے میں ٹھونس کر اس کو رسی سے باندھ سکے۔ بورے میں بڑی امس، تاریکی اور بدبو تھی۔ خواجہ نصر الدین کے دل پر ایک سیاہ غبار چھا گیا۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے قسمت اور ہمہ گیر طاقت رکھنے والے موقع سے اپیل کی۔

''اے قسمت، جس نے ماں کی طرح مجھے پالا ہے اور اے ہمہ گیر طاقت رکھنے والے موقع جس نے ابھی تک مجھے باپ کی طرح بچایا ہے تم کہاں ہو؟ تم خواجہ نصر الدین کی مدد کو جلدی سے کیوں نہیں

آتے؟اے قسمت!اے ہمہ گیر طاقت رکھنے والے موقع!''

اس دوران میں پہرے دار تالاب کا آدھا فاصلہ طے کر چکے تھے۔وہ باری باری بورے کو لے جا رہے تھے۔دوسو قدم کے بعد بدلی کر لیتے تھے۔خواجہ نصرالدین رنج وغم کے ساتھ مختصر وقفوں کو گن رہے تھے اور پتہ چلا رہے تھے کہ کتنا فاصلہ طے ہو چکا ہے اور کتنا باقی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ قسمت اور موقع اس کا کبھی ساتھ نہیں دیتے جو عمل کرنے کے بجائے صرف روتا پیٹا اور فریاد کرتا رہتا ہے۔وہی آدمی منزل تک پہنچتا ہے جو آگے بڑھتا رہتا ہے۔اگر اس کے پیر کمزور ہوں اور کام نہ دیں تو اسے چاروں ہاتھوں پیروں پر آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔تو پھر ضرور اس کو اس کو رات میں دور شعلہ ور الاؤ اور صحیح راستے پر چلنے والا کارواں نظر آئے گا اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے اس کو فاضل اونٹ بھی مل جائے گا۔جب کہ وہ آدمی جو سڑک کے کنارے بیٹھ کر یاس سے ہار مان لے گا۔اس کے لئے سنگ دل پتھروں میں کوئی ہمدردی نہ پیدا ہوگی وہ چاہے جتنا روئے اور فریاد کرے۔وہ ریگستان میں پیاسا مر جائے گا،اس کی لاش بدبودار لکڑ بگھوں کی خوراک بن جائے گی اور اس کی ہڈیاں تپتی ہوئی ریت میں دفن ہو جائیں گی۔کتنے ہی آدمی وقت آنے سے پہلے مر گئے کیونکہ ان میں زندہ رہنے کا عزم مضبوط نہ تھا! خواجہ نصرالدین کسی حقیقی انسان کے لئے ایسی موت باعث شرم سمجھتے تھے۔

''نہیں'' وہ دانت بھینچ کر اپنے آپ سے بار بار کہہ رہے تھے''نہیں،آج مجھے نہیں مرنا چاہئے!میں مرنا نہیں چاہتا!''

لیکن وہ کر کیا سکتے تھے۔وہ تہرے گڑ مڑائے اور بورے میں اس طرح ٹھونسے ہوئے تھے کہ ہلنا بھی ناممکن تھا۔ان کے گھٹنے اور کہنیاں جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔صرف ان کی زبان آزاد تھی۔

''ارے سور ماؤ!''انہوں نے اپنے بورے کے اندر سے کہا۔''ذرا رکو،میں مرنے سے پہلے دعا کرنا چاہتا ہوں تا کہ اللہ مجھ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔''

پہرے داروں نے بوراز مین پر رکھ دیا۔

''اچھا چل دعا کر۔لیکن ہم تجھ کو بورے سے باہر نہیں نکالیں گے۔بورے کے اندر ہی دعا کر۔''

''ہم کہاں ہیں؟''خواجہ نصرالدین نے پوچھا۔''مجھے یہ جاننا چاہئے کیونکہ تمہیں میرا منہ قریب ترین مسجد کی طرف کرنا پڑے گا۔''

''ہم قرشی دروازے کے قریب ہیں۔ یہاں تو چاروں طرف مسجدیں ہی مسجدیں ہیں۔ جلدی سے دعا کر۔ ہم زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے۔''

''شکریہ، پاکباز سورماؤ'' خواجہ نصرالدین نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔

ان کو کیا توقع تھی؟ یہ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے سوچا ''میں چند منٹ کی مہلت حاصل کرلوں اور پھر دیکھا جائے گا۔ شاید کچھ ہو ہی جائے....''

انہوں نے زور زور سے دعا شروع کی لیکن ساتھ ہی پہرے داروں کی باتیں بھی سنتے گئے۔

''ہم کیسے یہ نہ سمجھ پائے کہ نیا نجومی خواجہ نصرالدین ہے؟'' پہرے دار افسوس کر رہے تھے۔ ''اگر ہم اس کو پہچان کر پکڑ لیتے تو امیر سے ہمیں بڑا انعام ملتا۔''

وہ ہمیشہ کی طرح سوچ رہے تھے کیونکہ حرص اور لالچ پر تو ان کی زندگی کا دارومدار تھا۔ خواجہ نصرالدین نے بڑی تیزی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھایا۔ ''مجھے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ وہ بورے کو چھوڑ کر چلے جائیں خواہ تھوڑی دیر کے لئے ہی کیوں نہ ہو....اس وقت میں رسی توڑ سکوں گا یا شاید کوئی ادھر سے گذرے اور مجھ کو چھڑا لے۔''

''دعا جلدی ختم کر'' ایک پہرے دار نے بورے پر لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''سنتا ہے نا؟ اب زیادہ دیر نہیں انتظار کر سکتے۔''

''بس ایک منٹ اور، بہادر سورماؤ! مجھے اللہ سے بس ایک اور التجا کرنا ہے۔ اے پروردگار، رحیم و کریم! میری یہ دعا قبول کر لے کہ جو آدمی میرے دفن کئے ہوئے دس ہزار تانگے پائے وہ ان میں سے ایک ہزار مسجد لے جا کر ملا کر دے اور اس سے کہے کہ وہ میرے لئے پورے سال دعا کرے۔''

دس ہزار تانگوں کا نام سنتے ہی پہرے دار خاموش ہو گئے۔ حالانکہ خواجہ نصرالدین بورے سے دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن وہ ٹھیک ٹھیک بتا سکتے تھے کہ ان کے چہروں کا کیا رنگ تھا، وہ کس طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر کہنیاں مار رہے تھے۔

''اب مجھے اٹھاؤ'' خواجہ نصرالدین نے بڑے عجز سے کہا ''میں اپنی روح خدا کے سپرد کرتا ہوں۔''

پہرے دار تذبذب میں پڑ گئے۔

''ہم ذرا دیر آرام کر لیں'' ایک پہرے دار نے چالاکی سے کہا۔ ''ارے، خواجہ نصرالدین یہ نہ سمجھنا

کہ ہم سنگ دل اور برے لوگ ہیں۔ فرض سے مجبور ہیں۔ اس لئے تمہارے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔ اگر ہم امیر کی تنخواہ کے بغیر اپنے گھروں میں رہ سکتے تو ہمیں تو کو چھوڑ دینے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا...''

''ارے، کیا کہہ رہے ہو؟'' دوسرے پہرے درنے پریشان ہوکر چپکے سے کہا۔ ''اگر ہم اس کو چھوڑ دیں تو امیر ہمارے سر قلم کروالیں گے۔''

''چپ رہو'' پہلے پہرے دار نے اس کو سرگوشی میں ڈانٹا۔ ''ہم تو اس کی رقم کو ہتھیانا چاہتے ہیں۔''

خواجہ نصرالدین ان کی کھسر پھسر تو نہیں سن سکے لیکن یہ تو سمجھ ہی گئے کہ کس کے بارے میں یہ سب ہو رہا ہے۔

''مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، سور ماؤ'' خواجہ نصرالدین نے ریاکاری سے آہ بھر کر کہا۔ ''میں کسی کو کیا برا سمجھوں گا، میں خود بڑا گنہ گار ہوں۔ اگر اللہ نے عقبی میں میرے گناہ معاف کر دئے تو میں اس کے تخت کے نیچے تو لوگوں کی بخشائش کے لئے دعا کروں گا۔ تم کہتے ہو کہ اگر امیر کی تنخواہ کا سوال نہ ہوتا تو تم مجھے بورے سے نکال دیتے۔ سوچو تو کیا کہہ رہے ہو! تم امیر کے حکم کی خلاف ورزی کرو گے جو بڑا گناہ ہے! نہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری وجہ سے اپنی روح کو گناہوں سے آلودہ کرو۔ بورا اٹھاؤ اور مجھے تالاب تک لے جاؤ۔ امیر اور اللہ کی مرضی پوری ہونے دو!''

پہرے داروں نے گھبرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں خواجہ نصرالدین کو اس اچانک اور ناوقت توبہ کے لئے کوس رہے تھے۔

اب تیسرا پہرے دار جو ابھی تک خاموش تھا اور کوئی اچھی ترکیب سوچ رہا تھا آخر کار بولا:

''موت کے وقت کسی آدمی کو اپنے گناہوں اور غلطیوں پر توبہ کرتے دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف آنکھ ماری۔ ''لیکن میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے مدتوں ہوئے توبہ کر لی ہے اور جب سے پاکیزہ زندگی گذار رہا ہوں۔ ایسی توبہ جس کے ساتھ کوئی عمل نہ ہو اللہ کو خوش نہیں کر سکتی'' اس نے اپنی بات جاری رکھی جب کہ دوسرے دو پہرے دار اپنے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے ہنسی روک رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ پہرے دار بڑا جواری اور عیاش ہے۔ ''اسی لئے میں اپنی توبہ کو اچھے اور پاک کاموں سے مضبوط کرتا رہتا ہوں۔ میں اپنے گاؤں میں ایک بڑی مسجد بنوا رہا

ہوں جس کے لئے میں اور میرا خاندان بھوکا تک رہتا ہے۔''

اب ایک پہرے دار سے ضبط نہ ہو سکا اور ہنسی سے بے اختیار ہو کر وہ تھوڑی دور چلا گیا۔

''میں ایک ایک پیسہ بچاتا ہوں'' پہرے دار نے اپنی بات جاری رکھی ''پھر بھی مسجد کی تعمیر اتنی سست رفتاری سے ہو رہی ہے کہ میرے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ چند ہی دن ہوئے میں نے اپنی گائے بیچ دی ہے اور ممکن ہے کہ مجھے اپنا آخر جوڑا جوتا بیچنا پڑے۔ میں ننگے پیر رہنے کے لئے تیار ہوں اگر میں اس کام کی تکمیل کر سکوں جو میں نے شروع کیا ہے۔''

خواجہ نصر الدین نے بورے کے اندر سے سسکی بھری۔ پہرے داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کو کامیابی ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنے چالاک ساتھی کے کہنی ماری کہ جلدی کرے۔

''کاش کہ مجھے کوئی ایسا مل جاتا جو اس مسجد کی تکمیل کے لئے آٹھ دس ہزار تانگے دے دیتا!'' اس نے کہا۔ ''میں اس سے قسم کھا کر یہ وعدہ کرتا کہ پانچ سال یا دس سال تک بھی اس کا نام خوشبویات کے مرغولوں میں لپٹا مسجد کی محرابوں سے نکلتا اور تخت خداوندی کی طرف بلند ہوتا!''

دوسرا پہرے دار بولا:

''ارے میرے پاکباز ساتھی! میرے پاس دس ہزار تانگے تو نہیں ہیں لیکن تم میری ساری پونجی قبول کرو گے جو پانچ سو تانگے ہے۔ یہ میری حقیر پیش کش مسترد نہ کرو کیونکہ میں بھی اس پاک کام میں حصہ لینا چاہتا ہوں۔''

''اور میں بھی'' تیسرے نے ہنسی کو دبا کر، ہکلاتے اور کانپتے ہوئے کہا ''میرے پاس تین سو تانگے ہیں....''

''اے پاکباز انسان، اے مومن!'' خواجہ نصر الدین رونی آواز میں چلائے۔ ''کاش کہ میں تمہاری قبا کا دامن چوم سکتا! میں بڑا گنہ گار ہوں لیکن میرے ساتھ عنایت کرو اور میرا تحفہ مسترد نہ کرو۔ میرے پاس دس ہزار تانگے ہیں۔ جب میں دھوکہ دے کر امیر کی خدمت میں مقبول ہو گیا تو انہوں نے اکثر مجھے اشرفیوں اور چاندی کے سکوں کی تھیلیاں عطا کیں۔ میں نے دس ہزار تانگے بچا کر ان کو چھپا دیا۔ ارادہ تھا کہ بھاگتے وقت ان کو نکال لوں گا۔ چونکہ میں قرشی دروازے سے بھاگنا چاہتا تھا اس لئے میں قرشی قبرستان میں ایک پرانی لوح مزار کے نیچے ان کو دفن کر دیا تھا۔''

''قرشی قبرستان میں!'' سب پہرے دار چلائے۔''تب تو یہ رقم کہیں قریب ہی ہے۔''

''ہاں، اب ہم قبرستان کے شمالی سرے پر ہیں اور اگر کوئی....''

''ہم مشرقی سرے پر ہیں۔تمہاری رقم کہاں....کہاں دفن ہے؟''

''وہ قبرستان کے مغربی سرے پر دفن ہے'' خواجہ نصرالدین نے کہا۔''لیکن ایمان دار پہرے دارو! پہرے یہ قسم کھاؤ کہ واقعی دس سال تک مسجد میں میرے نام پر روزانہ فاتحہ پڑھا جائے گا۔''

''میں قسم کھاتا ہوں!'' وہ پہرے دار چلایا جو بہت بے چین ہو رہا تھا۔''میں خدا اور اس کے پیغمبر کی قسم کھاتا ہوں! اب جلدی بتاؤ کہ رقم کہاں گڑی ہے؟''

خواجہ نصرالدین نے تھوڑا سا توقف کیا۔''اگر انہوں نے مجھ کو پہلے تالاب پر لے جانے اور رقم کل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا تو کیا ہوگا؟'' انہوں نے سوچا۔''نہیں، یہ نہیں ہوگا۔ان پر تو حرص اور بے صبری کا دیو سوار ہے۔ان کو یہ ڈر ہوگا کہ شاید ان سے پہلے ہی کوئی اچک لے جائے۔پھر ان کو ایک دوسرے پر بھی تو اعتبار نہیں ہے۔اچھا تو کون سی جگہ بتانا چاہئے جہاں وہ امکانی طور پر زیادہ سے زیادہ دیر تک کھودتے رہیں؟''

پہرے دار بورے پر جھکے کھڑے تھے۔خواجہ نصرالدین ان کے ہانپنے کی آواز سن رہے تھے جیسے وہ کہیں دوڑ کر آ رہے ہوں۔

''قبرستان کے مغربی سرے پر تین پرانے مقبرے ایک مثلث کی صورت میں ہیں'' خواجہ نصرالدین نے کہا۔''ان میں سے ہر ایک کے نیچے میں نے تین ہزار سو تینتیس اور ایک تہائی تانگہ گاڑے ہیں۔''

''مثلث میں'' پہرے داروں نے اس طرح ایک ساتھ دہرایا جیسے کسی عالم سے کوئی آیت حفظ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔''ہر ایک کے نیچے تین ہزار تین سو تینتیس اور ایک تہائی تانگہ....''

انہوں نے یہ طے کیا کہ دو تو رقم تلاش کرنے جائیں گے اور تیسرا پہرے پر رہے گا۔اس بات پر شاید خواجہ نصرالدین ناامید ہو جاتے اگر ان کو انسانی افعال کی پیش بینی کا تجربہ نہ ہوتا۔ان کو یقین تھا کہ تیسرا پہرے دار بھی زیادہ دیر تک پہرے پر نہیں رہے گا اور انہوں نے غلطی نہیں کی تھی۔تنہائی میں پہرے دار بے چینی سے آہیں بھرنے، کھانسنے اور ٹہلنے لگا۔اس کے اسلحہ بج رہے تھے۔ان آوازوں سے خواجہ

نصرالدین اس کے خیالات کا اندازہ لگا رہے تھے۔ پہرے دار اپنے حصے کے تین ہزار تین سو تینتیس اور ایک تہائی تانگوں کے لئے پریشانی میں مبتلا تھا۔خواجہ نصرالدین صبر سے انتظار کر رہے تھے۔

''ان کو بڑی دیر لگ رہی ہے'' پہرے دار نے کہا۔

''شاید وہ رقم کو کسی دوسری جگہ دفن کر رہے ہوں اور کل تم سب مل کر اس کو لے جاؤ گے'' خواجہ نصرالدین نے کہا۔

یہ الفاظ کام کر گئے۔ پہرے دار کی سانس زور سے چلنے لگی اور پھر اس نے جماہی لینے کی بناوٹ کی۔

''میں مرنے سے پہلے تزکیہ روح کے لئے کوئی کہانی سننا چاہتا ہوں'' خواجہ نصرالدین اپنے بورے سے بولے۔''شاید تمہیں کوئی یاد ہو، مہربان پہردار؟''

''نہیں!'' پہرے دار نے غصے میں کہا''میں کوئی ایسی کہانی نہیں جانتا۔اس کے علاوہ میں تھک گیا ہوں۔ میں جا کر گھاس پر لیٹتا ہوں۔''

لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ سخت اور پتھریلی زمین پر اس کے قدموں کی آواز دور تک گونجتی ہے۔ پہلے تو وہ آہستہ آہستہ چلا۔ پھر خواجہ نصرالدین نے تیز چلنے کی آواز سنی۔اب پہردار دوڑنے لگا۔

اب عمل کا وقت آ گیا تھا۔لیکن خواجہ نصرالدین ادھر ادھر بے سود لنڈھک رہے تھے۔رسی کسی طرح نہیں ٹوٹ رہی تھی۔

''راہ گیر!'' خواجہ نصرالدین نے دعا کی۔''اے قسمت، کوءراہ گیر بھیج دے!''

اور قسمت نے ایک راہ گیر بھیج دیا۔

قسمت اور مناسب موقع ہمیشہ اس کی مدد کرتے ہیں جو مکمل عزم رکھتا ہے اور آخر تک ہاتھ پاؤں مارتا ہے (ہم یہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں لیکن دھرانے سے حقائق کی اہمیت نہیں کم ہوتی)۔خواجہ نصرالدین پوری طاقت سے اپنی زندگی بچانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور قسمت مدد سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

راہ گیر آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔خواجہ نصرالدین نے اس کے قدموں کی آواز سے بھانپ لیا کہ وہ لنگڑا تھا اور معمر بھی کیونکہ وہ ہانپ رہا تھا۔

بورا سڑک کے بیچوں بیچ پڑا تھا۔راہ گیر رک گیا۔اس نے بڑی دیر تک بورے کو دیکھا اور اس میں دو

تین بار چھڑی گڑوئی۔

''بورے میں کیا ہوسکتا ہے؟ یہ کہاں سے آیا؟'' چیچاتے ہوئے لہجے میں راہ گیر نے کہا۔

مرحبا! خواجہ نصرالدین نے جعفر سودخور کی آواز پہچان لی۔ اب ان کو اپنے بچ نکلنے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ بس، پہرے دار ذرا جلدی نہ لوٹیں۔

وہ اس طرح آہستہ سے کھانسے کہ سودخور گھبرائے نہیں۔

''اچھا، اس کے اندر آدمی ہے!'' جعفر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں، واقعی آدمی ہے'' خواجہ نصرالدین نے اپنی آواز بدلتے ہوئے سکون سے کہا۔ ''یہ کوئی عجیب بات ہے؟''

''یہ میرا معاملہ ہے، اپنے راستے جاؤ اور اپنے سوالوں سے مجھے پریشان نہ کرو۔''

خواجہ نصرالدین سمجھ گئے تھے کہ اب سودخور کو اشتیاق پیدا ہوگیا ہے اور وہ جائے گا نہیں۔

''یہ واقعی غیر معمولی بات ہے'' سودخور نے کہا ''کہ آدمی بورے میں بند ہو۔ کیا تم کو کسی نے زبردستی اس میں ٹھونسا ہے؟''

''زبردستی؟'' خواجہ نصرالدین نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں بورے میں زبردستی ٹھونسے جانے کے لئے چھ سوتانگے دیتا؟''

''چھ سوتانگے! تم نے یہ رقم کیوں دی؟''

''راہ گیر! میں تم کو سارا قصہ بتادوں گا بشرطیکہ تم اس کو سننے کے بعد اپنی راہ لگو اور مجھے زیادہ نہ چھیڑو۔ یہ بورا ایک عرب کا ہے جو ہمارے شہر بخارا میں رہتا ہے۔ اس بورے میں تمام بیماریوں اور جسمانی نقائص کو اچھا کرنے کی صفت ہے۔ اس کا مالک صرف بڑی رقم پر اس کو مستعار دیتا ہے اور وہ بھی سب کو نہیں۔ میں لنگڑا، کبڑا اور کانا تھا۔ میں شادی کرنا چاہتا تھا، میرے ہونے والے سسر نے یہ نہیں چاہا کہ میری دلہن کی نظر ان نقائص پر پڑے اس لئے وہ مجھے اس عرب کے پاس لے گئے جس نے مجھ کو یہ بورا چھ سوتانگے کے عوض میں چار گھنٹے کے لئے کرائے پر دیا ہے۔

''چونکہ یہ بورا صرف قبرستانوں کے قریب ہی اپنی معجزنما مسیحائی دکھاتا ہے اسی لئے میں غروب آفتاب کے بعد قرشی کے اس پرانے قبرستان آیا ہوں۔ میرے سسر نے جو میرے ساتھ آئے تھے رسی

سے بورے کو باندھ دیا اور چلے گئے کیونکہ کسی دوسرے کی موجودگی میں علاج ناممکن ہے۔ بورے کے مالک عرب نے مجھے متنبہ کر دیا ہے کہ جیسے ہی میں تنہا ہوں گا تین جن خوب شور مچاتے اور تانبے کے پرکھڑ کھڑاتے نمودار ہوں گے۔ وہ انسانوں کی زبان میں مجھ سے پوچھیں گے کہ قبرستان کے کس حصے میں دس ہزار تانگے دفن ہیں۔ اس کے جواب میں مجھے یہ پراسرار منتر پڑھنا چاہئے: 'جس کے پاس تانبے کی ڈھال ہوتی ہے اس کا دماغ بھی تانبے کا ہوتا ہے۔ عقاب کی جگہ الو بیٹھا ہے۔ ارے جنو، تم وہ ڈھونڈھ رہے ہو جو تم نے چھپایا نہیں تھا۔ اس لئے میرے گدھے کی دم چوم لو!،

''سب کچھ عرب کے کہنے کے مطابق ہوا۔ جنوں نے آ کر مجھ سے پوچھا کہ دس ہزار تانگے کہاں دفن ہیں۔ میرا جواب سن کر وہ بھڑک اٹھے اور انہوں نے مجھے خوب پیٹا لیکن میں عرب کی ہدایت کو یاد رکھتے ہوئے برابر یہی چلاتا رہا: 'جس کے پاس تانبے کی ڈھال ہوتی ہے اس کا دماغ بھی تانبے کا ہوتا ہے۔ میرے گدھے کی دم چوم لو!، پھر جن بورے کو اٹھا کر چلے ...اس سے زیادہ مجھے کچھ یاد نہیں۔ دو گھنٹے بعد جب میں ہوش میں آیا تو میں اسی جگہ پر تھا اور بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ میرا کوبڑ غائب ہو گیا ہے، میرا پیر سیدھا ہے اور میری آنکھ سے دکھائی دینے لگا ہے۔ اس کا یقین مجھے بورے کے ایک سوراخ سے جھانک کر ہوا جو شاید پہلے کسی نے بورے میں بنایا ہوگا۔ اب میں صرف اس کے اندر اس لئے بیٹھا ہوں کہ اتنی رقم دینے کے بعد اس کو ضائع کیوں کروں۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے کسی اور آدمی سے سمجھوتہ کر لیا ہوتا جس میں بھی یہ نقائص ہوتے۔ تب ہم بورے کے کرائے کی رقم آدھی آدھی بانٹ لیتے۔ ہم دونوں دو دو گھنٹے بورے میں رہتے اور اس طرح ہمیں اپنے علاج کے تین تین سو تانگے فی کس پڑتے۔ لیکن کچھ نہیں ہو سکتا۔ رقم ضائع ہو جانے دو۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ میں خدا خدا کر کے اچھا ہو گیا۔

''راہ گیر، اب تمہیں سارا قصہ معلوم ہو گیا۔ اب اپنا قول پورا کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ میں شفا پانے کے بعد کمزوری محسوس کر رہا ہوں اور میرے لئے بولنا مشکل ہے۔ تم سے پہلے نو آدمی مجھ سے یہی سوالات کر چکے ہیں اور میں بار بار باتیں دھرانے سے عاجز آ چکا ہوں۔''

سوداگر بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ خواجہ نصر الدین کے بیان کے درمیان بار بار حیرت کے الفاظ کہہ اٹھتا تھا۔

''بورے میں بیٹھنے والے، سن'' سوداگر نے کہا ''ہم دونوں اپنی ملاقات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

تجھ کو اس بات کا افسوس ہے کہ تو نے بورے کے کرائے میں کسی اپنے ایسے مریض کو حصے دار کیوں نہ بنایا لیکن ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ اتفاق سے میں ایک ایسا ہی آدمی ہوں جس کی تجھے ضرورت ہے۔ میں کو بڑا لنگڑا اور کانا ہوں۔ میں دو گھنٹے بورے میں رہنے کے لئے خوشی سے تجھ کو تین سو تانگے دے سکتا ہوں۔''

''تم مجھے چڑھا رہے ہو!'' خواجہ نصرالدین نے جواب دیا۔''ایسا حیرت انگیز اتفاق ناممکن ہے! اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اللہ کا شکر کرو کہ اس نے تم کو یہ موقع دیا۔ میں راضی ہوں، اے راہ گیر، لیکن میں تم کو بتائے دیتا ہوں کہ میں نے رقم پیشگی ادا کی ہے اور تمہیں بھی پیشگی ہی دینا ہوگا۔ میں ادھار نہیں رکھتا۔''

''میں پیشگی دوں گا'' سودخور نے بورے کو کھولتے ہوئے کہا''لیکن وقت ضائع نہ کرنا چاہئے کیونکہ جو منٹ اب گذر رہے ہیں وہ میرے ہیں۔''

خواجہ نصرالدین نے بورے سے باہر نکلتے ہوئے اپنا چہرہ آستین سے چھپا لیا۔ لیکن سودخور نے تو خواجہ پر نگاہ تک نہ ڈالی۔ وہ جلدی جلدی رقم گن رہا تھا۔ اس کو ہر منٹ گذرنے کا قلق تھا۔ وہ بہت مشکل سے کراہ کراہ کر برے کے اندر گھسا اور اپنا سر بھی اندر کر لیا۔

خواجہ نصرالدین نے رسی باندھ دی اور پھر ذرا دور جا کر ایک درخت کے پیچھے سائے میں چھپ گئے۔ انہوں نے ابھی یہ کیا ہی تھا کہ قبرستان کی طرف سے پہرے داروں کی آوازیں زور زور سے برا بھلا کہتی ہوئی آنے لگیں۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے اندر سے پہلے ان کے لمبے سائے دکھائی دئے اور پھر وہ خود نمودار ہوئے۔ ان کی پیتل کی ڈھالیں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔

36

''ارے دھوکے باز کہیں کے!'' پہرے داروں نے بورے پر لاتیں رسید کرتے ہوئے کہا، ان کے ہتھیار اسی طرح کھڑکھڑا رہے تھے جیسے تانبے کے پرکھڑکھڑاتے۔''ہم نے سارا قبرستان چھان مارا لیکن کچھ نہیں ملا۔ ارے حرامزادے بتا، وہ دس ہزار تانگے کہاں ہیں؟''

سودخور تو اپنا سبق اچھی طرح رٹے بیٹھا تھا۔

''جس کے پاس تانبے کی ڈھال ہوتی ہے اس کا دماغ بھی تانبے کا ہوتا ہے'' وہ بورے کے اندر سے بولا۔''عقاب کی جگہ الو بیٹھا ہے۔ ارے جنو، تم وہ ڈھونڈھ رہے ہو جو تم نے چھپایا نہیں تھا۔ اس لئے

میرے گدھے کی دم چوم لو!''

یہ الفاظ سن کر پہرے داروں کو بڑا غصہ آیا:

''تو نے ہم کو دھوکا دیا، کتے کے پلے! اور اب ہمیں کو احمق بناتا ہے! دیکھو، دیکھو بورا گرد میں لت پت ہے۔ اس نے سڑک پر لوٹ لگا کر اپنے کو آزاد کرنے کی کوشش کی ہوگی جب ہم قبرستان میں کھودر ہے تھے اور ہمارے ہاتھ لہولہان ہو رہے تھے۔ ارے لومڑی کے بچے، تجھے اس دھوکے بازی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا!''

انہوں نے بورے کو مکوں سے خوب پیٹا اور باری باری لوہے کی نعلوں لگے جوتوں سے خاطر کی۔ اس دوران سود خور خواجہ نصر الدین کی ہدایت پر سختی سے قائم رہا اور برابر یہی چلاتا رہا ''جس کے پاس تانبے کی ڈھال ہوتی ہے اس کا دماغ بھی تانبے کا ہوتا ہے!'' اس سے پہرے داروں کو اور بھی غصہ آ گیا۔ وہ تو اس پاجی کو خود ہی ختم کر دیتے لیکن انہیں افسوس تھا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بورا اٹھایا اور مقدس تالاب کی طرف روانہ ہو گئے۔

خواجہ نصر الدین اپنی پناہ گاہ سے نکلے، نہر میں منہ ہاتھ دھوئے اور اپنی قبا اتار دی تا کہ ان کے چوڑے چکلے سینے میں رات کی ہوا لگے۔ وہ نا قابل بیان ہلکا پن اور مسرت محسوس کر رہے تھے کیونکہ موت کی سیاہ سانس ان کو جلائے بغیر گذر گئی تھی۔ انہوں نے ایک امان کی جگہ ڈھونڈ لی، اپنی قبا بچھائی اور ایک پتھر کا تکیہ بنایا۔ وہ دم گھٹنے والے کسے ہوئے بورے کی قید میں بہت ہی بے حال ہو گئے تھے اور ان کو آرام کی ضرورت تھی۔ گھنے درختوں میں ہوا سرسرا رہی تھی۔ آسمان پر تاروں کے سنہرے جھرمٹ تیر رہے تھے۔ نہر میں پانی قل قل کرتا بہہ رہا تھا۔ اب یہ سب پہلے کے مقابلے میں خواجہ نصر الدین کو دس گنا عزیز تھا۔

''ہاں، دنیا میں اتنی زیادہ نیکی موجود ہے کہ اگر میرے لئے جنت میں جگہ کی قطعی ضمانت بھی ہو جائے تو میں مرنے پر راضی نہیں ہوں گا۔ ایک ہی درخت کے نیچے ایک ہی طرح کی حوروں میں تا ابد بیٹھے بیٹھے تو وہاں آدمی کا دم گھٹ جاتا ہوگا۔''

یہ تھے ان کے خیالات۔ وہ گرم زمین پر ستاروں کے شامیانے تلے لیٹے تھے اور کبھی نہ سونے والی، ہمیشہ رواں دواں رہنے والی زندگی کی آواز سن رہے تھے۔ ان کا دل سینے میں ڈھڑک رہا تھا۔ قبرستان سے ایک الو کے بولنے کی آواز آئی، کوئی چھوٹا سا جانور چپکے چپکے جھاڑیوں میں چل پھر رہا تھا۔ شاید کوئی سا ہی

ہو گی۔ کمہائی ہوئی گھاس کی تیز مہک اٹھ رہی تھی، ساری رات پر اسرار حرکتوں، عجیب طرح کی سرسراہٹ، رینگنے اور ٹوٹنے کی آوازوں سے بھری ہوئی تھی۔

دنیا زندہ تھی، سانس لے رہی تھی، وسیع دنیا جو سب کے لئے برابر کھلی تھی۔ اس کی بے پناہ وسعتیں چیونٹی ہو کہ چڑیا یا آدمی سب کے لئے یکساں مہماں نواز تھیں اور معاوضے میں صرف یہ مطالبہ کرتی تھیں کہ اس خیر مقدم اور اعتماد کا استعمال غلط نہ کیا جائے۔ میزبان اس مہمان کو ذلیل کر کے نکال دیتا ہے جو دعوت کے موقع پر عام گہما گہمی سے فائدہ اٹھا کر دوسرے مہمانوں کی جیب صاف کر دیتا ہے۔ ایسا ہی چور یہ لعنتی سودخور تھا جو مسرت سے بھرپور دنیا سے نکالا جا رہا تھا۔

خواجہ نصر الدین کو اس کے لئے ذرا بھی افسوس نہ تھا کیونکہ اس کے خاتمے سے ہزاروں انسانوں کی قسمت بن جانے والی تھی۔ خواجہ نصر الدین کو افسوس یہ تھا کہ سودخور اس دنیا میں آخری شیطان نہ تھا۔ کاش کہ ایک بورے میں تمام امرا اور عمائدین کو، ملاؤں اور سودخوروں کو بند کر کے ایک ساتھ شیخ احمد کے مقدس تالاب میں ڈبویا جا سکتا! تب ان کی گندی سانس درختوں کے پر بہار پھولوں کو نہ کمہلا سکتی، ان کے پیسے کی جھن جھن ان کے ریاکارانہ وعظ اور ان کی تلواروں کی جھنکار چڑیوں کی چہچہاہٹ پر نہ غالب آ سکتی اور آدمی دنیا کے حسن سے لطف اندوز ہونے اور اپنا انتہائی اہم فرض ادا کرنے کے لئے یعنی ہر وقت اور ہر چیز سے خوش رہنے کے لئے آزاد ہوتا!

اس دوران میں پہرے داروں نے تاخیر کا ازالہ کرنے کے لئے تیز تیز چلنا شروع کیا اور آخر کار دوڑنے لگے۔ سودخور جو بورے میں ہلنے جلنے سے چور ہوا جا رہا تھا اس غیر معمولی سفر کے خاتمے کا صبر کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسلحہ کھڑکھڑاا اور پہرے داروں کے پیروں تلے پتھروں کی آواز سن کر حیرت کر رہا تھا کہ یہ طاقتور جن دوڑنے اور زمین پر اپنے تانبے کے پر اس طرح رگڑنے کے بجائے جیسا کہ جوان مرغ مرغی کا پیچھا کرتے وقت کرتے ہیں آخر ہوا میں بلند ہو کر اڑتے کیوں نہیں ہیں۔

آخر کار دور سے ایک عجیب گرجدار آواز سنائی دی جیسے کوئی پہاڑی چشمہ گرجتا ہوا بہہ رہا ہو۔ اس سے پہلے تو سودخور نے سوچا کہ جن اس کو کسی پہاڑ پر لائے ہیں، شاید اپنے مسکن خان تنگری میں۔ لیکن جلدی اس کو آوازیں سنائی دینے لگیں اور اس نے اندازہ لگا لیا کہ آدمیوں کا بڑا مجمع ہے۔ آواز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بازار کی طرح ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ لیکن آخر بخارا میں رات کو کاروبار کب سے شروع ہو گیا؟

اچانک اس نے محسوس کیا کہ وہ اوپر اٹھایا جا رہا ہے۔ اوہ، آخر کار جنوں نے ہوا میں اڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کو کیا معلوم تھا کہ پہرے دار بورے کو زینوں کے اوپر اٹھا کر پلیٹ فارم تک لا رہے تھے۔ اوپر پہنچ کر انہوں نے بورا پٹک دیا۔ وہ پٹڑوں پر گرا جو اس کے وزن سے ہلنے اور کھڑکھڑانے لگے۔ سود خور زور سے کراہا۔

''ارے جنو!'' وہ چلایا ''اگر تم بورے کو اس طرح پھینکو گے تو مجھے اچھا کرنے کے بجائے اپاہج بنا دو گے!''

اس کا جواب اسے ایک زوردار لات سے ملا۔

''حرامزادے، تیرا علاج جلد ہی احمد کے تالاب کی تہہ میں ہوگا!''

سود خور اچانک بدحواس ہو گیا۔ اس معاملے کا احمد کے مقدس تالاب سے کیا تعلق؟ اس کی پریشانی حیرت میں بدل گئی جب اس نے قریب ہی اپنے پرانے دوست، محل کے پہرے داروں اور فوج کے کماندار ارسلان بیگ کی آواز سنی۔ وہ قسم کھا سکتا تھا کہ یہ ارسلان بیگ ہی تھا۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ یہ ارسلان بیگ اچانک کہاں سے کود پڑا؟ وہ جنوں کو راستے میں تاخیر کرنے کے لئے کیوں گالیاں دے رہا ہے اور جن اس کی بات کا جواب دیتے وقت خوف اور عاجزی سے کانپ کیوں رہے ہیں؟ یہ تو ناممکن ہے کہ ارسلان بیگ جنوں کا بھی سردار ہو۔ وہ کیا کرے؟ خاموش رہے یا ارسلان بیگ کو پکارے؟ چونکہ سود خور کو اس کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی اس لئے اس نے خاموش ہی رہنا بہتر سمجھا۔

اس دوران میں مجمع کا شور وغل اور بڑھ گیا تھا۔ عام ہنگامے میں ایک لفظ سب سے زیادہ زور سے اور اکثر سنائی دے رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے زمین، فضا اور ہوا سبھی اس لفظ سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کی ہلکی بھن بھناہٹ ہوتی، پھر شور اور گرج دور تک گونجتی چلی جاتی۔ سود خور سانس روکے سب کچھ سن رہا تھا۔ آخر کار اس نے سنا۔

''خواجہ نصر الدین!'' مجمع میں ہزاروں لوگ چلا رہے تھے۔ ''خواجہ نصر الدین خواجہ نصر الدین!''

اچانک خاموشی چھا گئی اور سخت سناٹے میں سود خور نے شعلہ ور مشعلوں کے پھٹکنے، ہوا کی سرسراہٹ اور پانی کی کھلبلاہٹ سنی۔ اس کی ٹیڑھی ریڑھ میں کپکپی سی دوڑ گئی اور وہ انتہائی ڈر گیا۔ خوف کی سرد سانس نے اس کو بالکل جما دیا۔

پھر ایک اور آواز سنائی دی اور سود خور یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وزیر اعظم بختیار کی آواز ہے:

''خدا کے نام پر جو رحیم و کریم ہے اور آفتاب جہاں امیر بخارا کے حکم سے، مجرم، مرتد، امن و امان شکن اور منافق خواجہ نصر الدین کو ایک بورے میں بند کر کے ڈبو کر ختم کیا جائے گا۔''

بورے پر ہاتھ پڑے اور انہوں نے بورے کو اٹھا لیا۔ اب سود خور کو اپنی مہلک حالت کا صحیح پتہ چلا۔

''ٹھہرو! ٹھہرو!'' وہ چلایا۔ ''ارے تم کیا کر رہے ہو؟ ٹھہرو! میں خواجہ نصر الدین نہیں ہوں۔ میں تو جعفر سود خور ہوں! مجھے چھوڑ دو! میں جعفر ہوں، میں خواجہ نصر الدین نہیں ہوں! مجھے کہاں لئے جا رہے ہوں؟ میں کہہ رہا ہوں تم سے کہ میں جعفر سود خور ہوں!''

امیر اور اس کا عملہ سود خور کی فریاد کو خاموشی سے سنتا رہا۔ بغداد کے دانا مولانا حسین نے جو امیر کے بالکل قریب بیٹھا تھا ناراضگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا:

''یہ مجرم تو انتہائی بے حیا ہے۔ ایک مرتبہ اس نے بغداد کے دانا مولانا حسین کا روپ دھارا اور اب ہم کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ جعفر سود خور ہے!''

''وہ خیال کرتا ہے کہ یہاں ایسے احمق ہیں جو اس کی بات مان لیں گے'' ارسلان بیگ نے اضافہ کیا۔ ''دیکھئے، کس طرح اس نے اپنی آواز بدلی ہے۔''

''مجھے چھوڑ دو! میں خواجہ نصر الدین نہیں ہوں، میں جعفر ہوں!'' سود خور نے فریاد کی جب دو پہرے دار پلیٹ فارم کے کنارے آ کر بورے کو جھلانے لگے تا کہ اسے کالے پانی میں پھینک دیں۔

''میں خواجہ نصر الدین نہیں ہوں! میں تو....''

اسی لمحے ارسلان بیگ نے اشارہ کیا اور بورے نے ہوا میں بلند ہو کر کئی قلابازیاں کھائیں۔ پھر زبردست بھچاکے کے ساتھ وہ پانی میں گرا جس سے ایک فوارہ سا بلند ہوا جو مشعلوں کی سرخ روشنی میں چمکا اور پھر گہرے پانی نے جعفر سود خور کے گنہ گار جسم اور گنہ گار روح کو اپنے آغوش میں لے لیا۔

مجمع سے ایک زبردست آہ بلند ہو کر رات میں پیوست ہو گئی۔ چند لمحے یکا یک بھیانک خاموشی طاری رہی اور پھر اچانک ایک زوردار اور دل میں اتر جانے والی چیخ نے اس کو چکنا چور کر دیا۔ یہ تھی گل جان جو چیخ پڑی تھی اور اپنے بڈھے باپ کے بازوؤں میں تڑپ رہی تھی۔

چائے خانے کے مالک علی نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور آہنگر یوسف اس طرح کانپنے لگا

جیسے اس کو لرزے کا دورہ پڑا ہو۔

37

سزائے موت کے بعد امیر مع اپنے ماہی مراتب کے محل واپس گیا۔

اس ڈر سے کہ کہیں مرنے سے پہلے مجرم کو بچا نہ لیا جائے ارسلان بیگ نے تالاب کے چاروں طرف پہرہ لگا دیا اور حکم دے دیا کہ کسی کو قریب نہ آنے دیا جائے۔ مجمع پہرے داروں کے ریلنے پر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر ایک بڑی ماتمی اور خاموش بھیڑ کی صورت میں اکٹھا ہو گیا۔ ارسلان بیگ نے ان کو منتشر کرنے کی کوشش کی لیکن لوگ دوسرے طرف ہٹ جاتے یا تاریکی میں چھپ جاتے اور پھر ذرا دیر بعد اسی جگہ واپس آ جاتے۔

محل میں بڑی چہل پہل تھی۔ امیر اپنے دشمن پر فتح کا جشن منا رہا تھا۔ ہر طرف سونا چاندی چمک رہا تھا، کیتلیاں ابل رہی تھیں، انگیٹھیوں سے دھواں نکل رہا تھا اور طنبوروں کے نغمے بکھر رہے تھے، نفیریاں بج رہی تھیں اور نقاروں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ جشن کے سلسلے میں اتنی روشنی تھی کہ اس کی سرخی سے سارے محل میں آگ سی لگی معلوم ہوتی تھی۔

لیکن محل کے چاروں طرف سارے شہر میں سناٹا، اندھیرا اور غم انگیز خاموشی چھائی تھی۔

امیر نے بڑی فیاضی سے انعامات تقسیم کئے۔ اس دن بہتوں پر نظر عنایت ہوء۔ شاعروں کی آوازیں قصیدے پڑھتے پڑھتے بیٹھ گئیں اور چاندی اور سونے کے سکے جھک کر اٹھاتے اٹھاتے کمریں رہ گئیں۔

''رقعہ نویس کو بلاؤ'' امیر نے حکم دیا۔

رقعہ نویس دوڑتا ہوا آیا اور جلدی جلدی اپنے کلک کے قلم سے لکھنے لگا۔

بخارا کے عظیم اور صاحب شان وشوکت، آفتاب کو شرمانے والے حکمران، بخارا کے سپہ سالار اور پیشوائے دین، امیر بخارا کی طرف سے عظیم اور صاحب شان وشوکت حکمران، خیوا کے سپہ سالار اور پیشوائے دین سلامتی اور خیر سگالی کے پھول قبول فرمائیں۔ ہم آپ کو، اپنے عزیز اور شاہ بھائی کو ایک خبر بھیج رہے ہیں جس سے آپ کا دل خوشی سے بھر جائے گا۔

''آج کے دن، 17 صفر کو، ہم نے، بخارا کے امیر اعظم نے، خواجہ نصر الدین کو سر بازار سزائے موت دی۔ یہ مجرم ساری دنیا میں اپنی ناپاک اور مرتدانہ سرگرمیوں کے لئے مشہور تھا، خدا کی لعنت ہو اس پر۔ ہم نے اس کو ایک بورے میں بند کر کے ڈبو دیا۔ یہ واقعہ مابدولت کی موجودگی میں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا اس لئے ہم اپنے شاہانہ الفاظ کے ذریعہ شہادت پیش کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا بدمعاش، امن وامان شکن، مرتد اور منافق اب زندوں کے درمیان نہیں ہے اواب آپ کو، ہمارے عزیز بھائی کو اپنی کفر کی باتوں سے پریشان نہیں کرے گا۔''

اسی طرح کے خطوط بغداد کے خلیفہ، ترکی کے سلطان، ایران کے شاہ، قوقند کے خان اور افغانستان کے امیر اور بہت سے نزدیک و دور کے بادشاہوں کے لکھوائے گئے۔ وزیر اعظم بختیار نے خطوں کے لپیٹ کر ان پر مہر لگائی اور ہرکاروں کو یہ حکم دے کر حوالے کیا کہ وہ فوراً اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو جائیں۔ اس رات بخارا کے سب کے سب گیارہ پھاٹک زور سے چرا چراتے چیختے کھلے اور ہر طرف کی شاہراہوں پر ہرکارے چل پڑے۔ ان کے گھوڑوں کے سموں کے نیچے پتھر کھڑ کھڑا رہے تھے اور چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ وہ خیوا، تہران، استنبول، بغداد، کابل اور بہت سے دوسرے شہروں کو جا رہے تھے۔

....رات کے سناٹے میں، سزائے موت کے چار گھنٹے بعد، ارسلان بیگ نے تالاب سے پہرا ہٹا لیا۔

''وہ چاہے شیطان ہی کیوں نہ ہو، پانی کے اندر چار گھنٹے رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا'' ارسلان بیگ نے کہا۔ ''اس کو نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو چاہے وہ اس کی مردار لاش لے جا سکتا ہے۔''

اندھیرے میں پہرے داروں کے غائب ہوتے ہی مجمع شور مچاتا ہوا تالاب کے کنارے کی طرف بڑھا۔ پہلے سے تیار کی ہوئی مشعلیں جو جھاڑیوں میں رکھی تھیں جلائی گئیں۔ عورتوں نے خواجہ نصر الدین کے انجام پر رونا دھونا اور ماتم کرنا شروع کر دیا۔

''ہمیں ان کی تجہیز و تکفین ایک سچے مسلمان کی طرح کرنی چاہئے'' بڈھے نیاز نے کہا۔ گل جان ساکت وضامت اپنے باپ کے کندھے کے سہارے کھڑی تھی۔

چائے خانے کا مالک علی اور آہنگر یوسف آنکڑے دار ڈانڈ لئے ہوئے پانی میں کود ے۔ وہ بہت

دیر تک تلاش کرتے رہے۔ آخر کار انہوں نے بورا پکڑ لیا اور اس کو گھسیٹ کر کنارے تک لائے۔ وہ سطح پر آیا۔ سیاہ، مشعلوں میں چمکتا ہوا بورا جو پانی کی گھاس سے اور بھی پھول گیا تھا۔ عورتوں نے اور زور سے رونا شروع کیا جس میں محل میں جشن کی آواز ڈوب گئی۔

درجنوں لوگوں نے بورے کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

''میرے ساتھ آؤ'' یوسف نے اپنے مشعل سے راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔

ایک چھتنارے درخت کے نیچے بورا رکھا گیا۔ لوگ خاموشی سے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

یوسف نے ایک چاقو نکالا اور احتیاط سے بورے کو لمبائی میں کاٹا، غور سے مردے کا چہرہ دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا جیسے پتھر ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں اور زبان سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

علی یوسف کی مدد کے لئے لپکا تو وہ بھی اسی طرح متحیر کھڑا رہ گیا۔ اس نے اکڑوں بیٹھ کر دیکھا، اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ چت گر پڑا۔ اس کی موٹی توند آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''کیا معاملہ ہے؟'' مجمع میں چاؤں چاؤں ہوئی۔ ''آؤ دیکھیں، ہمیں دیکھنے دو!''

گل جان روتی ہوئی لاش پر جھک گئی لیکن کسی نے اس کی طرف مشعل بڑھا دی اور وہ خوف و حیرت سے جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

اب آدمی مشعلیں لئے ہوئے چاروں طرف سے جمع ہو گئی۔ تالاب کے کنارے پر کافی روشنی ہو گئی تھی۔ بہت سی آوازوں کی مشترکہ زبردست چیخ نے رات کی خاموشی کو چکنا چور کر دیا:

''جعفر!''

''یہ تو سود خور جعفر ہے!''

''یہ خواجہ نصر الدین نہیں ہیں!''

ذرا دیر گھبراہٹ اور انتشار کے بعد ہر ایک نے اچانک غل مچانا شروع کر دیا۔ لوگ ایک دوسرے کا دھکا دیتے، دھکیلتے، ایک دوسرے کے کندھوں پر لٹکتے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ گل جان کی تو ایسی حالت ہو گئی تھی کہ بڈھا نیاز اس کو تالاب کے کنارے سے دور لے گیا۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں وہ پاگل نہ ہو جائے۔ وہ رو اور ہنس رہی تھی۔ وہ شک و شبہ اور یقین کے درمیان معلق تھی اور ایک

بار پھر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''جعفر! جعفر!'' مسرت آمیز آوازیں گونج رہی تھیں جنہوں نے دور سے آتی ہوئی محل کی رنگ رلیوں کی آوازوں کو بالکل ڈبو دیا تھا۔ ''یہ تو جعفر سود خور ہے! وہی ہے یہ۔ یہ رہا اس کا رسیدوں کا تھیلا۔''

کچھ دیر بعد کسی کو ہوش آیا اور اس نے مجمع سے عام سوال کیا:

''تو پھر خواجہ نصر الدین کہاں ہیں؟''

اب یہ سوال سارے مجمع نے دہرایا اور شور ہوا:

''تو پھر خواجہ نصر الدین کہاں ہیں؟ ہمارے خواجہ نصر الدین کہاں ہیں؟''

''یہاں ہیں!'' یا ک جانی پہچانی پر سکون آواز آئی۔ اور سب اس طرف مڑ گئے۔ خواجہ نصر الدین کو زندہ دیکھ کر وہ حیرت میں رہ گئے۔ ان کے ساتھ کوئی پہرے دار نہ تھا۔ وہ ان کی طرف اطمینان سے جماھیاں اور انگڑائیاں لیتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔ خواجہ قبرستان کے قریب سو گئے تھے اسی لئے اتنی دیر میں یہاں پہنچے تھے۔

''میں یہاں ہوں'' انہوں نے دہرایا ''جو مجھ سے ملنا چاہتا ہے یہاں آ جائے۔ بخارا کے محترم باشندو، آپ یہاں تالاب پر کیوں جمع ہوئے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟''

''کیوں؟ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟'' سیکڑوں آوازوں نے کہا۔ ''خواجہ نصر الدین، ہم یہاں آئے تھے آپ کو آخری بار الوداع کہنے، آپ کے لئے ماتم کرنے اور آپ کو دفن کرنے۔''

''مجھ کو؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''میرے لئے ماتم کرنے؟ بخارا کے شریف باشندو، آپ خواجہ نصر الدین کو نہیں جانتے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ان کا مرنے کا ارادہ ہے! میں تو صرف آرام کرنے کے لئے ایک قبرستان کے قریب لیٹ گیا تھا اور آپ سمجھنے لگے کہ میں مر گیا!''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ سکے تھے کہ چائے خانے کا مالک علی اور آہنگر یوسف خوشی سے چیخیں مار کر ان سے اس طرح لپٹ گئے کہ بس جان بچانا مشکل ہوگئی۔ نیا نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن وہ جلد ہی دھکم پیل میں پیچھے رہ گیا۔ خواجہ نصر الدین ایک بڑے مجمع میں گھرے تھے جہاں ہر شخص ان سے گلے ملنا اور ان کو خوش آمدید کہنا چاہتا تھا اور وہ ہر ایک سے گلے ملتے ہوئے اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں سے گل جان کی بے چین اور غصے سے بھری ہوئی آواز آ رہی تھی جو بھیڑ میں ان تک پہنچنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔

اور آخر کار جب وہ ایک دوسرے سے دوچار ہوئے تو گل جان نے ان کے گلے میں باھیں ڈال دیں۔ خواجہ نصر الدین نے اس کی نقاب اٹھائی اور سارے مجمع کے سامنے اس کو چوم لیا اور وہاں پر موجود کسی بھی آدمی کو، ان لوگوں کو بھی جو رسم رواج کے بڑے حامی تھے یہ بات بری نہیں معلوم ہوئی۔

خواجہ نصر الدین نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں سے خاموش رہنے اور اپنی طرف متوجہ ہونے کے لئے کہا:

''آپ میرا کرنے آئے تھے، بخارا کے شریف باشندو! آپ نہیں جانتے کہ میں امر ہوں؟''

ہوں میں خواجہ نصر الدین، آزاد سدا کا

یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

وہ سنسناتی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں کھڑے تھے۔ مجمع نے دھن اٹھائی جو رات کی تاریکی میں لپٹے ہوئے بخارا میں پر مسرت لہر کی طرح پھیل گئی۔

ہوں میں خواجہ نصر الدین، آزاد سدا کا

یہ جھوٹ نہیں، میں نہ مرا ہوں نہ مروں گا

اس خوشی کا محل کی رنگ رلیوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔

''ہمیں بتایئے'' کسی نے چلا کر پوچھا ''کہ آپ نے اپنے بجائے جعفر سود خور کو ڈبونے کا کام کیسے کیا؟''

''آہ!'' خواجہ نصر الدین کو اچانک یاد آ گیا۔ ''یوسف، تم کو میری قسم یاد ہے نا؟''

''ہاں، ضرور'' یوسف نے جواب دیا ''اور آپ نے اسے پورا کیا، خواجہ نصر الدین!''

''وہ کہاں ہے؟'' خواجہ نصر الدین نے کہا ''سود خور کہاں ہے؟ تمہیں اس کا تھیلا مل گیا؟''

''نہیں، ہم نے اس چھوا نہیں۔''

''ارے!'' خواجہ نصر الدین نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔ ''بخارا کے باشندو! آپ کے خیالات بہت شریفانہ ہیں لیکن سمجھ میں ذرا خامی ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ اگر یہ تھیلا سود خور کے وارثوں کو مل گیا تو وہ آپ سے قرض کا ایک ایک پیسہ وصول کر لیں گے؟ لایئے یہ تھیلا مجھے دیجئے۔''

درجنوں آدمی دھکم پیل کرتے اور غل مچاتے ان کا حکم پورا کرنے دوڑے۔ انہوں نے بھیگا تھیلا لا کر خواجہ نصر الدین کو دے دیا۔

انہوں نے ایک پرونوٹ اٹکل پچو نکال لیا۔

''محمد زین ساز!'' انہوں نے زور سے پکارا۔ ''محمد زین ساز کون ہے؟''

''میں'' ایک دھیمی کانپتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ مجمع سے ایک پستہ قد بڈھا نکلا جس کے چھدری داڑھی تھی۔ وہ ایک انتہائی پھٹی پرانی رنگین قبا پہنے تھا۔

''محمد زین ساز اس پرونوٹ کے مطابق تم کو کل پانچ سو تانگے ادا کرنا ہیں۔ لیکن میں، خواجہ نصرالدین تمہارا قرض منسوخ کرتا ہوں۔ یہ رقم تم اپنی ضرورتوں کے لئے استعمال کرو اور اپنے لئے ایک نئی قبا خرید لو۔ تمہاری قبا تو بس کپاس کے تیار کھیت کا منظر پیش کرتی ہے، ہر جگہ روئی نکلی ہوئی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے انہوں نے پرونوٹ کے پرزے پرزے کر دئے۔

خواجہ نصرالدین نے یہی گت سب پرونوٹوں کی بنائی۔

جب آخری پرونوٹ پرزے پرزے ہو چکا تو خواجہ نصرالدین نے تھیلا تالاب میں پھینک دیا۔

''اب اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تالاب کی تہہ میں دفن ہو جانے دو!'' انہوں نے زور سے کہا۔ ''اب اس کو کوئی اپنے کندھے پر نہ لٹکا سکے گا۔ بخارا کے شریف باشندو! انسان کے لئے ایسا تھیلا لے کر چلنے سے زیادہ کوئی ذلت کی بات نہیں ہو سکتی آپ کے لئے چاہے جو کچھ کیوں نہ ہو جائے، چاہے آپ دولت مند ہو جائیں، جس کی امید ہمارے آفتاب جیسے امیر اور اس کے نگراں وزیروں کی زندگی میں نہیں ہے، لیکن اگر ایسا کبھی ہو اور آپ میں سے کوئی دولت مند ہو جائے تو ایسا تھیلا لے کر کبھی نہ چلنا ورنہ وہ اپنے کو اور اپنی آنے والی نسلوں کو چودہ پیڑھیوں تک ابدی ذلت میں مبتلا کر دے گا! اسے یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اس دنیا میں خواجہ نصرالدین کا بھی وجود ہے جس کا ہاتھ بہت سخت ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس نے جعفر سود خور کو کیا سزا دی ہے۔ اب میں آپ سے رخصت ہوں گا، بخارا کے شریف باشندو۔ مجھے ایک طویل سفر درپیش ہے۔ گل جان تم میرے ساتھ چلو گی؟''

''میں تمہارے ساتھ جہاں کہو گے چلوں گی'' گل جان نے جواب دیا۔

بخارا کے باشندوں نے خواجہ نصرالدین کو شاندار طور پر الوداع کہا۔ کارواں سرائے کے مالک ان کی دلھن کے لئے روئی جیسا سفید گدھا لائے۔ اس کی کھال پر ایک بھی سیاہ داغ نہ تھا اور وہ بڑے فخر کیساتھ اپنے بھورے بھائی، خواجہ نصرالدین کی آوارہ گردیوں کے پرانے اور وفادار رفیق کے برابر کھڑا

چمک رہا تھا۔ بھورے گدھے کو اپنے شاندار رفیق پر ذرا بھی رشک نہیں تھا اور وہ اطمینان سے مزیدار گھاس کھا رہا تھا اور اپنے تھوتھن سے سفید گدھے کو دھکا بھی دیتا جاتا تھا جیسے وہ دکھانا چاہتا تا کہ رنگ میں اس کی نا قابل تردید برتری کے باوجود سفید گدھا خواجہ نصر الدین کے خدمت میں اس کا پاسنگ نہیں ہوسکتا تھا۔

آہنگر اپنی بھٹی وغیرہ وہیں لائے اور دونوں گدھوں کے نعلیں لگائیں۔ زین سازوں نے دو زینیں بطور تحفہ پیش کیں۔ ایک مخمل سے سجی ہوئی خواجہ نصر الدین کے لئے تھی اور دوسری چاندی کے کام سے مرصع گل جان کے لئے۔ چائے خانے کے مالک دو چائے دان اور دو چینی کے بہت نفیس پیالے لائے۔ اسلحہ سازوں نے خواجہ نصر الدین کو مشہور گور دا فولاد کی تلوار دی تا کہ وہ اپنے کو راہزنوں سے بچا سکیں۔ قالین بنانے والے ان کے لئے زین پوش لائے، کمند سازوں نے گھوڑے کے بالوں کی بنی ہوئی کمند دی۔ یہ کمند جب کسی سونے والے مسافر کے گرد بچھا دی جاتی ہے تو وہ زہریلے سانپوں سے محفوظ رہتا ہے کیونکہ سانپ چبھنے والے بالوں کے اوپر نہیں رینگتے۔

بنکروں، ٹھٹھیروں، درزیوں اور موچیوں، غرض سب نے تحفے دئے۔ ملاؤں، عمائدین اور صاحب جائداد لوگوں کے علاوہ سارے شہر بخارا نے خواجہ نصر الدین کے سفر کے لئے ساز و سامان مہیا کیا۔

کمہار الگ افسردہ کھڑے تھے۔ ان کے پاس تحفے کے لئے کچھ نہ تھا۔ آدمی مٹی کی صراحی کا کیا کرے گا جب کہ ٹھٹھیروں نے ان کو پیتل کی صراحی دی تھی؟

اچانک سب سے بڈھے کمہار نے جس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی کہا ''کون کہتا ہے کہ ہم کمہاروں نے خواجہ نصر الدین کو کچھ نہیں دیا ہے۔ کیا ان کی دولھن، یہ حسین دوشیزہ، کمہاروں کی مشہور اور لائق برادری کی نہیں ہے؟''

کمہاروں نے خوش ہو کر زور کا نعرہ مسرت بلند کیا۔ پھر انہوں نے گل جان کو اچھی طرح نصیحت کی کہ وہ خواجہ نصر الدین کی وفادار اور پر خلوص رفیقہ حیات بنے اور اپنی برادری کے لوگوں کی شہرت اور عزت کو بٹہ نہ لگائے۔

''صبح صادق کا وقت ہونے والا ہے'' خواجہ نصر الدین نے کہا ''جلد ہی شہر کے پھاٹک کھل جائیں گے۔ مجھے اور میری دلہن کو چپکے سے نکل جانا چاہئے۔ اگر آپ سب رخصت کرنے آئے تو پہرے داروں کو خیال ہوگا کہ شاید بخارا کے سارے باشندے کہیں اور آباد ہونے جا رہے ہیں اور وہ پھاٹک بند کر لیں

گے، کسی کو بھی باہر نہ جانے دیں گے۔ اس لئے آپ اپنے اپنے گھروں کو جایئے۔ میری دعا ہے کہ آپ سکھ چین کی نیند سوئیں، آپ پر مصیبت کا منحوس سایہ کبھی نہ پڑے اور کامیابیاں آپ کے ہمراہ رہیں! خواجہ نصرالدین اب آپ سے رخصت ہوتا ہے۔ کتنی مدت کے لئے؟ یہ میں خود نہیں جانتا۔''

مشرق میں ایک چھوٹی، مشکل سے دکھائی دینے والی روشنی کی ہلکی پٹی نمودار ہو رہی تھی۔ تالاب سے ہلکا کہرا اٹھ رہا تھا۔ مجمع منتشر ہونے لگا۔ لوگ مشعلیں بجھا رہے تھے اور زور زور سے کہہ رہے:

''سفر بخیر، خواجہ نصرالدین! اپنے وطن کو نہ بھولئے گا!''

آہنگر یوسف اور چائے خانے کے مالک علی سے رخصت کا منظر خاص طور سے متاثر کن تھا۔ موٹا علی اپنے آنسو نہ روک سکا، وہ اس کے گول سرخ رخساروں پر بہہ نکلے۔

خواجہ نصرالدین پھاٹک کھلنے کے وقت تک نیاز کے گھر میں ٹھہرے رہے۔ جیسے ہی موذن کی پرسوز آواز شہر کی فضا میں گونجی خواجہ نصرالدین اور گل جان اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ نیاز ان کے ساتھ قریب کے موڑ تک گیا۔ اس کے آگے خواجہ نصرالدین نے اس کو نہیں آنے دیا اور بڈھا آنکھوں میں آنسو بھرے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک کہ وہ موڑ پر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا چلی اور اس نے سڑک پر سارے نشانات مٹا دئے۔

نیاز جلدی سے گھر واپس ہوا اور چھت پر چڑھ گیا۔ وہاں سے بہت دور تک شہر کی فصیل کے پار دکھائی دیتا تھا اور وہ بڑی دیر تک اپنی بوڑھی آنکھوں پر زور دے کر، بے اختیار آنسوؤں کو پونچھ پونچھ کر بادامی رنگ کی دھوپ سے جھلسی ہوئی پہاڑیوں کی طرف دیکھتا رہا جن کے درمیان سڑک کا بھورا فیتہ دور لہراتا ہوا چلا گیا تھا۔ وہ اتنی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ آخر میں پریشان ہو گیا۔ کیا خواجہ نصرالدین اور گل جان پہرے داروں کے ہاتھ آ گئے؟

لیکن آخر کار اس کو دور فاصلے پر دو دھبے سے دکھائی دئے، ایک سفید اور دوسرا بھورا۔ وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتے اور چھوٹے ہوتے گئے۔ جلد ہی بھورا دھبہ پہاڑیوں میں مل جل کر غائب ہو گیا لیکن سفید دھبہ کافی دیر تک رہا۔ وہ گہرائیوں اور خموں میں غائب ہو جاتا اور پھر نمودار ہوتا۔ پھر وہ بھی گرمی کے بڑھتے ہوئے دھند میں غائب ہو گیا۔

دن چڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ گرمی بھی بڑھ رہی تھی۔ بڈھا گرمی سے بے نیاز غمگین خیالات

میں ڈوبا ہوا چھت پر بیٹھا رہا۔ اس کا سفید سر ہل رہا تھا اور گلا رندھا جا رہا تھا۔ اس کو خواجہ نصر الدین اور اپنی بیٹی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ ان کی خوشی وسلامتی کا خواہاں تھا لیکن اس کو اپنے اوپر افسوس آ رہا تھا۔ اب اس کا گھر خالی ہو گیا تھا اور اب اپنے زندہ دلانہ گیتوں اور قہقہوں سے اس کی زندگی میں خوشی لانے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ گرم ہوا چلنے لگی، انگور کی بیلوں میں سرسراہٹ شروع ہو گئی اور رگرداڑنے لگی۔ ہوا کے پروں نے چھت پر سوکھتے ہوئے برتنوں کو چھوا اور وہ باریک آمیز آواز میں بج اٹھے جیسے وہ گھر سے جانے والوں کے لئے غمگین ہوں۔

نیاز اپنے پیچھے ایک دھیمی آواز سے چونک پڑا۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ تین بھائی جو پڑوس میں رہتے تھے ایک دوسرے کے پیچھے زینوں پر چڑھ رہے تھے۔ وہ خوب تندرست خوبصورت نوجوان تھے اور سبھی کمہار تھے۔ وہ قریب آ کر احترام کے ساتھ جھکے۔

''محترم نیاز'' سب سے بڑا بھائی بولا'' آپ کی بیٹی خواجہ نصر الدین کے ساتھ رخصت ہو گئی لیکن آپ رنجیدہ اور پریشان نہ ہوں کیونکہ دنیا کا قانون یہی ہے۔ جب ہرنی ہرن کے بغیر نہیں، گائے بیل کے بغیر اور بلخ بلانر کے نہیں رہ سکتی تو کیا کوئی دوشیزہ بلا کسی سچے اور پرخلوص رفیق کے رہ سکتی ہے؟ کیا اللہ نے دنیا کی تمام چیزوں میں تفریق نہیں کی ہے حتی کہ کپاس کے پودوں کی شاخوں تک میں نر و مادہ ہوتے ہیں۔

''بہر حال، ہم نہیں چاہتے کہ آپ کو بوڑھاپے میں رنج پہنچے اس لئے ہم تینوں نے آپ سے یہ کہنے کا فیصلہ کیا ہے کہ جس کا رشتہ خواجہ نصر الدین سے ہوا وہ بخارا کے تمام باشندوں کا رشتے دار بن گیا اور اب آپ ہمارے رشتے دار ہو گئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پچھلے سال ہم نے اپنے باپ اور آپ کے دوست و معظم عثمان علی کو کس رنج وغم کے ساتھ سپرد خاک کیا تھا اور اب ہمارے آتش دان کے قریب ایک جگہ بزرگ خاندان کے لئے خالی ہے اور ہم اب اس روزمرہ کی خوشی سے محروم ہو گئے کہ کسی سفید داڑھی کی زیارت کر سکیں جس کے بغیر بچے کی چیخ پکار کی طرح گھر خالی خالی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آدمی کی روح کو اسی وقت سکون ملتان ہے جب وہ ایسے صاحب ریش آدمی کے پاس ہوتا ہے جس نے اس کو جنم دیا ہے اور اس کے یہاں پالنے میں جھولتا ہے جس کو خود اس نے جنم دیا ہے۔

''اس لئے، محترم نیاز! ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہمارے آنسوؤں کو دیکھیں اور

ہماری درخواست سے انکار نہ کریں۔ ہمارے گھر آیئے اور آتش دان کے قریب وہ جگہ لیجئے جو بزرگ خاندان کے لئے مخصوص ہے۔ہم تینوں کے باپ بنئے اور ہمارے بچوں کے دادا۔''

ان بھائیوں نے اتنا اصرار کیا کہ نیاز کو انکار کرتے نہ بنا۔وہ ان کے گھر گیا اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔اس طرح اس کو بوڑھاپے میں ایسی ایماندارانہ اور پاکیزہ زندگی نصیب ہوئی جو ایک مسلمان کے لئے اس دنیا میں ممکن ہے۔وہ اب ایک بڑے خاندان کا بزرگ بن کر جس میں چودہ ناتی پوتے تھے نیاز بابا ہو گیا تھا۔وہ انگور اور شہتوت کے رس سے بھرے گلابی گلابی گالوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔اس دن سے اس کے کان خاموشی سے کبھی نہیں اکتائے۔کبھی کبھی وہ غل شور سے گھبرا جاتا تو اپنے پرانے گھر آرام کے لئے چلا جاتا اور ان دونوں کو افسردگی کے ساتھ یاد کرتا جو اس کے دل سے اتنے قریب تھے اور اب کہیں دور دراز کسی انجانی جگہ چلے گئے تھے۔

بازار کے دن وہ بازار جاتا اور کاروانوں میں جو دنیا کے تمام کونوں سے بخارا آتے تھے پوچھتا کہ کیا سڑک پر کہیں ان کی ملاقات دو مسافروں سے ہوئی۔مرد ایک بھورے گدھے پر تھا اور عورت بے داغ سفید گدھے پر؟ ساربان اپنی سورج سے سنولائی ہوئی پیشانی پر بل ڈال کر سر ہلاتے کہ ان کی ملاقات ایسے لوگوں سے نہیں ہوئی۔

خواجہ نصرالدین حسب معمول بلا کسی پتے نشان کے غائب ہو گئے تھے تاکہ وہ پھر کہیں ایسی جگہ پر نمودار ہوں جہاں ان کی توقع بالکل نہ کی جاتی ہو۔

باب آخر

(جو ایک نئی کتاب کی ابتدا کا کام کر سکتا ہے)

''میں نے سات سفر کئے اور ہر سفر کے بارے میں ایک ایسی غیر معمولی داستان ہے جو ذہن کو بے چین کر دیتی ہے۔''

(الف لیلہ)

اور وہ پھر نمودار ہوئے، ایسی جگہ جہاں سب سے کم توقع کی جاتی تھی۔ وہ استنبول میں دکھائی دئے۔

یہ واقعہ امیر بخارا کا خط سلطان ترکی کو ملنے کے تین دن بعد ہوا۔ سینکڑوں نقیبوں نے عظیم سلطنت کے شہروں اور گاؤں میں خواجہ نصرالدین کی موت کا اعلان کیا۔ ملاؤں نے خوش ہو کر مسجدوں میں صبح وشام دن میں دوبار امیر کا خط پڑھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ سلطان نے محل کے باغ میں جشن کیا۔ وہ پوپلر کے درختوں کے خنک سائے میں سائے میں بیٹھا تھا، فواروں کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف وزرا، عقلا، شعرا اور شاہی عملے کا مجمع تھا، سب لالچ سے شاہی داد و دھش کے متوقع تھے۔ حبشی غلام ان لوگوں کے درمیان بھاپ اٹھتی ہوئی کشتیاں، حقے اور صراحیاں لئے ہوئے آجا رہے تھے۔ سلطان بہت خوش تھا اور برابر ہنسی مذاق کر رہا تھا۔

''آج گرمی کے باوجود فضا میں خوشگوار لطافت اور مہک کیوں ہے؟'' اس نے عقلا اور شعرا سے چالاکی سے آنکھیں نچاتے ہوئے پوچھا۔ ''کون اس سوال کو معقول جواب دے سکتا ہے؟'' اور انہوں نے لالچ کے ساتھ تھیلی کی طرف دیکھتے ہوئے جو سلطان کے ہاتھ میں تھی جواب دیا۔

''شہنشاہ معظم کی سانس نے فضا میں سرایت کر کے یہ لطافت پھیلا دی ہے اور مہک کی وجہ یہ ہے کہ آخر کار نصرالدین کی ناپاک روح کا تعفن ختم ہو گیا جو دنیا کو زہر آلود کر رہا تھا۔''

تھوڑی دور پر محل کے پہرے داروں کا کماندار، استنبول کے امن وامان کا محافظ کھڑا یہ دیکھ رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے۔ وہ اپنے ہم پیشہ بخارا کے ارسلان بیگ سے اتنا مختلف ضرور تھا کہ وہ اس سے زیادہ ظالم اور غیر معمولی طور پر دبلا پتلا تھا۔ اس کی یہ دونوں باتیں اس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہو گئی تھیں کہ استنبول کے شہریوں نے ان کو بہت دن پہلے ہی تاڑ لیا تھا اور وہ محل کے حمام کے خدمت گاروں سے ہر ہفتے پوچھتے رہتے تھے کہ کماندار کا وزن گھٹا یا بڑھا ہے۔ اگر خبر خراب ہوتی تو محل کے قریب رہنے والے بلا کسی سخت ضرورت کے گھروں کے باہر آئندہ حمام کے دن تک نہ نکلتے۔ تو اب یہ ہیبت ناک ہستی ذرا دور پر استادہ تھی۔ اس کے سر پر عمامہ تھا اور وہ اس طرح اس کی لمبی اور سوکھی گردن پر ابھرا ہوا تھا جیسے بانس پر لٹکا ہو (استنبول کے بہت سے شہری اس تشبیہہ کو سن کر پراسرار طریقے پر آہ بھرتے)

سب کچھ مزے میں چل رہا تھا، جشن زوروں پر تھا اور کسی انتشار کا گمان تک نہ تھا۔ کسی نے اس

بات کی طرف توجہ نہیں کی کہ محل کا داروغہ اپنی حسب معمول پھرتی کے ساتھ چپکے سے درباریوں کے مجمع سے نکلا اور محل کے پہرے داروں کے کماندار کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔ کماندار چونک پڑا، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ جلدی سے داروغہ کے ساتھ باہر چلا گیا۔

چند منٹ میں وہ واپس آ گیا۔ وہ زرد ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ درباریوں کو ہٹاتا ہوا وہ سلطان کے پاس پہنچا اور دہرا ہو کر تعظیم بجالایا:

''سلطان معظم!...''

''ہاں، کیا ہے؟'' سلطان نے ناگواری کے انداز میں پوچھا۔ ''کیا تم آج کے دن بھی جیل اور سزاؤں کی خبریں اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتے؟ اچھا، بولو!''

''مقدس و معظم سلطان، میری زبان سے الفاظ نہیں نکلتے....''

سلطان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ کافی پریشان ہو گیا تھا۔ کماندار نے چپکے سے کہا:

''وہ استنبول میں ہے!''

''کون''؟ سلطان نے درشت آواز میں پوچھا، حالانکہ وہ فوراً ہی سمجھ گیا تھا کہ کس سے مطلب ہے۔

''خواجہ نصر الدین!''

کماندار نے یہ نام بہت ہی دھیمے سے لیا تھا لیکن درباریوں کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ سارے محل میں منہ ہی منہ یہ بات پھیل گئی:

''خواجہ نصر الدین استنبول میں! خواجہ نصر الدین استنبول میں!''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' سلطان نے پوچھا۔ اس کی آواز اچانک بھرا گئی تھی۔ ''تم سے کس نے کہا؟ یہ کیسے ممکن ہے جب کہ امیر بخارا نے اپنے خط میں شاہانہ الفاظ سے اس کا یقین دلایا ہے کہ خواجہ نصر الدین اب زندہ نہیں ہے؟''

کماندار نے محل کے داروغہ کو اشارہ کیا جو سلطان کے پاس ایک آدمی کو لے گیا جس کی ناک چپٹی تھی، چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور ناچتی ہوئی زرد آنکھیں تھیں۔

''سلطان معظم!'' کماندار نے وضاحت کی ''یہ آدمی امیر بخارا کے دربار میں بہت دنوں تک

جاسوس کی خدمات ادا کر چکا ہے اور خواجہ نصر الدین کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جب یہ شخص استنبول آیا تو میں نے اس کو جاسوس کی حیثیت سے نوکر رکھ لیا اور وہ اس وقت بھی اپنے منصب پر ہے۔''

''تم نے اس کو دیکھا؟'' سلطان نے بات کاٹتے ہوئے جاسوس سے پوچھا۔''کیا تم نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا؟''

جاسوس نے ہاں میں جواب دیا۔

''شاید تم سے غلطی ہوئی ہو؟''

جاسوس نے نفی میں جواب دیا۔ وہ غلطی نہیں کر سکتا۔ خواجہ نصر الدین کے ساتھ ایک عورت گدھے پر سوار تھی۔

''تم نے اس کو اسی جگہ کیوں نہ گرفتار کر لیا؟'' سلطان چلایا۔''تم نے اس کو پہرے داروں کے حوالے کیوں نہیں کر دیا؟''

''جہاں پناہ!'' گھٹنوں پر گر کر گڑگڑاتے ہوئے جاسوس نے جواب دیا۔''بخارا میں ایک بار میں خواجہ نصر الدین کے ہاتھ آ گیا اور پھر یہ اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ میری جان بچ گئی۔ آج صبح کو جب میں نے اس کو استنبول کی سڑکوں پر دیکھا تو خوف سے میری آنکھوں پر اندھیرا چھا گیا اور جب میں اپنے ہوش میں آیا تو وہ جا چکا تھا۔''

''تو یہ ہیں تیرے جاسوس!'' تعظیم سے جھکے ہوئے کماندار کی طرف دیکھتے ہوئے لال بھبوکا سلطان نے کہا۔''کسی مجرم کو دیکھتے ہی ان کے حواس رہتے ہیں!''

اس نے چیچک رو جاسوس کو حقارت سے لات مار کر الگ کر دیا اور خود خلوت خانے میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے حبشی غلاموں کی ایک لمبی قطار تھی۔

وزرا، عمائدین، شعرا اور عقلا سب آپس میں چاؤں چاؤں کرتے باہر جا رہے تھے۔ چند منٹ میں کماندار کے سوا ایک نفس بھی باغ میں نہیں رہ گیا جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتا رہا اور پھر ایک سنگ مرمر کے فوارے کے کنارے بیٹھ گیا۔ وہ بڑی دیر تک بیٹھا پانی کی ہلکی بلبلاہٹ اور ہنسی سنتا رہا۔ اچانک سکڑ کر اتنا دبلا ہو گیا تھا کہ اگر استنبول کے لوگ اس کو دیکھتے تو اپنے جوتے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔

اس دوران میں چیچک رو جاسوس بے تحاشا سڑکوں پر بھاگتا ساحل کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ایک

عرب جہاز روانگی کے لئے تیار کھڑا تھا۔ جہاز کے کپتان کو قطعی یقین ہو گیا کہ وہ کوئی قیدی ہے جو بھاگ رہا ہے اس لئے اس نے ایک بڑی رقم طلب کی۔ جاسوس بلا طے توڑ کئے عرشے پر آیا اور پھر ایک تاریک اندھیرے کرنے میں گڑمڑا کر پڑ گیا۔ بعد کو جب استنبول کے چھریرے اور سڈول مینار نیلے دھند میں غائب ہو گئے اور تازہ ہوا بادبانوں میں بھرنے لگی تو وہ اپنے پناہ گاہ سے باہر آیا، پورے جہاز کا چکر لگایا، ہر چہرے کو غور سے دیکھا اور جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ خواجہ نصر الدین جہاز پر نہیں تو اسے اطمینان ہوا۔

اس دن سے اس چیچک رو جاسوس کی زندگی متواتر خوف و ہراس میں بسر ہونے لگی۔ جس شہر بھی وہ گیا خواہ وہ بغداد ہو یا قاہرہ، تہران یا دمشق، کسی جگہ بھی تین مہینے سے زیادہ نہ ٹھہر سکا کیونکہ خواجہ نصر الدین اس شہر میں ضرور نظر آتے اور جاسوس ان سے مڈھ بھیڑ کے ڈر سے اور آگے بھاگتا۔ یہاں خواجہ نصر الدین کا مقابلہ اس زبردست طوفان سے کرنا غلط نہ ہوگا جو اپنے آگے آگے اس مرجھائی ہوئی زرد پتی کو اڑائے اڑائے پھرتا ہے جس کو وہ گھاس سے، دراڑوں اور خولوں سے نکال لیتا ہے۔ اس طرح چیچک رو جاسوس کو ان تمام برائیوں کی سزا ملی جو اس نے دوسرے لوگوں کے ساتھ کی تھیں۔

دوسرے ہی دن سے استنبول میں غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعات شروع ہو گئے.... لیکن جو باتیں کسی نے ذاتی طور پر نہ دیکھی ہوں اُن کی بابت کچھ نہ کہنا چاہئے۔ اور جو ملک خود اس نے نہ دیکھے ہوں اس کی بابت نہ لکھنا چاہئے۔ اس لئے ان الفاظ کے ساتھ ہم اپنی کہانی کا آخری باب ختم کرتے ہیں، جو استنبول، بغداد، تہران، دمشق اور بہت سے دوسرے مشہور شہروں میں خواجہ نصر الدین کے مزید کارناموں کے بارے میں نئی کتاب کے ابتدائی باب کا کام دے سکتا ہے۔

ختم شد